



جملہ حقوق بحق شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند محفوظ ہیں

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند

زیر نگرانی

حضرت مولانا بدرالدین اجمل علی القاسمی صاحب
رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مقالات حبیب

(حصہ سوم)

گوشہ سیرت و تاریخ
تذکرہ ارباب فضل و کمال

تالیف

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی

سلسلہ اشاعت ۴۱

نام کتاب : مقالات حبیب (حصہ سوم)
مؤلف : حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
سن اشاعت : ۱۴۳۰ھ — ۲۰۰۹ء
تعداد صفحات : ۴۴۰
ناشر : شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

ناشر

شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

فہرست ابواب و موضوعات (حصہ سوم)

باب (۵) گوشہ سیرت و تاریخ

| | |
|----|--|
| ۱۷ | سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر ایک نظر..... |
| ۲۰ | ہادی عالم کی ازدواجی سیرت کا ایک پہلو..... |
| ۲۰ | مسئلہ کثرت ازدواج کے دو بنیادی نقطے..... |
| ۲۱ | تراجم امہات المؤمنین..... |
| ۲۱ | حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۲ | حضرت سودہ رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۲ | حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۳ | حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۴ | حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۴ | حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۵ | حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۶ | حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۶ | حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۷ | حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا..... |

| | |
|----|--|
| ۲۷ | حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا..... |
| ۲۷ | تعداد ازدواج کے مصالح..... |
| ۲۸ | تعلیمی مصلحت..... |
| ۳۰ | تشریحی مصلحت..... |
| ۳۲ | اجتماعی مصلحت..... |
| ۳۲ | سیاسی مصلحت..... |
| ۳۴ | ہماری تاریخ کا ایک باب یہ بھی ہے..... |
| ۳۴ | خدام کے آرام و راحت کا خیال..... |
| ۳۴ | افشائے راز..... |
| ۳۵ | بیوی کو صبر کی تلقین..... |
| ۳۵ | احساس دیانت..... |
| ۳۶ | مکارم اخلاق..... |
| ۳۶ | پاکبازی..... |
| ۳۷ | حق بحق دار رسید..... |
| ۳۷ | خوف آخرت..... |
| ۳۸ | انجام کی فکر..... |
| ۳۸ | حسن خاتمہ..... |
| ۴۰ | تاریخ اسپین کا عبرت خیز ورق..... |
| ۴۱ | طوائف الملوکی اور اس کے منفی اثرات..... |
| ۴۲ | مختلف مسلم جماعتیں اور ان کا انجام..... |
| ۴۴ | جبری عیسائی بنانے کا روح فرسا اقدام..... |
| ۴۵ | درس عبرت..... |
| ۴۸ | تنظیم ملت کے چند اصول..... |
| ۵۰ | اجودھیا کی تاریخی حیثیت..... |
| ۵۰ | اجودھیا کی قدامت..... |
| ۵۳ | اجودھیا کی شناخت..... |
| ۵۴ | عہد وسطیٰ کی تاریخی کتابوں میں اجودھیا کا ذکر..... |
| ۵۶ | الگنڈر کننگھم کی رپورٹ..... |
| ۵۹ | اجودھیا کی مذہبی حیثیت..... |

| | |
|-----|---|
| ۶۱ | بدھ مت کے مرکز کی حیثیت سے |
| ۶۳ | شیو مت کا غلبہ، اور وشنو مت کا آغاز |
| ۶۴ | جین مت کے استھان کی حیثیت سے |
| ۶۴ | مسلمانوں کی آمد اور اسلامی آثار کا فروغ |
| ۶۶ | بابری مسجد - حقائق اور افسانے |
| ۶۷ | کیا بابرا جو دھیا آیا تھا؟ |
| ۷۰ | بابر کی ایک وصیت |
| ۷۱ | تلاش حق |
| ۷۲ | بابری مسجد کے کتبے |
| ۷۲ | کتاب (۱) |
| ۷۳ | کتاب (۳ و ۲) |
| ۷۶ | جنم استھان کے بارے میں ایک ہندو محقق کی تحقیق |
| ۷۸ | کیا رام کرشن کو شل کے راجہ تھے؟ |
| ۷۹ | اس افسانہ کی ابتداء اور اس کے مقاصد |
| ۸۱ | اختلاف کا آغاز |
| ۸۲ | بابری مسجد میں مورقی کی تنصیب |
| ۸۳ | مقدمات کا سلسلہ |
| ۸۵ | دوران مقدمہ خلاف قانون مسجد میں تبدیلیاں |
| ۸۶ | مسجد، مندر بنادی گئی |
| ۸۷ | فیصلہ پر ایک نظر |
| ۸۸ | آخری بات |
| ۸۹ | بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں |
| ۸۹ | مسجد کی تعمیر اور اس کی تاریخی حیثیت |
| ۹۱ | مسجد، مندر قضیہ کا آغاز |
| ۹۳ | مسجد کو مندر بنانے کی شرمناک سازش |
| ۹۶ | عدالت نے اقتدار کے دباؤ میں مسجد کے اندر مورقی پوجا کی اجازت دیدی |
| ۹۷ | مسجد کو مسما کر کے اس کی جگہ مندر بنانے کا اعلان |
| ۱۰۰ | بابری مسجد کی المناک شہادت |
| ۱۰۴ | نظام امارت فی الہند کی مختصر تاریخ |

| | |
|-----|---------------------------------|
| ۱۰۴ | امارت شریعیہ کی تاسیس |
| ۱۰۶ | استفتاء اور اس کا جواب |
| ۱۰۶ | اصلاح عام |
| ۱۰۷ | نظام امارت کا اثر |
| ۱۰۷ | ایک سوال |
| ۱۰۷ | ایک ضروری تنبیہ |
| ۱۰۸ | نظام امارت کی دوبارہ تاسیس |
| ۱۱۰ | مجلس شوریٰ کی روداد |
| ۱۱۰ | حضرت حاجی صاحب کی امارت پر بیعت |
| ۱۱۱ | عام مسلمانوں کی اطاعت گزاری |
| ۱۱۲ | تنظیم ملت کی تیسری کوشش |
| ۱۱۴ | ایک اور صوبہ میں امیر کا انتخاب |

باب (۶) تذکرہ ارباب فضل و کمال

| | |
|-----|-----------------------------------|
| ۱۱۷ | امام ابو حنیفہ اور علم حدیث |
| ۱۱۷ | امام صاحب کی تابعیت |
| ۱۱۹ | طلب حدیث کے لئے اسفار |
| ۱۲۱ | علم حدیث میں مہارت و امامت |
| ۱۲۴ | ضروری تنبیہ |
| ۱۳۲ | امام صاحب کی عدالت و ثقاہت |
| ۱۳۷ | امام صاحب اور فن جرح و تعدیل |
| ۱۴۱ | امام ابو داؤد و سجستانی |
| ۱۴۱ | نام و نسب |
| ۱۴۴ | تاریخ پیدائش اور تعلیم و تحصیل |
| ۱۴۶ | تعلیمی اسفار |
| ۱۴۷ | اسفار کی ضروری تفصیلات |
| ۱۴۹ | برادر کبیر کی رفاقت |
| ۱۴۹ | وقفہ و فقہ سے وطن مالوف کی مراجعت |
| ۱۵۰ | صاحبزادے ابو بکر کی معیت |

| | |
|-----|------------------------------------|
| ۲۰۲ | مولانا جمال الدین اودھی |
| ۲۰۳ | علامہ کمال الدین اودھی |
| ۲۰۵ | شیخ نصیر الدین معروف بہ چراغِ دہلی |
| ۲۰۹ | شیخ علاء الدین نیلی (صاحب ماقیمان) |
| ۲۱۱ | شیخ شمس الدین اودھی |
| ۲۱۴ | شیخ فتح اللہ اودھی |
| ۲۱۷ | شیخ سعد اللہ اودھی |
| ۲۱۸ | شیخ جمال گوجری |
| ۲۲۰ | شیخ سید سلطان موسیٰ عاشقان |
| ۲۲۲ | قاضی شہاب الدین اودھی |
| ۲۲۳ | شیخ محمد درویش اودھی |
| ۲۲۷ | شیخ علاء الدین حسینی اودھی |
| ۲۲۸ | شیخ عاشق شاہ اودھی |
| ۲۳۰ | شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جون پوری |
| ۲۳۱ | شیخ کے تذکرہ کے ماخذ و مراجع |
| ۲۳۲ | تاریخ ولادت اور نام و نسب |
| ۲۳۳ | دہلی سے جون پور آمد |
| ۲۳۴ | تعلیم و تربیت |
| ۲۳۶ | کثرت ریاضت اور اس کے اثرات |
| ۲۳۷ | شانِ استغنا |
| ۲۳۸ | شیخ اور تعمیر مسجد جامع جون پور |
| ۲۳۹ | درس و تدریس |
| ۲۳۹ | تصنیف و تالیف |
| ۲۴۰ | قبول عام |
| ۲۴۱ | وفات اور مدفن |
| ۲۴۲ | چند ملفوظات |
| ۲۴۳ | قاضی خان ظفر آبادی |
| ۲۴۳ | ظفر آبادی مختصر تاریخ |
| ۲۴۷ | اسم گرامی اور تاریخ ولادت |

| | |
|-----|--|
| ۱۵۲ | اساتذہ کرام |
| ۱۵۳ | کیا امام ابوداؤد کے تمام شیوخ ثقہ ہیں؟ |
| ۱۵۴ | کتاب السنن کی تالیف |
| ۱۵۵ | امام خطیب کی روایت پر ایک نظر |
| ۱۵۷ | بصرہ کی سکونت |
| ۱۶۰ | تاریخ وفات اور مقام تدفین |
| ۱۶۱ | تلامذہ |
| ۱۶۳ | ایک عظیم شرف |
| ۱۶۴ | ضروری تنبیہ |
| ۱۶۵ | علمی مقام و مرتبہ |
| ۱۶۵ | اخذ حدیث کے تین مرحلے |
| ۱۶۷ | تاریخ رجال میں مہارت |
| ۱۷۰ | فقہ میں تبحر |
| ۱۷۱ | مذہب و مسلک |
| ۱۷۷ | زہد و تقویٰ |
| ۱۷۸ | حکمت و معرفت |
| ۱۸۰ | علمی نوادرات |
| ۱۸۲ | امام ابوداؤد دائمہ حدیث اور اکابر علماء کی نظر میں |
| ۱۸۶ | تصنیفی خدمات |
| ۱۸۹ | اجودھیہ کے مشاہیر علماء و مشائخ |
| ۱۸۹ | اجودھیہ کی روایتی خصوصیت |
| ۱۹۰ | قاضی قدوۃ الدین |
| ۱۹۱ | شیخ فرید الدین اودھی |
| ۱۹۲ | شیخ بدر الدین واعظ |
| ۱۹۲ | قاضی محی الدین کاشانی |
| ۱۹۴ | شیخ تقی الدین علم بخش |
| ۱۹۶ | شیخ شمس الدین اودھی |
| ۲۰۰ | شیخ جلال الدین اودھی |
| ۲۰۱ | مولانا قوام الدین اودھی |

| | |
|-----|---|
| ۲۲۸ | شجرہ نسب اور اصلی وطن..... |
| ۲۲۹ | خاندانی وجاہت..... |
| ۲۵۰ | عرفان و سلوک..... |
| ۲۵۱ | قاضی خاں کا مقام علماء کی نظر میں..... |
| ۲۵۳ | شان استغناء..... |
| ۲۵۴ | وفات..... |
| ۲۵۵ | اولاد اور خلفاء..... |
| ۲۵۶ | شیخ عبداللہناصحی..... |
| ۲۵۶ | شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی..... |
| ۲۵۷ | شاہ مسعود خلوی..... |
| ۲۵۸ | سید محمد جون پوری اور تحریک مہدویت..... |
| ۲۵۸ | تاریخ ولادت اور نام و نسب..... |
| ۲۵۸ | تعلیم و تربیت اور ابتدائی حالات..... |
| ۲۵۹ | جون پور سے ہجرت..... |
| ۲۶۴ | سید صاحب کی تعلیمات اور ان کا اثر..... |
| ۲۶۵ | سید صاحب کے متعلق علماء کی رائے..... |
| ۲۶۷ | دعوائے مہدویت پر ایک نظر..... |
| ۲۷۱ | استاذ الملک ملا محمد افضل جو پوری..... |
| ۲۷۱ | عہد شرقی کے مشاہیر..... |
| ۲۷۱ | عہد لوہی کے مشاہیر..... |
| ۲۷۲ | عہد مغل کے مشاہیر..... |
| ۲۷۳ | نام و نسب اور تاریخ پیدائش..... |
| ۲۷۴ | تعلیم و تربیت..... |
| ۲۷۴ | علمی تبحر..... |
| ۲۷۵ | ردولی سے جون پور آمد..... |
| ۲۷۶ | سلوک و تصوف..... |
| ۲۷۸ | تصانیف..... |
| ۲۷۸ | شاعری..... |
| ۲۷۹ | وفات..... |

| | |
|-----|--|
| ۲۸۰ | اولاد و تلامیذ..... |
| ۲۸۴ | • شاہ طیب بناری اور ان کے اسلاف و خلفاء..... |
| ۲۸۴ | ابتدائیہ..... |
| ۲۸۵ | ماخذ و مصادر..... |
| ۲۸۵ | -۱ شیخ الاسلام شیخ فرید بناری..... |
| ۲۸۷ | بنارس آمد..... |
| ۲۸۸ | تعلیم و تربیت..... |
| ۲۹۰ | خلافت و جانشینی..... |
| ۲۹۲ | تعلیم و ارشاد..... |
| ۲۹۳ | خدمت خلق..... |
| ۲۹۵ | وفات اور مدفن..... |
| ۲۹۶ | ایک غلطی کا ازالہ..... |
| ۲۹۷ | خلفائے عظام..... |
| ۲۹۷ | میر سید بدھ بہاری..... |
| ۲۹۸ | شیخ مبارک محمد بناری..... |
| ۲۹۸ | شیخ لاؤ جون پوری..... |
| ۲۹۹ | اولاد و امجاد..... |
| ۲۹۹ | شیخ محی الدین بناری..... |
| ۳۰۰ | شیخ ابواللیث بناری..... |
| ۳۰۰ | شیخ حبیب اللہ بناری..... |
| ۳۰۳ | -۲ شیخ داؤد بناری..... |
| ۳۰۴ | شیخ حسن بن داؤد بناری..... |
| ۳۰۵ | علمی مقام و مرتبہ..... |
| ۳۰۵ | تدریس و تصنیف..... |
| ۳۰۶ | احسان و سلوک..... |
| ۳۰۸ | سفر حج اور واقعہ شہادت..... |
| ۳۰۹ | تحقیق تاریخ شہادت..... |
| ۳۱۱ | خلفاء اور اولاد..... |
| ۳۱۲ | اسد العلماء نصیر الدین مصطفیٰ آبادی..... |

| | |
|-----|--|
| ۳۱۴ | شیخ مسعود بن حسن بناری |
| ۳۱۵ | شیخ معین الدین بناری |
| ۳۱۵ | شیخ المشائخ شاہ طیب بناری |
| ۳۱۶ | تعلیم و تحصیل اور ابتدائی حالات |
| ۳۱۸ | عرفان و طریقت |
| ۳۲۲ | بناء شریعت آباد |
| ۳۲۳ | درس و تدریس، وارثا و تلقین |
| ۳۲۴ | طریق اصلاح و بیعت |
| ۳۲۵ | امر بالمعروف و نہی عند المنکر |
| ۳۲۶ | امراء و حکام کا شاہ صاحب سے برتاؤ |
| ۳۲۷ | مدد معاش کے بارے میں شاہ صاحب کا نظریہ |
| ۳۲۷ | فتوحات کے سلسلہ میں طرز عمل |
| ۳۲۹ | معمولات |
| ۳۳۰ | غنا و سماع کے بارے میں رویہ |
| ۳۳۱ | اسرار طریقت کے بیان سے احتراز |
| ۳۳۱ | لباس |
| ۳۳۲ | وفات اور مدفن |
| ۳۳۲ | چند مریدین و خائفاء |
| ۳۳۲ | ۱- دیوان محمد رشید جون پوری |
| ۳۳۶ | ۲- شیخ ناصر الدین جھوسوی |
| ۳۳۷ | ۳- شاہ بلین بناری |
| ۳۴۰ | ۴- شیخ عالم بناری |
| ۳۴۰ | ۵- شیخ عبدالمومن کشمیری |
| ۳۴۱ | ۶- شیخ فاضل محمد پھلتی |
| ۳۴۱ | ۷- شیخ حسن |
| ۳۴۲ | ۸- شیخ طاہر بناری |
| ۳۴۳ | قطب الاقطاب دیوان محمد رشید جون پوری |
| ۳۴۴ | علمی مقام و مرتبہ |
| ۳۴۵ | دیوان صاحب کے تذکرہ کے ماخذ و مراجع |

| | |
|-----|---|
| ۳۴۷ | دیوان صاحب کے بارے میں اہل باطن کی پیشین گوئیاں |
| ۳۴۷ | پیدائش و شو نما |
| ۳۵۰ | درس و تدریس |
| ۳۵۱ | نفل سندا اجازت |
| ۳۵۲ | دیوان صاحب بحیثیت استاذ |
| ۳۵۴ | عرفان و سلوک |
| ۳۵۷ | شعر و سخن |
| ۳۵۷ | غزل کا نمونہ |
| ۳۵۷ | تصنیف و تالیف |
| ۳۵۹ | وفات |
| ۳۶۰ | اخلاق و سیرت |
| ۳۶۳ | خلفاء و مجازین |
| ۳۶۹ | • مولانا سخاوت علی جون پوری |
| ۳۷۰ | نام و نسب و خاندانی حالات |
| ۳۷۱ | سن پیدائش اور ابتدائی حالات |
| ۳۷۱ | تجربہ علمی |
| ۳۷۲ | بیعت و خلافت |
| ۳۷۳ | تعلیم و تدریس |
| ۳۷۳ | جون پور سے باندہ |
| ۳۷۴ | استخلاص الجامع الشرق و قیام مدرسہ قرآنیہ |
| ۳۷۵ | مختصر تاریخ مسجد |
| ۳۷۵ | ہجرت مکہ معظمہ |
| ۳۷۶ | وفات |
| ۳۷۷ | مولانا کا مسلک |
| ۳۷۸ | تصانیف |
| ۳۸۰ | اولاد |
| ۳۸۳ | تلامذہ |
| ۳۸۴ | • شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سفر حرمین شریفین کی تفصیلی روداد |
| ۳۸۵ | آغاز سفر |

| | |
|-----|--|
| ۳۸۶ | بندر سورت سے روانگی |
| ۳۸۷ | مکہ معظمہ میں حاضری اور وہاں کے علماء سے ملاقات |
| ۳۸۸ | مدینہ منورہ کی حاضری |
| ۳۸۸ | ایک بزرگ کا خواب |
| ۳۸۹ | ایک عالم کی طرف سے دعوت طعام اور علمی سوالات |
| ۳۸۹ | ایک اور علمی سوال اور اس کا حل |
| ۳۹۰ | تفصیل اشکال |
| ۳۹۰ | جواب اشکال |
| ۳۹۲ | روایت حدیث کی اجازت |
| ۳۹۳ | اظہار تواضع و اعتراف کمال |
| ۳۹۴ | مختلف سلاسل تصوف کی اجازت |
| ۳۹۴ | ایک رسالہ کی تالیف |
| ۳۹۵ | مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپسی |
| ۳۹۵ | مکہ معظمہ میں دوبارہ حاضری |
| ۳۹۵ | بعض تصانیف کی شہرت و مقبولیت |
| ۳۹۶ | شاہ صاحب کی والدہ محترمہ کی وفات |
| ۳۹۶ | وطن واپسی |
| ۳۹۸ | قافلہ فضل و کمال یعنی مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند کے مشاہیر تلامذہ |
| ۳۹۸ | مولانا کی مختصر سوانح |
| ۳۹۹ | ۱- مولانا فخر الحسن گنگوہی |
| ۴۰۰ | ۲- مولانا فتح محمد تھانوی |
| ۴۰۰ | ۳- مولانا امیر باز خاں مظفر نگری |
| ۴۰۱ | ۴- مولانا منفعت علی دیوبندی |
| ۴۰۱ | ۵- مولانا احمد حسن امر وہوی |
| ۴۰۲ | ۶- مولانا احمد ہزاروی |
| ۴۰۳ | ۷- مولانا محمد مراد فاروقی مظفر نگری |
| ۴۰۴ | ۸- مولانا سید محمد عرفان ٹوکنی |
| ۴۰۴ | ۹- مولانا منصور علی خاں مراد آبادی |
| ۴۰۵ | ۱۰- شیخ الہند مولانا محمد حسن دیوبندی |

| | |
|-----|--|
| ۴۰۶ | ۱۱- مولانا ناظر حسن دیوبندی |
| ۴۰۷ | ۱۲- مولانا عبدالحق پور قاضوی |
| ۴۰۷ | ۱۳- مولانا عبداللہ ایتھوی |
| ۴۰۸ | ۱۴- مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی |
| ۴۰۸ | ۱۵- مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری |
| ۴۱۰ | ۱۶- مولانا عبدالقادر دیوبندی |
| ۴۱۱ | ۱۷- مولانا عبدالمومن دیوبندی |
| ۴۱۲ | ۱۸- مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی |
| ۴۱۴ | ۱۹- مولانا حافظ محمد احمد قاسمی |
| ۴۱۵ | ۲۰- مولانا محمد صدیق مراد آبادی |
| ۴۱۶ | ۲۱- مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری |
| ۴۱۷ | ۲۲- مولانا حبیب الرحمن عثمانی |
| ۴۱۹ | • حضرت شیخ الاسلام کے تین امتیازات |
| ۴۱۹ | حیات اور کارناموں پر ایک اجمالی نظر |
| ۴۲۲ | امتیاز (۱) شیخ الہند سے طویل استفادہ |
| ۴۲۴ | امتیاز (۲) مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حلقہ درس |
| ۴۳۰ | امتیاز (۳) الجہاد کے جہاد آزادی میں حضرت شیخ الاسلام کا حصہ |
| ۴۳۲ | ابن بادیس کا مختصر تذکرہ |
| ۴۳۲ | حضرت شیخ الاسلام کا مشورہ اور تحریک کی ابتداء |
| ۴۳۵ | فکر و عمل میں یکسانیت |

باب ﴿۵﴾
گوشهٔ سیرت و تاریخ

سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

ایک نظر میں

| | |
|----------|---|
| سن عیسوی | |
| ۶۵۷۰ | ۲۰ اگست۔ ولادت باسعادت (ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق آنحضرت..... کی ولادت ۱۷ جون ۶۹۹ء کو ہوئی) |
| ۶۵۷۵/۷۶ | وفات حضرت آمنہ والدہ ماجدہ آنحضرت..... |
| ۶۵۷۸ | آنحضرت..... کے دادا خواجہ عبدالمطلب کی وفات۔ |
| ۶۵۸۲ | آنحضرت..... کا ملک شام کی طرف پہلا سفر۔ |
| ۶۵۹۵ | ملک شام کا دوسرا سفر، حضرت خدیجہ الکبریٰ کی تجارت کی غرض سے۔ |
| ۶۵۹۵ | حضرت خدیجہ الکبریٰ سے عقد |
| ۶۶۰۵ | تجدید عمارت کعبہ معظمہ |
| ۶۶۱۰ | آغاز وحی۔ (ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کی رو سے وحی کی ابتداء ۲۳ دسمبر ۶۱۰ء کو ہوئی ہے) |
| ۶۶۱۵ | حبشہ کی جانب پہلی ہجرت (رجب ۵ھ نبوی) |
| ۶۶۱۷ | قبائل عرب کی جانب سے بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب کا معاشرتی مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ) |
| ۶۶۲۰ | حضرت خدیجہ اور خواجہ ابوطالب کی وفات |
| ۶۶۲۰ | آنحضرت..... کا سفر طائف |
| ۶۶۲۱ | معراج و فرضیت نماز (ہجرت سے ایک سال قبل ۲۷ رجب) |

| | |
|--------|---|
| ۶۲۱ء | بیعت عقبہ اولیٰ (۲۲ نبوی) |
| ۲۸ جون | ہجرت مدینہ منورہ (۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ) حسب تحقیق ڈاکٹر حمید اللہ |
| ۶۲۲ء | ۳۱ مئی ۶۲۲ء ÷ یوم دوشنبہ |
| ۶۲۳ء | تحويل قبلہ (آنحضرت..... نے مدینہ منورہ میں ۱۶ مہینے بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز ادا کی) |
| // | سریہ حمزہ و عبیدہ بن حارث۔ |
| ۶۲۳ء | (جون) غزوہ ابوا۔ (جولائی) غزوہ بواط (اکتوبر) غزوہ عثیرہ (نومبر) سریہ عبد اللہ بن جحش |
| ۶۲۴ء | (جنوری) غزوہ بدر الکبریٰ (رمضان ۲ھ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق ۱۸ نومبر ۶۲۳ء ÷ یوم جمعہ (فروری) غزوہ بنی قینقاع (شوال ۲ھ (اپریل) غزوہ سويق، (ذی الحجہ ۲ھ (ستمبر) سریہ زید بن حارثہ |
| ۶۲۵ء ÷ | (جنوری) غزوہ احد (شوال ۳ھ) وغزوہ حراء الاسد (مئی) حادثہ رجب و پیر معونہ ۳ھ (جون) غزوہ بنو نضیر وغزوہ ذات الرقاع ۴ھ) اسی سال شراب حرام ہوئی |
| ۶۲۶ء ÷ | (جولائی) غزوہ دومتہ الجندل (ربیع الاول ۵ھ) وغزوہ بنی مصطلق (شعبان ۵ھ) اس کو غزوہ مریسین بھی کہا جاتا ہے |
| ۶۲۷ء ÷ | (فروری) غزوہ خندق (۲۹ شوال ۵ھ) (ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق ہے کہ غزوہ خندق ۱۴ جنوری ۶۲۷ء کو پیش آیا ہے) (اپریل) غزوہ بنی قریظہ (ذیقعدہ ۵ھ) (جون جولائی) غزوہ بنی الحیان (ربیع الاول ۶ھ) وغزوہ ذی قرد |
| ۶۲۸ء ÷ | (جنوری) صلح حدیبیہ (ذی قعدہ ۶ھ) (مئی) روم و فارس کو دعوت اسلام بذریعہ مکتوب (اگست) غزوہ خیبر (محرم ۷ھ) |
| ۶۲۹ء ÷ | (فروری) عمرہ قضا (ستمبر) سریہ موتہ (جمادی الاولیٰ ۸ھ) (اکتوبر) سریہ ذات سلاسل (جمادی الثانی ۸ھ) |

- ÷ ۶۳۰ (جنوری) فتح مکہ معظمہ و ہدم اصنام (رمضان ۵ھ) (فروری) غزوہ حنین (۱۰ اشوال ۵ھ)
- ÷ ۶۳۰ غزوہ طائف (اپریل) آنحضرت..... کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی ولادت، (اکتوبر) غزوہ تبوک (رجب ۹ھ)
- ÷ ۶۳۱ (مارچ) حضرت ابو بکر صدیق کی امارت حج (ذی الحجہ ۹ھ) (جون) صاحبزادہ رسول..... حضرت ابراہیم کی وفات
- ÷ ۶۳۲ (مارچ) حجۃ الوداع (۱۰ھ) حسب تحقیق ڈاکٹر حمید اللہ ۶ مارچ ۶۳۲ ÷ یوم جمعہ (مئی) جمیش اسامہ کی ملک شام جانے کی تیاری (صفر ۱۱ھ) (جون) وفات النبی..... (ربیع الاول ۱۱ھ) یوم دوشنبہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق کے مطابق ۲۵ مئی ۶۳۲ ÷ کو آنحضرت..... کا وصال ہوا۔



ہادی عالم کی ازدواجی سیرت کا ایک پہلو

نبی اسلام محمد رسول اللہ..... کی ازدواجی سیرت پر بہت سے مستشرقین، متعصب پادریوں اور ظاہر بین معترضوں نے نہایت رکیک خیالات اور دور از حقیقت شبہات کا اظہار کیا ہے جس سے متاثر ہو کر نبی کریم..... کی سیرت پاک اور اخلاق کریمانہ سے ناواقف سادہ لوح مسلمان بھی شکوک و اوہام میں مبتلا ہو جاتے ہیں، زیر نظر مقالہ میں اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے حضور پاک کی عفت و عصمت، پاکدامنی و نفس کشی کے ساتھ وہ مصالح و مقاصد اور حکمتیں بھی واضح اور منطقی ہو کر سامنے آجائیں گی جن کا حصول عرب جیسے جمود پسند ملک میں بغیر کثرت تزویج ممکن نہ تھا اور نہ ہی اس مصلح اعظم اور رحمتہ للعالمین کے لئے ان مصلحتوں سے صرف نظر کرنا مناسب تھا، اسی بنا پر رب العلمین نے ساری امت سے الگ اختصاصی طور پر آپ کو کثرت ازدواج کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مسئلہ کثرت ازدواج کے دو بنیادی نقطے

تفصیل میں جانے سے پہلے اس اہم مسئلہ میں دو بنیادی نقطوں کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے: (۱) نبی کریم..... کے حوالہ عقد میں امہات المؤمنین کی کثرت زمانہ شیخوختہ یعنی پچاس سال کی عمر کے بعد ہوئی ہے، تمام کتب سیر و تاریخ اس امر پر متفق ہیں کہ آنحضرت..... نے ابتدائی عمر سے ۲۵ برس تک کسی عورت سے ازدواجی تعلق قائم نہیں کیا۔

حالانکہ عمر کا یہی وہ دور ہے جس میں جوانی دیوانی ہوتی ہے اور شباب کا بھوت سر پر سوار ہو کر انسان کو پاگل بنا دیتا ہے بالخصوص پندرہ برس سے پچیس سال تک کا زمانہ تو انتہائی نازک ہوتا ہے جس میں شہوت سے مغلوب اور نفس سے عاجز اشخاص ہر قسم کے

ناکردنی افعال کر گزرتے ہیں۔

لیکن تاریخ اور واقعات شاہد ہیں کہ زندگی کے یہ ایام نبی کریم..... نے جس حزم و احتیاط اور عفت و عصمت کے ساتھ گزارے ہیں اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔

(۲) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ کی جملہ ازواج بیوہ تھیں، جب کہ یہ بات تقریباً مسلمات میں سے ہے کہ شہوت پرست، تعیش پسند بیوہ اور عمر رسیدہ عورتوں کی بجائے نئی نویلی کنواری لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں چاہے خود کتنے ہی عمر دراز اور سن رسیدہ کیوں نہ ہوں۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم..... اولاً تو پچیس سال کی عمر تک تجرد و تفرّد کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر جب عقد کرتے ہیں تو ایسی خاتون کے ساتھ جو عمر میں آپ سے پندرہ سال زیادہ اور ایک نہیں بلکہ دو خاندوں کے نکاح میں رہ چکی ہیں اور ان کی عمر اور جوانی کا اکثر واہم حصہ گزر چکا تھا، پھر اپنی قوت و طاقت کے عمدہ زمانے یعنی پچیس سال سے ۵۰ سال تک کو اسی ایک سن رسیدہ و بیوہ رفیقہ حیات کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔

یہ دو نقطے اس مسئلے میں اس قدر اہم ہیں کہ انہیں پیش نظر رکھنے سے معاندین و جاہلین کے لگائے ہوئے الزامات کے برعکس نبی کریم..... کی عفت اور پاکدامنی متّح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

اب ہم اختصار کے ساتھ ازواج مطہرات کے تراجم پیش کرتے ہیں جس سے ہمارا دعویٰ مدلل و مبرہن ہو کر ہر صاحب عدل و انصاف کو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کر دے گا کہ وہ ذات گرامی جو رحمتہ للعالمین اور مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں آئی تھی اس کے لئے کثرت ازواج از بس ضروری تھی۔

تراجم اہمہائے المومنین

(۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا: باتفاق ارباب سیر یہ آپ..... کی اولین بیوی ہیں، عقد کے وقت آنحضرت..... کی عمر شریف پچیس سال اور خود ان

کی چالیس سال تھی، یہ پہلے ابوہالہ بن زرارہ کے نکاح میں تھیں ان کے انتقال کے بعد عتیق بن عائد مخزومی سے بیاہی گئیں، اور عتیق کے فوت ہو جانے کے بعد آنحضرت..... کے حوالہ عقد میں آئیں، حضرت خدیجۃ الکبریٰ عفت اور پاکدامنی میں ممتاز شخصیت کی مالکہ تھیں اور اپنے اسی وصف کی بنا پر مکہ میں طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔

نبی کریم..... نے اپنا مکمل عہد شباب انہیں کے ساتھ گزارا اور ان کی حیات میں کسی اور سے عقد نہیں فرمایا۔ حضرت ابراہیم کے علاوہ آپ کی جملہ اولاد انہیں کے بطن سے تھیں، ہجرت سے تین سال پیشتر ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی ان کے وصال کے وقت حضور..... عمر شریف کی پانچ دہائیاں پوری کر چکے تھے یعنی شباب کے دور سے گزر کر شیوخت کی منزل میں داخل ہو گئے تھے۔

تبلیغ رسالت اور اسلام کی حمایت و نصرت میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے اہم کارنامے انجام دیئے اور نبی کریم کی رفاقت کا مکما حق پورا کیا۔ (۱)

(۲) حضرت سودہ رضی اللہ عنہا: حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات سے کچھ ہی روز بعد آپ کے نکاح میں آئیں، بوقت نکاح ان کی عمر پچاس یا پچھن سال تھی ان کے پہلے شوہر حضرت سکران بن عمرو انصاری تھے جو ہجرت حبشہ سے واپسی پر راستے میں فوت ہو گئے تھے جس کی وجہ سے یہ بالکل بے یار و مددگار ہو گئیں، گھر والوں کے پاس جانے میں چونکہ ایمان کا خطرہ تھا اس لئے بڑی تنگی میں زندگی بسر کر رہی تھیں، نبی کریم..... نے ان کی درازی عمر کے باوجود ان کے دین و دنیا کی حفاظت و کفالت کے لئے نکاح کر لیا اور اپنے دامن رحمت میں لے کر انہیں سارے اندیشوں اور مصیبتوں سے محفوظ کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ۲۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۲)

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا: ہجرت سے تین سال قبل ماہ شوال ۱۰ نبوی میں نبی کریم..... سے نکاح ہوا اور رخصتی ۱ھ میں ہوئی، ۹ سال

(۱) تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو بیون الاثر، اصحاب اور زرقانی وغیرہ۔

(۲) تاریخ کبیر امام بخاری، رحمتہ للعالمین، سیرت مصطفیٰ وغیرہ۔

آنحضرت..... کی رفاقت میں رہیں اور آپ..... کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد ۴۸ سال بقید حیات رہ کر ۵۵ھ میں رہ گئے عالم جاودانی ہوئیں۔

ازواج مطہرات میں صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کنواری اور بن بیاہی تھیں فہم و فراست اور علم و تفقہ میں تمام ازواج مطہرات بلکہ بہت سے صحابہ کرام پر فوقیت رکھتی تھیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ما اشکل علینا حدیث قط فسألنا عائشة الا وجدنا عندها منه علما۔ ہم اصحاب رسول کو جب بھی کسی مسئلہ میں اشکال پیش آتا تو دریافت کرنے پر حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس اس کا حل مل جاتا تھا۔

روایت حدیث میں حضرت ابو ہریرہ اور عبد اللہ بن عمرو کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ ہی کی مرویات سب سے زیادہ ہیں، اکابر صحابہ میں حضرت فاروق اعظم، ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبد اللہ بن عباس وغیرہ نے آپ سے روایت کی ہے۔

علوم دینیہ کے علاوہ ایام عرب، اور اشعار جاہلیت میں بھی انھیں کامل رسوخ حاصل تھا یہی وہ فضائل ہیں جن کی بناء پر آنحضرت..... حضرت عائشہ سے بہت زیادہ محبت رکھتے تھے چونکہ تعدد نکاح کا ایک اہم اور بنیادی مقصد دین کی تعلیم اور وہ احکام و مسائل جو صنف نسواں سے متعلق ہیں انھیں ازواج مطہرات کے واسطے سے امت کی عورتوں تک پہنچانا تھا، درحقیقت یہ ازواج مدرسۃ النسواں کی طالبات تھیں، مسجد نبوی اور صفہ میں مردوں کو تعلیم دی جاتی تھی، اور بیت نبوی..... میں امہات المؤمنین کو تاکہ آگے چل کر یہ دیگر عورتوں کی معلمات بنیں چونکہ اس میدان میں حضرت عائشہ صدیقہ اپنی جودت فہم، دقت نظر، اور قوت حافظہ کی بنا پر تمام ازواج سے ممتاز تھیں، اس لئے فطرتاً آنحضور..... کا میلان طبع ان کی جانب زیادہ تھا۔

(۴) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا: یہ حضرت فاروق اعظم کی صاحبزادی تھیں شعبان ۳ھ میں آنحضرت..... کے نکاح میں آئیں، ان کے پہلے شوہر

حضرت حنیس بن حذافہ سہمی کو غزوہ بدر میں زخم آیا، جس کے صدمے سے کچھ عرصہ بعد فوت ہو گئے، شوہر کے انتقال کے بعد حضرت فاروق اعظم نے حضرت عثمان غنی اور ابو بکر صدیق کو خطبہ دیا مگر یہ حضرات خاموش رہے بالآخر آپ..... نے خود انھیں اپنے قبیلہ عقبہ میں لے کر ان کے والد ماجد اور خود ان کی عزت افزائی فرمائی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت شعبان ۴۵ھ میں آپ کا وصال ہوا کل آٹھ سال آنحضرت..... کی رفاقت میں رہیں۔

(۵) حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا: ۳ھ میں آپ کی زوجیت سے مشرف ہوئیں، ان کے پہلے شوہر حضرت عبد اللہ بن جحش غزوہ احد میں شہید ہوئے، حضرت زینب خود اس غزوہ میں شریک تھیں، مجروحین کی مرہم پٹی اور دیکھ رکھنے کی خدمات نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور شوہر کی شہادت پر پورے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ نبی کریم کو جب ان کے صبر و ثبات اور مجاہدین کی خدمات کا علم ہوا تو ان کی عزت افزائی اور قدر دانی اور اطمینان خاطر کی غرض سے اپنی زوجیت میں لے لیا، نکاح کے دو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ ان کا وصال ہو گیا، آنحضرت..... نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کیا۔

(۶) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا: یہ بھی بیوگی کی حالت میں آپ کے نکاح میں آئیں ان کے پہلے شوہر حضرت عبد اللہ بن عبد الاسد اولین سابقین میں سے تھے اور دین کی حفاظت کے لئے اپنی زوجہ محترمہ کو ساتھ لے کر حبشہ ہجرت کر گئے تھے، وہیں ان کے صاحبزادے سلمہ پیدا ہوئے، غزوہ احد کے موقع پر دولت شہادت سے ہم کنار ہوئے۔ شوہر کے وصال کے بعد حضرت ام سلمہ اور ان کے چار یتیم بچے بالکل بے سہارا ہو گئے نبی کریم..... نے انھیں نکاح کا پیغام بھیجا تاکہ بچوں کی پرورش اور تربیت کے ساتھ خود ام سلمہ کی کفالت کا سامان بھی ہو جائے اور ان کی رضامندی پر نکاح فرمایا اور ان کے بچوں کی اس طرح پیار و محبت اور اپنائیت کے ساتھ پرورش فرمائی کہ وہ اپنے والد کو یکسر بھول گئے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا شرافت نسبی اور تقدم اسلام کے ساتھ فہم و فراست اور عقل و تدبیر کے لحاظ سے امتیازی شان رکھتی تھیں، حتیٰ کہ خود آنحضرت..... اپنے اور مومنین کے اہم امور میں ان سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، سات سال آنحضرت..... کے ساتھ رہیں، اسی یا چوراہی سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ (۱)

(۷) حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا: آنحضرت..... کی پھوپھی زاد بہن ہیں، آپ کی زوجیت میں آنے سے پہلے آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبہی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں، حضرت زینب چونکہ زید کو حسب و نسب کے لحاظ سے اپنے آپ سے کمتر درجہ کا سمجھتی تھیں، اس لئے شوہر کا جیسا احترام ہونا چاہئے اسے پورا نہ کر سکیں، جس سے حضرت زید کو شکایت ہوئی اور بالآخر نوبت طلاق تک پہنچی، حضرت زید کے ساتھ ان کا نکاح نبی کریم..... کے حکم سے ہوا تھا، اگرچہ وہ طبعی طور پر اس کے لئے آمادہ نہ تھیں، مزید برآں طلاق کا واقعہ ہو جانا اس سے ان کی بظاہر مزید سبکی و دل شکنی ہوئی، آنحضرت..... نے اس کے ازالہ کی خاطر خود حضرت زینب سے بحکم خداوندی نکاح فرمایا۔

بعض مخالفین اسلام اور اعداء رسول..... نے ایک بے سرو پا اسرائیلی روایت کے سہارے حضرت زینب سے متعلق النبی الذکی الطاہر..... پر ایک رکیک اور بیہودہ الزام عائد کیا ہے جو روایتاً و درایتاً بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، تاریخ اسلامی میں اس روایت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اس مختصر، ساقط الاسناد اور یکسر باطل روایت کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن آنحضرت..... حضرت زید کی غیر موجودگی میں ان کے گھر تشریف لے گئے، وہاں حضرت زینب پر آپ کی نظر پڑ گئی اور آپ کا دل ان کی جانب مائل ہو گیا دل کی اس بدلتی ہوئی حالت پر تعجب کرتے ہوئے آپ نے سبحان اللہ مقلب القلوب کا جملہ زبان سے ادا کیا، اس جملہ کو زینب نے سن لیا، اور حضور..... کی حالت کا اندازہ کر لیا، جب زید گھر واپس آئے تو انھوں

(۱) تفصیل کے لئے صحیح بخاری، اصابہ، زرقانی، رحمۃ اللعالمین وغیرہ ملاحظہ ہو۔

نے اس واقعہ کی اطلاع انھیں دی، زید سمجھ گئے کہ نبی کریم..... کو زینب پسند آگئی ہیں اس لئے خدمت میں آکر طلاق کا ارادہ ظاہر کیا، نبی علیہ السلام نے انھیں منع کیا لیکن (نعوذ باللہ) دل میں یہی تھا کہ زید انھیں طلاق دیدیں تو بہتر ہوگا، آخر کار زید نے انھیں اسی نیت سے طلاق دیدی کہ حضور..... ان سے نکاح کر لیں۔

سند کے اعتبار سے یہ روایت ساقط الاعتبار ہے، ہی از روئے عقل بھی نہایت پوچ اور لغو ہے، زینب نبی کریم..... کی پھوپھی زاد بہن ہیں، آپ انھیں لڑکپن سے جانتے پہچانتے تھے، اس تعارف و توافق کے باوجود آپ ان کی جانب مائل نہیں ہوئے حالانکہ وہ اس وقت کنواری اور نئی نوبلی تھیں پھر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ وہی زینب جب دوسرے کے عقد میں چلی گئیں اور شیبہ ہو گئیں تو آپ ان کی جانب مائل ہو گئے، سچا نک ہذا بہتان عظیم۔

اسی لئے جمہور مفسرین و مؤرخین نے اس واقعہ کے موضوع اور جھوٹے ہونے کی واضح الفاظ میں تصریح کی ہے۔ آگے حضرت زید سے ان کے نکاح کی حکمت اور طلاق کے بعد پھر آنحضرت..... کے ان سے عقد فرمانے کی مصلحت بال تفصیل آرہی ہے۔

ابن سید الناس کی تفصیل کے مطابق ۳ھ میں حضرت زینب آپ..... کے نکاح میں آئیں چھ سال حضور..... کے ساتھ رہیں اور ۲ھ میں بچہ ۵ سال وفات ہوئی، حضرت فاروق اعظم نے نماز جنازہ پڑھائی۔

(۸) حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا: یہ حارث بن ضرار سردار بنو مصطلق کی بیٹی تھیں ان کا شوہر مسافح بن صفوان مصطلقی غزوہ مریسج میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا یہ قبیلہ اسلام اور مسلمانوں کا شدید ترین دشمن تھا، ڈاکہ اور راہزنی میں اسے خاص شہرت تھی، دیگر بہت سے قیدیوں کے ساتھ حضرت جویریہ بھی گرفتار ہو کر آنحضرت..... کی خدمت میں پیش ہوئیں، آنحضرت..... نے انھیں آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا، جس کی برکت سے اس قبیلہ کو دنیا اور آخرت دونوں میں نفع عظیم حاصل ہوا، ربیع الاول ۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۹) حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا: یہ ابوسفیان بن حرب مشہور سردار

عرب کی بیٹی تھیں، ان کا پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا، دونوں مشرف باسلام ہو کر حبشہ ہجرت کر گئے، وہاں کچھ عرصہ کے بعد عبید اللہ مرتد ہو کر عیسائی بن گیا، اور اسی حالت میں مر گیا مگر حضرت ام حبیبہؓ سلام پر قائم رہیں، عبید اللہ کے انتقال اور عدت کے ختم ہو جانے پر آنحضرت..... نے نجاشی شاہ حبشہ کو کہلا بھیجا کہ اگر ام حبیبہ نکاح پر راضی ہوں تو تم بطور وکیل میرا نکاح ان سے کر دو اور انھیں میرے پاس مدینہ بھیج دو، ام حبیبہؓ کی منظوری پر نجاشی نے آنحضرت..... سے ان کا نکاح کر دیا اور خود اپنی جانب سے چار ہزار درہم مہر کے انھیں دے کر حضرت شرحبیل کے ہمراہ آنحضرت..... کی خدمت میں پہنچا دیا، ۲۲ھ میں بصرہ ۷ سال مدینہ منورہ میں فوت ہوئیں، اس نکاح کے مصالح آئندہ آرہے ہیں۔

(۱۰) حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا: اپنے قبیلے بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں، ان کا پہلا نکاح سلام بن مشکم قرظی سے ہوا، سلام کے طلاق دیدینے کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ غزوہ خیبر میں قتل ہوا، حضرت صفیہ گرفتار ہوئیں رسول اللہ..... نے انھیں آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا، ۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی، سوا تین سال نبی کریم..... کی رفاقت میں رہنے کا موقع ملا۔

(۱۱) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا: ماہ ذی قعدہ کے ۷ھ میں جب آپ عمرہ قضا کے لئے تشریف لے گئے اس وقت آپ کی زوجیت میں آئیں، یہ آپ کی آخری زوجہ ہیں ان کے بعد آپ..... نے کسی اور سے نکاح نہیں فرمایا یہ پہلے ابو رہم بن عبد العزہ کے نکاح میں تھیں ۱۵ھ میں بصرہ (۸۰) سال مقام سرف میں انتقال ہوا، سرف ہی میں نکاح بھی ہوا تھا۔

تعدد ازواج کے مصالح

حضرات امہات المؤمنین کے تذکرہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ جملہ ازواج مطہرات بیوہ ہونے کے بعد آپ کے نکاح میں آئی اور ان میں بعض وہ بھی جو عمر کی اس منزل میں پہنچ چکی تھیں، جس میں عورتیں نکاح کے قابل نہیں رہ

جاتیں پھر ان میں اکثر وہ ہیں جنہیں چند سالوں سے زیادہ آپ کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع نہ مل سکا۔

پھر ان کی خدمت نبوی میں آمد بھی ایسے دور میں ہوئی جب کہ مشرکین مکہ وغیرہ سے غزوات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، جس کی بنا پر آپ کو گھر چھوڑ کر باہر رہنا پڑتا تھا اور اطمینان و سکون تقریباً مفقود تھا اس لئے ان نکاحوں سے نعوذ باللہ خواہش نفس کی تکمیل مقصود نہیں تھی بلکہ اس کی مختلف حکمتیں تھیں جن کے پیش نظر مالی فی النساء من حاجۃ (مجھے عورتوں کی کوئی حاجت نہیں) کے باوجود بحکم خداوندی آپ نے یہ سارے نکاح کئے، ذیل میں اختصار کے ساتھ چند مصالح کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ حقیقت واقعہ پوری طرح واضح ہو جائے۔

(۱) **تعلیمی مصلحت** : ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضرات امہات المؤمنین درحقیقت درسگاہ رسول کی طالبات تھیں، بعثت رسول کے مقاصد میں سے اہم ترین مقاصد امت کو دین کی تعلیم دینا ہے و یعلمہم الكتاب والحکمة سے قرآن حکیم نے نبی کے اس فریضہ کی وضاحت کی ہے، اس تعلیم میں بہت سی باتیں وہ ہیں جن کا تعلق صرف عورتوں سے ہے یا عورتوں اور مردوں کے باہمی رابطہ سے ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ جس طرح مردوں کی ایک جماعت سفر و حضر میں نبی کریم..... کے ساتھ رہ کر تعلیمات نبوی سے مستفید ہو اسی طرح عورتوں کی بھی ایک جماعت خلوت و جلوت میں رسول اللہ..... کے ساتھ رہے تاکہ ان کے واسطے سے صنف نسواں کے مخصوص مسائل و احکام امت کی تمام بیٹیوں تک پہنچائے جاسکیں، کیونکہ عورتیں بالعموم اپنی فطری حیاء کی بنا پر براہ راست نبی علیہ السلام سے ان مسائل کو پوچھنے میں شرم کرتی تھیں، علاوہ ازیں خود آنحضرت..... بھی اپنی حیاء کامل کی وجہ سے ان کے مخصوص مسائل کے جوابات صراحتاً دینے پر قاصر نہ ہوتے تھے بلکہ ایسی صورتوں میں اشارہ و کنایہ کو کام میں لاتے تھے اور عورتیں بسا اوقات انھیں سمجھ نہ پاتی تھیں۔

چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک انصاریہ خاتون نے غسل حیض

سے متعلق احکام معلوم کئے، آنحضرت..... نے انھیں غسل کا طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا خذی فرصة ممسكة فتنطهری بها (خوشبو آلود کپڑے کا ایک ٹکڑا لے لو اور اس سے طہارت حاصل کرو) انصاریہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں اور عرض کیا کیف اطہر بها (اس سے کیوں کر طہارت حاصل کروں) آپ نے جواب میں پھر اسی جملہ فتنطهری بها کا اعادہ فرمایا، انصاریہ نے اظہارِ عجز کرتے ہوئے کہا کیف یا رسول اللہ اطہر بها نبی علیہ السلام نے ان کے اس اشارہ کو نہ سمجھنے پر تعجب آمیز لہجہ میں فرمایا سبحان اللہ تطہری بها لیکن انصاریہ پھر بھی نہ سمجھ سکیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب میں نے یہ حالت دیکھی تو انصاریہ کا ہاتھ پھینچتے ہوئے کہا ضعہا فی مکان کذا و تبغی بها اثر الدم (اسے فلاں مقام میں رکھ لے اور پھر دیکھتی رہ کہ اس پر خون کا اثر ظاہر ہوتا ہے یا نہیں) و صرحت لها بالمکان الذی تضعہا فیہ اور اس جگہ کی صراحت کر دی جس میں کپڑے کو رکھنا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے مخصوص مسائل کو عورتیں صراحتاً نہ تو نبی کریم سے دریافت کر سکتی تھیں (الآ ماشاء اللہ) اور نہ خود آنحضرت..... انھیں ہر عورت سے بیان کر سکتے تھے اس لئے ضروری تھا کہ دوچار نہیں بلکہ عورتوں کی ایک معتد بہ تعداد آپ کی زوجیت میں آکر ان مسائل کو دیکھے اور دوسری عورتوں تک انھیں پہنچائے۔

چنانچہ احادیث و سیر کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں رات کی تاریکیوں میں آ کر حضرت عائشہ صدیقہ اور دوسری ازواج طہرات سے اس قسم کے مسائل دریافت کیا کرتی تھیں۔

پھر یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ سنتِ مطہرہ صرف اقوال رسول میں منحصر نہیں بلکہ آنحضرت..... کے اعمال اور تقریرات کی بھی وہی حیثیت ہے جو اقوال کی ہے اور جس طرح فرمان نبوی امت کے لئے ہدایت اور ذریعہ نجات و سعادت ہیں، بعینہ اقوال و تقریرات بھی سرمایہ رشد و ہدایت ہیں، اب ظاہر ہے کہ یہ امہات المؤمنین نہ ہوتیں تو آنحضرت..... کے گھریلو اعمال اور تدبیر منزل کے احکامات کے معلوم ہونے کا ذریعہ کیا

ہوتا، الحاصل نبی کریم..... نے کثرتِ زوجات کے ذریعہ عورتوں میں معلّمات کی ایک جماعت تیار کر دی، احادیث نبوی اور سیرت رسول نیز احکام شرعیہ کا ایک قابل ذکر حصہ انھیں ازواجِ مطہرات کے ذریعہ امت تک پہنچا ہے بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہ تو اس وصف میں اکثر صحابہ کرام پر بھی فوقیت رکھتی ہیں۔

یہ ہے کثرتِ ازواج کی بنیادی حکمت اور اساسی مصلحت، اسی بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ معظمہ کی پوری زندگی اور مدینہ منورہ کے ابتدائی سنین میں چونکہ اصلاح عقائد و اخلاق پر زور تھا، ازواجِ مطہرات کی یہ کثرت نہیں تھی ۲ھ کے بعد جب اصلاح اعمال و افعال پر خصوصی توجہ دی جانے لگی، اور احکام عملیہ تیزی کے ساتھ نازل ہونے لگے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ عورتوں کی ایک جماعت حریم نبوت میں داخل ہو جائے تاکہ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی معلّمات کا ایک طبقہ پیدا ہو جائے۔

واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمة.

اور تم (اے ازواجِ رسول) خدا کی ان آیتوں اور رسول کی سنتوں کو یاد رکھو جن کا تمہارے گھروں میں چرچا کا تاکیدری حکم حضراتِ امہات المؤمنین کو اسی بنا پر تھا تاکہ آگے چل کر یہ صنفِ نسواں کی تعلیم و تربیت کا حق پورے طور پر ادا کر سکیں۔

(۲) **تشریحی مصلحت** : کثرتِ ازواج کے مصالح میں سے ایک مصلحتِ تشریحی بھی ہے اس کے ذریعہ آپ نے تنبیت کے بت کو ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دیا۔

متنبیٰ (لے پالک) بنانے کا طریقہ عرب میں قدیم زمانہ سے چلا آ رہا تھا، اور اہل عرب اس سلسلے میں اتنا غلو رکھتے تھے کہ متنبیٰ (منہ بولا بیٹا) کو حقیقی و صلبی بیٹے کے درجہ میں سمجھتے، میراث، نکاح، طلاق، حرمتِ مصاہرت، حرمتِ مناکحت وغیرہ تمام احوال میں منہ بولے بیٹے کا معاملہ حقیقی بیٹے کی طرح کرتے تھے، طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی کسی کو اپنا متنبیٰ بناتا تو اس سے کہتا انت ابنی ارثک و ترثنی (تو میرا بیٹا ہے میں تمہارا وارث ہوں اور تم میرے وارث ہو)

اسلام جو اصلاح معاشرہ کا سب سے بڑا داعی اور مبلغ ہے وہ ان باطل رسوم اور خلاف عقل و شرع امور کو کیونکر برقرار رکھ سکتا تھا اور پورے معاشرہ کو جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا ہوا کس طرح چھوڑ سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اولاً اپنے رسول کو متنبیٰ بنانے کا الہام کیا اور آپ نے بعثت سے قبل زید بن حارثہ کو متنبیٰ بنا لیا اور لوگ اس دن سے زید بن حارثہ کے بجائے زید بن محمد کہہ کر پکارنے لگے، امام بخاری و مسلم دونوں متفقہ طور پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

ان زید بن حارثہ مولیٰ رسول اللہ ما کننا ندعوہ الا زید بن محمد حتی نزل القرآن ”ادعوہم لابائہم هو اقسط عند اللہ“ فقال النبی انت زید بن حارثہ۔

متنبیٰ بنانے کے بعد آپ نے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب سے کر دیا اگرچہ زینب اس رشتے کیلئے اپنے آپ کو تیار نہیں کر پارہی تھیں مگر رسول اللہ..... کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا پھر بھی حسب و نسب کے لحاظ سے وہ اپنے کو حضرت زید سے اعلیٰ و برتر سمجھتی رہیں جس کی بناء پر وہ توافق و یکسانیت جو شوہر اور بیوی کے درمیان ہونا چاہئے پیدا نہ ہو سکی اور حالات بگڑتے بگڑتے اس حد کو پہنچ گئے کہ حضرت زید نے انہیں طلاق دیدی، زید کے طلاق دیدینے کے بعد حکم خداوندی پہنچا۔

فلما قضی زید منها وطرا زوجناکھا (جب زید نے زینب سے اپنی حاجت پوری کر لی اور ان کو طلاق دیدی تو اے نبی ہم نے ان کا نکاح آپ سے کر دیا)

چنانچہ آپ نے حضرت زینب سے نکاح فرمایا تاکہ عرب کی اس قدیم بدعت کا سلسلہ ٹوٹ جائے اور اسلامی طریقہ کی بنیاد قائم ہو۔ اس طرح اس مبارک نکاح کے ذریعہ عرب سے وہ رسم بدختم ہوئی جس میں وہ صدیوں سے گرفتار چلا آ رہا تھا۔

ساتھ ہی اس جدید تشریح الہی اور طریقہ اسلامی کو موکد کرنے کے لئے یہ حکم نازل فرمایا گیا۔ ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولكن رسول اللہ وخاتم النبیین وکان اللہ بکل شیء علیماً الا یہ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ خاتم سلسلہ نبوت ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شیء کا علم رکھنے والا ہے۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ نکاح حکم خداوندی سے ایک باطل رسم کو مٹانے کیلئے عمل میں آیا تھا نہ کہ ہوائے نفس کی تکمیل کے لئے، جیسا کہ معاندین اسلام و اعداء رسول..... کا فاسد خیال ہے۔

(۳) **اجتماعی مصلحت** : یہ حکمت حضرت عائشہ صدیقہ اور سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہما کے نکاحوں سے خوب ظاہر ہوتی ہے، ان نکاحوں کے ذریعہ آپ کے دونوں وزراء حضرت صدیق اکبرؓ و حضرت فاروق اعظمؓ آپ کے سلسلہ مصاہرت میں آگئے جس سے ان حضرات کا مزید اعتبار بڑھا اور آگے چل کر ان کی خلافتوں کو اس کے ذریعہ تقویت و منفعت حاصل ہوئی۔

علاوہ ازیں اسلام کی سر بلندی اور نشر و اشاعت میں ان ہر دو بزرگوار نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اس کا بھی تقاضا تھا کہ انہیں دنیا میں بھی خصوصی مقام اور امتیازی شان حاصل ہو، اسی لئے آنحضرت..... نے ان دونوں حضرات کی صاحبزادیوں سے نکاح فرما کر ان کی عزت افزائی فرمائی، جس طرح حضرت عثمان اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے نکاح میں اپنی صاحبزادیوں کو دے کر ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کیا۔ الحاصل یہ چاروں حضرات آپ کے اعظم صحابہ اور آپ کے بعد دین و ملت اور اس کی دعوت و امامت میں آپ کے خلیفہ تھے، اس لئے ان سے رشتہ مصاہرت قائم کرنا اجتماعی سیاست و حکمت کے لحاظ سے نہایت ضروری تھا۔

(۴) **سیاسی مصلحت** : بعض نکاحوں سے تالیف قلوب اور قبائل کو اپنی جانب مائل کرنے اور ان کے ظلم و جور اور بغض و عناد میں کمی کرنے کے مصالح پیش نظر تھے، مثلاً ام المومنین حضرت صفیہ کے نکاح پر غور کیا جائے اس نکاح سے پیشتر مشرکین سے جتنی جنگیں ہوئیں ان میں در پردہ یا کھلے طور پر یہود کا تعلق ضرور ہوتا تھا مگر تزویج صفیہ کے بعد یہود مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔

اسی طرح حضرت ام حبیبہ کے نکاح کا معاملہ ہے کہ ان کے والد ابوسفیان اس نکاح سے پہلے اسلام اور مسلمانوں کے بدترین مخالف اور دشمن تھے، اور حمراء الاسد، بدر صغریٰ اور

احزاب وغیرہ غزوات میں مشرکین کے قائد اور امیر لشکر یہی رہے تھے لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نکاح کے بعد انھوں نے مسلمانوں پر فوج کشی نہیں کی بلکہ نکاح کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد خود بھی مسلمان ہو کر آنحضرت کے حلقہ بگوش ہو گئے علاوہ ازیں سارے بنو امیہ اس رشتہ کا خیال کرنے لگے تھے جس کی بنا پر ان کی عداوت اور اسلام دشمنی میں بیحد کمی ہو گئی۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے سیاسی فائدہ کے ساتھ دینی فائدہ بھی ہوا کہ اس نکاح کی خبر حضرات صحابہ کو ہوئی تو وہ بیک زبان پکار اٹھے اصہار رسول اللہ تحت ایدینا حضور..... کے سسرال کے لوگ ہماری قید غلامی میں رہیں؟ اور یک لخت سارے قیدیوں کو آزاد کر دیا قبیلہ بنو مصطلق پر اس سیر چشتی اور شرافت و مروّت کا یہ اثر ہوا کہ پورا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور اس نکاح کی برکت سے دنیا و آخرت دونوں کی ذلت سے سب کے سب نجات پا گئے، اسی لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں ما رأینا امرأة كانت اعظم برکة علی قومها منها میں نے کسی عورت کو نہیں دیکھا جس کی برکت و منفعت اپنی قوم پر حضرت جویریہ سے زیادہ ہو۔

غرضیکہ کثرت ازدواج کے ذریعہ مختلف خاندانوں سے آپ کے تعلقات قائم ہوئے جو آگے چل کر اسلام اور مسلمانوں کی ترقیات کے ذریعہ بنے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ کے نکاح میں بنو ہاشم میں سے کوئی عورت نہیں آئی کیونکہ وہ تو اپنا خاندان تھا۔

ان جملہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نکاح کے سلسلہ میں آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لئے نہیں تھا بلکہ اس سے ملک و قوم، اسلام اور عالم انسانیت کے مصالح و مفاد وابستہ اور مربوط تھے جسے نظر انداز کرنا اس ہادی برحق اور مصلح اعظم کے لئے ممکن نہیں تھا جسے رب العالمین نے دنیا میں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔

یارب صل وسلم دائماً ابداً

علی حبیبک خیر الخلق کلہم

☆ ☆ ☆

ہماری تاریخ کا ایک باب یہ بھی ہے!

(۱) خدام کے آرام و راحت کا خیال

سلطان اتمش جس نے ۶۰۷ھ سے ۶۳۳ھ تک نہایت کڑ و فر کے ساتھ ہندوستان میں حکمرانی کی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی المتوفی ۶۳۳ھ اپنے ملفوظات ”فوائد السالکین“ میں اس کے اخلاق حمیدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”اتمش صحیح العقیدہ تھا، وہ راتوں کو جاگتا، اگر کبھی اتفاقاً نیند آ جاتی تو فوراً بیدار ہو جاتا اور وضو کرتا، اپنے نوکروں چاکروں میں سے کسی کو نہ جگاتا اور کہتا کہ آرام سے سونے والوں کو کیوں تکلیف دی جائے۔ رات کو فقیروں کے بھیس میں باہر نکل جاتا۔ اس کے ہاتھ میں اشرفیوں کا تھیلا ہوتا، لوگوں کے دروازوں پر جاتا، انھیں دستک دے کر باہر بلاتا ان کے حالات دریافت کرتا اور ان کی حسب ضرورت مدد کرتا اور قسمیں دے کر ان سے کہتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں نہ ہوں یا ان پر کوئی ظلم و زیادتی کرے تو وہ اس کے دربار کے پاس آ کر لنگی ہوئی زنجیر عدل کو ہلائیں تاکہ وہ حالات سے باخبر ہو کر انصاف کر سکے کیونکہ قیامت کے دن ان کی فریاد کے بار کو اٹھانے کی طاقت اس کے اندر نہیں ہے۔ (فوائد السالکین ص ۲۹)

(۲) افشائے راز

شیخ قطب الدین بختیار کاکی نے اپنے وصال کے وقت وصیت کی تھی کہ میری نماز جنازہ ایسا شخص پڑھائے جس میں یہ تین وصف جمع ہوں: (۱) ہمیشہ عقیف رہا ہو کسی غیر محرم پر اس نے کبھی نظر نہ ڈالی ہو (۲) اس کی عصر کی سنتیں قضا نہ ہوئی ہوں (۳) اور ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولیٰ سے شریک رہا ہو۔ نماز جنازہ کے وقت جب اس

وصیت کا اعلان کیا گیا تو کوئی آگے نہیں بڑھا کچھ دیر انتظار کے بعد سلطان التمش یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا کہ میری خواہش تو یہی تھی کہ میرا حال لوگوں سے پوشیدہ رہے لیکن خواجہ نے آج اس راز کو فاش کر دیا۔ (تذیبتہ الاصفیاء ج ۱ ص ۲۷۵)

(۳) بیوی کو صبر کی تلقین

سلطان التمش کا لڑکا سلطان ناصر الدین محمود بھی باپ ہی کی طرح نہایت عابد و زاہد اور درویشانہ صفات کا حامل تھا۔ وہ ۶۴۴ھ میں تخت نشین ہوا اور بیس سال تک حکمرانی کے فرائض انجام دیئے وہ اپنے ذاتی مصارف کا بار خزانہ پر بالکل نہیں ڈالتا تھا بلکہ کلام پاک کی کتابت سے اپنے اخراجات پورے کرتا تھا اس لئے اس کی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گزرتی تھی گھر گریہ ہستی کے کاموں کو انجام دینے کے لئے اس کے محل میں کوئی خادمہ تک نہ تھی ایک روز اس کی ملکہ نے شکایت کے طور پر کہا کہ میں آپ کے لئے روٹی پکاتی ہوں تو میرے ہاتھ جل جاتے ہیں اور ان میں آبلے پڑ جاتے ہیں سلطان ملکہ کی یہ تکلیف سن کر رونے لگا۔ پھر بیوی کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ دنیا گزر جانے والی ہے یہاں اس تکلیف کو برداشت کر کے صبر کرو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کے اجر میں تم کو تمہاری خدمت کے لئے حور عطا فرمائے گا ابھی تو میں تمہارے لئے بیت المال سے کوئی کتیرا خادمہ نہیں خرید سکتا۔ سلطان کی نیک دل بیوی نے درویش شوہر کی رائے سے اتفاق کیا۔ (البدایونی، ج ۱ ص ۹۰)

(۴) احساس دیانت

شاہان بلبن کے بعد جلال الدین فیروز شاہ دہلی کے تخت و تاج کا مالک ہوا رسم تاج پوشی کے موقع پر دو رکعت شکرانہ کی ادا کرنے کے بعد تخت شاہی پر بیٹھا اور اپنے امراء سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے بارسلطنت اٹھا تو لیا ہے لیکن متخیر ہوں کہ میرا انجام کیا ہوگا۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر سلطان بلبن کے محل میں گیا جس کا نام ”کوشک لعل“ تھا اس وقت اس کے ساتھ ایک درباری ملک احمد حبیب تھا اس درباری نے سلطان فیروز شاہ سے

کہا کہ اب آپ کو اس درالامارت میں سکونت اختیار کرنی چاہیے سلطان نے جواب دیا کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے اس کی تعمیر کی تھی اب یہ ان کی اولاد کی ملکیت ہے میرا اس پر حق نہیں ہے۔ ملک احمد حبیب نے کہا کہ امور حکمرانی میں اتنی پابندی کی گنجائش نہیں۔ سلطان نے برجستہ جواب دیا کہ دنیا کے چند روزہ مفاد کی خاطر اسلامی احکام کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور نفس کی پیروی میں کوئی کام انجام نہیں دوں گا۔

(۵) مکارم اخلاق

سلطان بہلول لودی ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ نیک دل سلطان اپنی بادشاہت کے زمانہ میں پانچوں وقت کی نماز جماعت سے ادا کرتا تھا، شریعت کی پابندی کا بے حد خیال رکھتا، لوگوں کی درخواستوں کو خود دیکھتا اور سب کے ساتھ عدل کرتا، دربار میں تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ امراء کو اپنے سامنے کھڑا ہونے دیتا۔ اس کے امیروں یا لشکریوں میں کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لئے ضرور جاتا۔ اگر کسی کو اس سے رنج پہنچ جاتا تو اس کے پاس جا کر معذرت خواہ ہوتا۔ میدان جنگ میں پہلے دو رکعت نماز پڑھتا۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے فلاح کی دعائیں مانگتا پھر جا کر دشمنوں سے مقابلہ کرتا اپنی تخت نشینی کے بعد جب پہلی مرتبہ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا تو خطیب نے خطبہ پڑھنے کے دوران افغانوں کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ سبحان اللہ! یہ بھی عجیب قوم پیدا ہوئی ہے، شاید یہ دجال کے پیش رو ہوں ان کی زبان یہ ہے کہ ماں کو مور، بھائی کو ور، گاؤں کو شور اور لشکر کو تور کہتے ہیں۔ اپنی قوم کی اس قدر تضحیک کے باوجود سلطان نے مسکرا کر صرف اتنا کہا کہ خطیب صاحب بس کیجئے ہم لوگ بھی خدا کے بندے ہیں۔ (حکمرانوں کی توخیر بڑی بات ہے علماء و صلحاء کی جماعت میں بھی حلم و بردباری کی ایسی مثال کم ملے گی) تاریخ داؤدی ص ۱۱۔

پاکبازی

احمد نظام الدین شاہ والی احمد نگر المتوفی ۹۰۴ھ نہایت ہی پاک خصلت اور نیک طینت

فرماں روا تھا۔ وہ جب باہر نکلتا تو راستے میں دائیں بائیں دیکھنے کے بجائے اپنی نظریں نیچے کئے رہتا۔ ایک بے تکلف امیر نے اسکی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ شہر سے گذرتے وقت میری سواری کا تماشا دیکھنے کیلئے مرد عورت آکر کھڑے ہو جاتے ہیں میں ڈرتا ہوں کہ میری نگاہ کسی نامحرم پر پڑ جائے اور اس کا وبال مجھ پر نازل ہو۔ (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۰۰)

حق بحق دار رسید

سکندر لودھی کے عہد حکومت میں سنہ ۱۰۰۰ء کے علاقہ میں ایک شخص کو پندرہ ہزار اشرفیوں کا ایک دینہ دستیاب ہو گیا، سنہ ۱۰۰۰ء کے حاکم میاں قاسم نے اشرفیوں کو اس شخص سے وصول کر لیا اور سلطان سکندر کے پاس ایک درخواست بھیج کر پوچھا کہ اس دینہ کے بارے میں کیا حکم ہے۔ سلطان نے حکم دیا کہ پانے والے کو واپس لوٹا دیا جائے حاکم سنہ ۱۰۰۰ء نے پھر لکھ کر بھیجا کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے۔ سلطان نے اس کو لکھا کہ اے احمق جس نے اس شخص کو یہ دینہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے اگر یہ مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں کون کس چیز کا مستحق ہے۔ (تاریخ داؤدی ص ۴۲)

خوف آخرت

والی گجرات سلطان محمود بیکوہ کا جانشین سلطان مظفر ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ قیامت کے ذکر پر مشتمل آیتوں کو پڑھ کر بے اختیار رونے لگا اور بولا معلوم نہیں اس وقت میرا کیا حال ہوگا۔ اس کے ایک ندیم شیخ جیونے کہا جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ سے کوئی گناہ کبیرہ نہیں ہوا ہے۔ کثرت عبادت آپ کا مشغلہ ہے، خلق خدا بھی آپ سے خوش ہے تو قیامت کے وقت آپ کو بلند ترین درجات ملیں گے۔ سلطان نے یہ سن کر کہا شیخ جیو میری گردن پر بارگراں ہے اسی لئے روتا ہوں کیا تم نے پیغمبر آخر الزماں..... کی یہ حدیث نہیں سنی ”نجا المخفقون و هلك المثقلون“ ہلکے پھلکے لوگ نجات پالیں

گے اور جو گراں بار ہے وہ ہلاک ہوگا۔ (مرآة سکندری ص ۱۷۰)

انجام کی فکر

سلطان محمود بیکوہ جس نے ۸۶۲ سے ۹۱۷ تک صوبہ گجرات میں حکمرانی کی۔ اپنی آخر عمر میں عبادت میں مشغول رہتا اور اکثر روتا رہتا تھا اس کے ایک درباری امیر ملک سارنگ نے سلطان کو برابر روتے ہوئے دیکھ کر ایک دن عرض کیا کہ دولت بھی ہے شہنشاہی بھی ہے پھر رونے کی کیا وجہ ہے؟ سلطان نے کہا اے بے عقل! تم کو کیا بتاؤں مجھے کیا غم کھائے جا رہا ہے۔ میرے مرشد شاہ عالم نے اگرچہ میرے لئے دعا فرمائی ہے کہ ”محمود کی عاقبت محمود ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری عاقبت محمود نہ ہو سکے گی۔ عمر کی نہر برابر جاری ہے اور اس سے جو حصہ بہہ جاتا ہے وہ کبھی واپس نہیں لوٹے گا۔ اسی لئے روتا ہوں، افسوس اور حسرت تو اس پر ہے کہ اپنے ولی نعمت کی قدر جتنی جانی چاہئے تھی اتنی نہ جان سکا اور جتنی جانی اس پر عمل نہ کر سکا۔ (مرآة سکندری ص ۷۹)

حسن خاتمہ

علاء الدین حسن گانگو المتونی ۷۵۹ھ جس نے گلبرگہ، احمد آباد اور بیدر میں گیارہ سال تک بڑی کامیاب حکمرانی کی۔ اپنے مرض موت میں ایک دن اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ محمود کو پاس نہ دیکھ کر پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ بتایا گیا کہ مکتب میں پڑھ رہا ہے۔ حسن گانگو نے صاحبزادہ کو بلوا کر پاس بٹھایا اور پوچھا کہ کیا پڑھ رہے تھے شہزادے نے جواب دیا کہ شیخ سعدی شیرازی کی بوستاں پڑھ رہا تھا۔ گانگو نے پوچھا کون سی حکایت شہزادہ نے کہا وہ حکایت جس میں یہ ہے۔

شندیم کہ جمشید فرخ سرشت بسر چشمہ بر بسنگے نوشت
بدیں چشمہ ہوماں بسے دم زدند برقتند چوں چشم برہم زدند
گرقتند عالم بمردی وزور ولیکن نبردند باخود بگور

جس وقت گانگو نے تیسرا شعر سنا تو اس پر بے اختیار گریہ وزاری ہو گیا۔ اور اسی وقت اپنے خزانچی کو بلایا، اور اپنے ذاتی خزانہ کے تمام اثاثے کو نکلوایا اور اپنے بیٹوں کے حوالے کیا کہ انھیں لے جا کر جامع مسجد میں علماء، فقراء، میں تقسیم کر دو۔ شہزادوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ اور جب تمام تقسیم کر کے باپ کو واپس آ کر اس کی اطلاع دی تو حسن گانگو نے کہا ”الحمد للہ“ اور اسی وقت روحِ نفسِ غضری سے پرواز کر گئی۔ (تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۸۱)



تاریخ اسپین کا عبرت خیز ورق

”اسپین“ جس پر مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک اس آن بان کے ساتھ حکومت کی کہ ان کی قوت و عظمت سے پورا براعظم یورپ مبہوت و متحیر تھا، جس کے شہر و قصبات، مدارس و جامعات کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں سے گوارہ علم و فن بنے ہوئے تھے، جس کی مسجد ”جامع قرطبہ“ اپنی وسعت اور شان و شوکت کے لحاظ سے عالم اسلامی میں بے نظیر تھی، جس کا ایک چپہ بھی بنجر اور بن کھیتی کا نہ تھا، حتیٰ کہ پہاڑوں پر بھی زراعت ہوتی تھی، جس کی تہذیب و ثقافت نے تمام دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کیا، جس کے ہر شعبہ زندگی میں آج بھی اسلام کی چھاپ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے، مگر آج وہی اسپین مسلمانوں کے وجود سے خالی ہے، جامع قرطبہ تسبیح و تہلیل کے ترنم سے محروم ہے، تکبیر و توحید کی آواز وادی البرتات سے ٹکرا کر خاموش ہو گئی ہے، اسپین کی المناک تاریخ آج ملت اسلامیہ کو خون کے آنسو لارہی ہے اور اسپینی مسلمانوں کی بے مثال تباہی کی داستان سن کر ان کے دل تڑپ اٹھتے ہیں۔

تاریخ اسلامی کے نامور مورخ اکبر شاہ نجیب آبادی اسپین کی اس تباہی و بربادی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مسلمانوں پر یہ مصائب اس لئے نازل ہوئے کہ انھوں نے کلام الہی کو پس پشت ڈال دیا تھا، جس کی وجہ سے ان میں خود غرضی اور نا اتفاقی پیدا ہوئی، پابندیِ اسلام کے ترک ہونے کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمان سردار اپنے بھائی مسلمان سرداروں کی مخالفت میں عیسائیوں کے پاس جا کر ان سے مدد طلب کرنے میں کوئی باک و تامل نہ کرتے تھے، مسلمانوں نے خود عیسائیوں کے ہاتھوں خوشی خوشی مسلمانوں کو ذبح کرایا... اندلس کے مسلمانوں نے اپنی

بد اعمالیوں سے اپنے آپ کو مغضوب بنا لیا تھا، اس لئے ان کو دنیا کے کسی حصہ سے کوئی امداد نہ پہنچی اور کفار کے ہاتھوں سے نجار کو خدائے تعالیٰ نے سزا دلوائی، مسلمان جب کبھی اور جہاں کہیں دین اسلام سے غافل اور قرآن سے بے تعلق ہوئے ان پر ایسی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں۔‘ (تاریخ اسلام ج ۳ ص ۲۷۴)

طوائف الملوکی اور اس کے منفی اثرات

اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ اسپینی امراء رقابت و ثروت میں مغمور ہو کر اسلامی تعلیمات کے علی الرغم عیش و نشاط، سرود و رباب کے دلدادہ ہو گئے، اسلامی اخوت و محبت کے بجائے ان کے اندر خود غرضی اور اقتدار کی ہوس نے جڑ پکڑ لی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۲۲ھ سے وہاں طوائف الملوکی شروع ہو گئی اور اسپین چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں میں تقسیم ہو گیا، قرطبہ اشبیلیہ، غرناطہ، بلنشیہ، مالقا وغیرہ شہروں میں ان ریاستوں کے دار الحکومت قائم ہو گئے، ان ریاستوں میں آئے دن اقتدار کی جنگ ہونے لگی، عیسائی سلاطین نے مسلمانوں کی اس خانہ جنگی سے بھرپور فائدہ اٹھایا کبھی ایک ریاست کو مدد پہنچا کر اور کبھی دوسری ریاست کو کمک دے کر انھیں لڑا لڑا کر بالکل بیدم کر دیا تو پھر اپنا دست ستم بڑھایا۔ مسلمان چونکہ اپنی ساری توانائی باہمی جنگوں میں اپنے ہاتھوں برباد کر چکے تھے، اس لئے وہ عیسائی حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے، وہ ایک ایک کر کے سارے شہروں پر قابض و متصرف ہو گئے، مسلمانوں کا آخری سہارا صرف غرناطہ رہ گیا تھا جو اب تک عیسائیوں کے دست ستم سے محفوظ تھا، ۱۲ جمادی الآخر ۸۹۶ھ کو قسطلہ کے عیسائی حکمران فردی نند نے ایک مسلم امیر زغل کی ناعاقبت اندیشیوں سے فائدہ اٹھا کر ایک لاکھ فوج سے غرناطہ کا محاصرہ کر لیا، یہ محاصرہ تقریباً آٹھ ماہ تک جاری رہا، سپہ سالار اعظم موسیٰ غسانی اور دیگر حکام میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے مگر سلطان ابو عبد اللہ ہمت ہار چکا تھا اس لئے سپہ سالار کی رائے کے برعکس خفیہ طور پر اپنے وزیر کو فردی نند کے پاس بھیج کر صلح کی پیش کش کی، فردی نند اور اس کے سپاہی محاصرہ کی طوالت سے اکتا چکے تھے، اس غیر متوقع

پیش کش کو انھوں نے فوراً قبول کر لیا چنانچہ جانبین کی منظوری سے صلح نامہ تیار ہوا جس کی اہم دفعات یہ تھیں۔

- (۱) کسی مسلمان کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، مسلمانوں کو اختیار ہوگا چاہے غرناطہ میں رہیں یا اور کہیں چلے جائیں۔
- (۲) مسلمانوں کے معاملات میں عیسائی مداخلت نہیں کریں گے۔
- (۳) عیسائی مسجدوں میں داخل نہیں ہوں گے۔
- (۴) مساجد اور اوقاف بدستور قائم رہیں گے۔
- (۵) مسلمانوں کے معاملات کا تصفیہ شریعت اسلامی کے موافق مسلم قاضی کریں گے۔
- (۶) جو عیسائی مسلمان ہو گئے ہیں انھیں ترک اسلام پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔
- (۷) سلطان ابو عبد اللہ کے سپرد البشرات کی حکومت کر دی جائے گی۔
- (۸) آج سے ساٹھ دن کے اندر قلعہ الحمراء توپ خانہ وغیرہ دیگر اسلحے جو اس وقت قلعہ میں موجود ہیں عیسائیوں کے حوالہ کر دیا جائے گا۔
- (۹) شہر غرناطہ ایک سال تک آزاد رہے گا، سال بھر کے بعد شرائط بالالموظر رکھتے ہوئے عیسائی اس پر قابض ہوں گے۔
- (۱۰) طرفین کے قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔

اس صلح نامہ پر یکم ربیع الاول ۸۹۷ھ مطابق ۳ جنوری ۱۴۹۲ء کو فریقین کے دستخط ہوئے۔

قلعہ الحمراء پر قابض ہوتے ہی ”فردی نند“ نے صلح نامہ کی ساری شرطیں یک لخت فراموش کر دیں، شہر غرناطہ پر اپنا مکمل تسلط قائم کر لیا، ابو عبد اللہ سلطان کو البشرات سے بیدخل ہونے پر مجبور کر دیا۔

مختلف مسلم جماعتیں اور ان کا انجام

اسپین میں آباد مسلمانوں کی مختلف جماعتیں تھیں: (۱) خالص عربی النسل، جو عام

طور پر شام، یمن، حجاز اور حضرموت سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ (۲) خالص بربری، ان کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی، (۳) مولدین یعنی وہ لوگ جن کے باپ عرب یا برتھے اور مائیں اسپینی تھیں (۴) نو مسلم یعنی وہ عیسائی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ان کی اولاد بھی نو مسلم ہی کہلاتی تھی۔

سقوطِ غرناطہ کے وقت عام طور پر عربی النسل اور بربری مسلمان اسپین چھوڑ کر تیونس، مراکش وغیرہ ملکوں میں چلے گئے، جنہیں بس اتنی اجازت دی گئی کہ صرف اپنی جان لے کر چلے جائیں مال و اسباب ساتھ لے جانے کی قطعی اجازت نہیں تھی، ان ہجرت کرنے والوں میں بھی بہت سارے عیسائی لیروں کے ہاتھوں راستے ہی میں شہید ہو گئے۔

کچھ بچے کچھ عربی جنہوں نے ترک وطن کو گوارہ نہیں کیا وہ اسپین ہی میں رہ گئے انہیں حملہ آور اور غیر ملکی جیسے نفرت آمیز ناموں سے یاد کیا جاتا تھا، تیسری اور چوتھی جماعت کے مسلمانوں نے عام طور پر اسپین ہی میں رہنے کو ترجیح دی، کیونکہ انہیں ’فردی نند‘ کے اس اعلان پر اعتماد تھا کہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔

غرناطہ پر تسلط مکمل ہو جانے کے بعد اسپین سے مسلمانوں کو تاخت و تاراج اور نیست و نابود کرنے کی غرض سے درج ذیل ظالمانہ و منافقانہ طریقے اختیار کئے گئے:

(۱) مسلم عدالتیں توڑ کر عیسائی عدالتیں قائم کی گئیں جن میں ہر روز ہزاروں مسلمان پیش کئے جاتے اور ان پر جھوٹے جھوٹے الزامات عائد کر کے آگ میں جلا دیا جاتا۔

(۲) مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی کا سلسلہ شروع کیا گیا کہ یہ لوگ ہتھیار جمع کرتے ہیں اور خفیہ طور پر حکومت کے خلاف اسکیمیں بناتے ہیں۔

(۳) عیسائیوں کی جانب سے مسلمانوں پر حملے کئے جاتے جن میں قتل و غارت گری کے علاوہ ان کے گھروں اور دکانوں کو نذر آتش کر دیا جاتا، حملوں کا یہ سلسلہ ختم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی رہا اور اسپین کا کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہیں تھا جہاں کے مسلمانوں کی جان و مال تباہ نہ کی گئی ہو۔

(۴) عربی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کر دی گئی۔

(۵) پورے ملک میں یہ پابندی لگا دی گئی کہ مسلمان اپنا کوئی بڑا تعلیمی ادارہ قائم نہیں کر سکتے۔

(۶) غلط تاریخیں مرتب کرائی گئیں جن میں مسلمانوں کو ظالم و غاصب اور ان کے عہد حکومت کو دور غلامی سے تعبیر کیا گیا، مسلم حکمرانوں نے اسپین کی تہذیب و ترقی سے متعلق جو گراں قدر کارنامے انجام دیئے تھے انہیں تاریخ کے صفحات سے یا تو خارج کر دیا گیا یا اسے بے حیثیت کر کے بیان کیا گیا۔

(۷) خالص اسپینی مسلمانوں کو پھر سے عیسائی بنانے کی مہم شروع کی گئی، ان سے کہا جاتا کہ تمہارے آباؤ اجداد کو عربوں نے بحیرہ واکراہ مسلمان بنا لیا تھا، اب تم آزاد ہو، اس لئے اپنے اصلی مذہب کی طرف واپس آ جاؤ۔

(۸) بعض مسلمانوں کو زبردستی بپتسمہ دیا جاتا اور ان کے لڑکوں کو عیسائی بنا لیا جاتا۔

(۹) بڑے بڑے اجتماعات کئے جاتے جن میں فرضی طور پر کچھ لوگوں کو اسٹیج پر پیش کیا جاتا کہ یہ مسلمان تھے مگر انہوں نے برضا و رغبت اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لی ہے، پھر ان کا خوب اعزاز و اعلان کیا جاتا۔

(۱۰) مختلف جیلوں و تدبیروں کے ذریعہ مسلم عوام کو علماء و شرفاء سے بدظن کر کے ان میں بعد اور تفریق پیدا کر دی گئی۔

(۱۱) شرعی طریقہ کے برخلاف نکاح کے لئے سرکاری عدالتوں میں رجسٹرڈ کرانے کو لازم قرار دیا گیا۔

جبری عیسائی بنانے کا روح فرسا اقدام

ان ہمت شکن حالات میں بھی اسپینی مسلمان اپنے دین و مذہب کو سینے سے لگائے رہے اور اپنی نسلوں میں دین کو باقی و زندہ رکھنے کا یہ نظم کیا کہ گھروں اور مسجدوں میں بچوں کی دینی تعلیم کا نظم اپنے طور پر کیا، لیکن یہ سلسلہ تا دیر قائم نہ رہ سکا، ۹۰۴ھ میں یہ اعلان عام کیا گیا کہ مسلمان اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لیں، ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے گا،

اس اعلان پر مسلمانوں کا ایک طبقہ ملک بدر ہونے کے لئے تیار ہو گیا، فردی نندنے انھیں افریقہ چلے جانے کی اجازت دیدی اور ان کے ساتھ بظاہر یہ کرم کا معاملہ کیا کہ جہاز بھی فراہم کر دیئے گئے مگر عیسائیوں نے ان جہازوں کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی غرق کر دیا، اور سارے مہاجرین مع اہل و عیال اور قیمتی کتب خانوں کے ہمیشہ کے لئے تہہ آب آسودہ خواب ہو گئے، اور بقیہ سارے مسلمانوں نے شہروں اور آبادیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کو اپنا بلجا اور جائے پناہ بنالی، ہر نوع کی اذیتیں برداشت کیں مگر اسلام کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، ان پہاڑوں میں پناہ گزین مجبوروں کو بھی عیسائی حکومت نے برداشت نہیں کیا، ان کی گرفتاری و قتل کا سلسلہ برابر جاری رہا، کبھی جب دس بیس پناہ گزین اکٹھا ہوتے تو مقابلہ کی بھی نوبت آجاتی اور بہادرانہ لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے، بعض اندلس کے شمالی پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے اور بے سروسامانی کی حالت میں ہلاک ہو گئے، ان میں سے بعض بچ کر یورپ کے ملکوں کو طے کر کے ملک شام پہنچے، ان مرنے والوں کے بچوں کو عیسائیوں نے اپنے قبضہ میں لے کر عیسائی بنالیا، اس طرح ملک فرانس کے جنوبی اور ملک اسپین کے شمالی حصوں میں عربی النسل خاندانوں کے وجود کا امکان مؤرخین نے تسلیم کیا ہے، اسی بناء پر پنپولین کو بعض لوگ عربی النسل لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی اپنی کوئی تنظیم یا ادارہ موجود نہیں تھا جو ان حالات میں ان کی صحیح رہنمائی و دستگیری کرتا، باشعور، عزیمت پسند افراد بھی باقی نہ بچے تھے جو حالات کے رخ کو موڑنے کی فکر کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں کے عرصہ میں قسم کھانے کو بھی سرزمین اسپین میں خدائے وحدہ لا شریک لے کا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہا، سب ہی کو مختلف ہلاکت خیز طریقوں سے موت کی نیند سلا دیا گیا، اگر کچھ ان ہلاکت خیز یوں سے کسی طرح محفوظ رہ گئے تو اپنی جان بچا کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

درس عبرت

واقعات و مشاہدات گواہ ہیں کہ سرزمین ہند میں بھی ہندو احمیاء پرست طاقتیں اسپین

کی تاریخ دہرا نا چاہتی ہیں۔

(۱) وہی فرقہ وارانہ فساد کی تکنیک ہے جس پر آزادی کے وقت ہی سے عملدرآمد ہو رہا ہے اور کمی کے بجائے اس میں دن بدن ترقی ہوتی جا رہی ہے اور چند سالوں سے حکومت کی صوبائی پولیس ان فساد یوں کے ہراول دستے کی خدمت انجام دینے لگی ہیں۔

(۲) مسلمانوں کو ظالم و غاصب ثابت کرنے کی غرض سے تاریخوں میں تحریف اور رد و بدل کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے۔

(۳) مسلمانوں کے دین و مذہب پر برابر حملے کئے جا رہے ہیں، کبھی مسلم پرسنل لا کو تبدیل کر دینے کی باتیں کی جاتی ہیں، اور کبھی مسلمانوں کی مقدس کتاب پر پابندی عائد کرانے کی سعی کی جاتی ہے۔

(۴) مسلمانوں کے مذہبی و تاریخی آثار کو سرزمین ہند سے مٹا دینے کی تشدد آمیز تحریک جاری ہے، بابری مسجد اور ملک کی سیکڑوں مساجد و مقابر اس جارحانہ تحریک کا نشانہ بن چکی ہیں۔

(۵) مسلم عوام اور ان کے دینی و ملی رہنماؤں کے درمیان تفریق قائم کر دینے کی مؤثر جدوجہد ہو رہی ہے، اور اپنی غفلت شعاری سے یا مفاد پرستی سے بعض مسلمان بھی اس خطرناک سازش کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں اور اس خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں اپنا زور قلم صرف کر رہے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی۔

(۶) بعض علاقوں میں دین سے ناواقف مسلمانوں کو مرتد بنانے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔

ایک طرف تو اسلام اور مسلمانوں کو صفحہ ہند سے مٹا دینے کی یہ منظم سازشیں اور مسلسل کوششیں ہیں کہ تمام ہندو احمیاء پرست پارٹیاں متحد ہو کر ہمارے آثار و روایات کو مٹو کر دینے پر تلی ہیں، دوسری طرف ہم ہیں کہ اپنی غفلت شعاریوں اور راحت کوشیوں کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں، دشمن مجتمع ہو کر حملے پر حملے کئے جا رہے مگر ہماری صفوں میں انتشار و تفرقہ ہے اور خود اپنوں ہی کے دست و بازو کو ناکارہ بنانے میں ہم مصروف

ہیں، حوادث و مصائب کے طوفان بار بار آ کر ہمیں دستک دے رہے ہیں مگر ہم پر ایسی شدید نیند طاری ہے کہ آنکھ کھلتی ہی نہیں، غنیم ہر چہا طرف سے ہمیں نرغے میں لینے کی تیاریاں مکمل کر چکا ہے، لیکن ہم اپنے اپنے مخصوص دائروں میں اس طرح محصور ہیں کہ ملت کے وسیع تر مفاد کے متعلق غور و فکر کی ہمیں فرصت ہی نہیں، رہنمایان ملت اور علمائے دین، ولی اللہی تحریک دعوت و اصلاح کو چھوڑ کر اپنے زاویوں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں حالانکہ طاغوتی طاقتیں منبر و محراب اور مدرسہ و خانقاہ پر کنڈیس ڈال رہی ہیں، امداد و ضامن کے فرزند و اور قاسم و رشید کے درس حکمت و عزیمت کے پاسبانو! بابرہی مسجد کی زمیں بوس دیواریں تمہیں آواز دے رہی ہیں، شیخ الہند کی غیرت و حمیت اور حضرت مدنی کی شجاعت و استقامت کے وارثو! مظلوم شہیدوں کا بہتا ہوا خون اور سلگتا ہوا جسم تمہیں دعوت حرکت و عمل دے رہا ہے حضرت مجدد الف ثانی کے اس ارشاد گرامی پر ذرا غور کرو تمہیں کیا سبق دے رہا ہے۔ ”ہر چند سلامتی در زاویہ است اما دولت شہادت در معرکہ است، کنج زاویہ با اہل ستر و ارباب ضعف مناسب است، کار مردان اقویا مبارزت و معرکہ کبریٰ است“ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دنیا کی اورتو میں ہمارے لئے وسیلہ عبرت تھیں مگر آج خود ہمارے ادبار و زوال کی حکایت اوروں کے لئے مثال عبرت ہے۔

انسان کی تمام اندرونی قوتیں اور جذبات خارجی محرکات کے محتاج ہوتے ہیں، ان کی مثال سوئے ہوئے انسان کی سی ہوتی ہے جو اگرچہ زندہ ہے مگر حرکت کے لئے کسی بیدار کن صدا کا محتاج ہے، آج کے واقعات و حادثات ہماری تنبیہ اور غفلت شکنی کے لئے ہیں، وقت نے صدائے رحیل بلند کر دی ہے، اسے محسوس کیجئے اور حرکت و عمل کیلئے تیار ہو جائیے خدا نخواستہ اگر ہم آج بھی خواب غفلت میں پڑے سوتے رہے، تو باور کیجئے زمانہ پھر اٹھنے کا موقع نہیں دے گا انقلاب و تغیر کی اہمیت و نزاکت کو خدا رانظر انداز نہ کیجئے، سوچنے اور غور و فکر کرنے کا وقت یہی ہے، ضرورت ہے کہ کمال حزم و احتیاط کے ساتھ آئندہ اقدامات کا ایک نقشہ مرتب ہو، اگر یہ وقت محض اخبار کی قلم فرسائیوں اور تقریر کی طلسم طرازیوں میں ضائع کر دیا گیا تو یاد رکھئے قدرت اپنی بخششوں میں جس قدر فیاض

ہے اتنی ہی غافلوں کی تعذیب میں شدید ہے۔

تنظیم ملت کے چند اصول

ابتدائی مراحل میں بغیر کسی تاخیر کے درج ذیل کاموں کو پورے ولولہ اور حوصلہ مندی کے ساتھ انجام دیا جائے۔

(۱) باہمی یگانگت اور اتحاد و بھائی چارگی کو ترقی دی جائے، تمام جھگڑوں اور اختلافوں کو دور کیا جائے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے درد و غم میں شریک ہو جائے۔ اور یہ حقیقت لوگوں کے دلوں میں نقش کر دی جائے کہ مسلمانوں کی کسی معصیت نے ان کو اس قدر نقصان نہیں پہنچایا ہے جس قدر باہم اختلاف اور تفرقہ نے اور کوئی چیز ان کو اس قدر نفع نہیں پہنچا سکتی جس قدر یہ چیز کہ سب مل کر ایک اور بھائی بھائی ہو جائیں۔

(۲) مسلمانوں کی عملی زندگی بالکل تباہ ہو چکی ہے اس لئے ضروری ہے کہ احکام شرع کے احترام و اتباع کا مردہ جذبہ پھر از سر نو زندہ کر دیا جائے، اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ لوگوں کے دل اللہ اور اس کی شریعت کے حکموں کے آگے سر بسجود ہو جائیں۔

(۳) مسلمانوں کو سمجھایا جائے کہ بیکاری ایک شرعی و ملی معصیت ہے اس لئے کسی مسلمان کو اپنی زندگی بیکار نہیں کاٹنی چاہئے۔

(۴) تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جائے بالخصوص مذہبی تعلیم سے ایک مسلمان بچہ بھی محروم نہ رہنے پائے۔

(۵) تمام منہیات و منکرات مثلاً شراب، جوا، گانا، باجا، سنیما، ٹی وی، وی سی آر، جھوٹ، غیبت، فحش کاری سے مسلم معاشرہ کو پاک کیا جائے۔

(۶) نماز باجماعت کے قیام پر زور دیا جائے اور اس سرگرمی سے اس کا ولولہ پیدا کر دیا جائے کہ ایک مسلمان بھی بے نمازی نظر نہ آئے، اس کے لئے ہر گاؤں اور محلہ میں

دو، دو، تین تین افراد پر مشتمل ایک ذمہ دار مجلس بنائی جائے جو پورے محلہ کے اتفاق و اتحاد کے ساتھ لوگوں کو نمازی بنانے کی جدوجہد کرے۔
(۷) مساجد کی حسب ضرورت اصلاح و مرمت، توسیع و تعمیر کی جائے اور انھیں خوب آباد رکھا جائے۔

(۸) حفاظت خود اختیاری کے لئے ہر گاؤں اور محلہ میں ایک جماعت ہمیشہ موجود رہے۔

(۹) افواہوں اور اشتعال انگیزیوں پر صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور فتنہ و فساد کو صلح و آشتی کے ساتھ دفع کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے بصورت دیگر اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے فساد یوں کی مدافعت ہمت و جرأت کے ساتھ کی جائے۔

(۱۰) اپنے ہم سایہ دیگر برادر یوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے جائیں، ان کے ساتھ رواداری، حسن اخلاق، اچھے سلوک اور ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے۔

اگر ان اصول پر عمل کرتے ہوئے استقلال و پامردی کے ساتھ ہمارے قدم بڑھتے رہے تو انشاء اللہ مصائب کے بادل چھٹ جائیں گے، مشکلات دور ہو جائیں گی، حق و صداقت کا غلبہ اور عدل و انصاف کا بول بالا ہوگا، ظلم پیشہ طاقتیں سرنگوں اور طاغوتی ظلمتیں کافور ہو جائیں گی۔

جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا.

☆ ☆ ☆

اجودھیا کی تاریخی حیثیت

اجودھیا ہندوستان کا ایک قدیم شہر ہے جو فیض آباد شہر سے جنوب مشرق میں تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد ہے۔

اجودھیا کی قدامت

اجودھیا کا سب سے قدیم ذکر و المیک کی رزمیہ نظم رامائن میں ملتا ہے، و المیک کے اس تذکرہ کا خلاصہ یہ ہے۔

”قدیم زمانہ میں ایک بڑی سلطنت کو سل نامی دریائے سر جو (گھاگھرا) کے کنارے واقع تھی اس کا دارالسلطنت اجودھیا تھا، جس کو خود منونے آباد کیا تھا (منو انسان کے ابوالآباء کو کہتے ہیں) اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابل عبور خندق اس کی حفاظت کا سامان تھے، یہاں ایسے ایسے آلات حرب موجود تھے جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل اور بہت سی منزل در منزل عمارتیں اس کی رونق

تھیں، یہ تھا اجودھیا کا وہ شہر جو دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ (۱)

لیکن و المیک کے اس بیان کو عصر حاضر کے غیر مسلم دانشور بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے چنانچہ سروپتی گوپال، رومیلا تھاپر، پین چندر، ایس بھٹا چاریہ، سویرا جیسوال، ہرنس کھیا، کے این پیٹر، آرچمیک لکشمی، ستیش اگر وال، بی ٹی چٹو اپادھیائے، آرین ورماء کے

(۱) رامائن از گرنفٹھ کتاب باب ۱۵ اشلوک ۵، بحوالہ معارف اعظم گڑھ ۳ جلد ۲۹ ص ۱۷۹ مقالہ بعنوان رامائن

پر ایک نظر۔

میناکشی، دلباغ سنگھ، مردولا مکھرجی، مادھون پلات، آدتیہ مکرجی، ایس ایف رتناگر، نیلادری بھٹاچاریہ، کے کے تریویدی، یوکیس شرما، کنال چکرورنی، بھگوان سنگھ جوش، راجن گروکل، ہیمن شوری۔ پورے دو درجن تاریخ کے اسکالروں نے متفقہ طور پر وائیک کے اس بیان پر درج ذیل تنقید کی ہے۔

”وائیک رامائن کے مطابق ایودھیا کے ”راجہ رام“ کلگ شروع ہونے سے ہزاروں سال پہلے تریاگ میں پیدا ہوئے تھے، کلگ ۳۱۰۲ ق م میں شروع ہوتا ہے اس زمانہ میں آثار قدیمہ کی رو سے ایودھیا آباد ہی نہیں تھا، یہاں سب سے پرانی ممکن بستی آٹھویں صدی قبل مسیح میں تھی، وائیک رامائن میں بیان کئے گئے طرز زندگی کے برخلاف اس زمانے میں رہن سہن خاصا معمولی اور سادہ تھا، وائیک میں اعلیٰ شہری زندگی، شاہی محلات اور عمارتوں کا ذکر ہے جن کیلئے آٹھویں صدی قبل مسیح کے آثار قدیمہ سے کسی طرح کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔“ (۱)

ایک اور ہندو محقق و مورخ ڈاکٹر آرایل شکلا پروفیسر دہلی یونیورسٹی یہ تبصرہ کرتے ہیں۔ ”بعض مؤرخین رامائن میں بیان کئے گئے ”رام“ کو حقیقی کردار مانتے ہیں، یہ مؤرخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح مانتے ہیں... اگر ہم اس تحقیق کو مان لیں تو رامائن میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے ان جگہوں میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے ڈھائی ہزار سال پہلے انسانی زندگی کے آثار ملنے چاہئیں اسی مقصد کے تحت تین مقامات کی کھدائی ہوئی (۱) ضلع فیض آباد میں ایودھیا کی (۲) الہ آباد سے ۳۵ کلومیٹر شمال میں واقع شرنگوپور کی (۳) اور الہ آباد میں واقع بھاردواج آشرم کی، ایودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پیشتر ہوئی تھی، اس وقت وہاں آبادی کی علامتیں عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ سو سال پہلے کی نہیں ملتی تھی، اور اب سے

تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانے پر وہاں (ایودھیا) کی کھدائی ہوئی، اس کھدائی سے بھی آبادی کے متعلق وہی نتیجہ نکلا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے زیادہ سے زیادہ سات سو سال قبل کی آبادی کے آثار پائے گئے (اس سے پہلے کے نہیں) اب اگر یہ مان لیا جائے کہ موجودہ ایودھیا ہی رام جی کی نگری تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ رام جی کے زمانہ سے ایودھیا کی آبادی کے زمانے کی تطبیق کیوں نہیں ہوتی کیونکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے کم از کم ڈھائی ہزار سال پہلے کا بتایا جاتا ہے، اس تحقیق کے اعتبار سے موجودہ ایودھیا رام جی کی بھومی نہیں ہو سکتا۔“ (۱)

ڈاکٹر شکلا اسی مقالہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

”وائیک رامائن کے مطابق کوسل کا پایہ تخت ایودھیا سرجوندی (دریائے گھاگھرا) کے داہنی سمت ڈیڑھ یوجن (ساڑھے تیرہ میل) کے فاصلے پر سرجون سے پورب میں تھا جب کہ آج کا ایودھیا سرجون کے بالکل کنارے پچھم طرف واقع ہے، وائیک کے اس بیان سے بھی موجودہ ایودھیا کا تعلق

رام جی کے ایودھیا سے قائم نہیں ہوتا۔“

وائیک کی اس روایت کے بالمقابل بعض مسلم تاریخ نویسوں نے شہر ایودھیا کا تعلق ابوالبشر آدم علیہ السلام کے حقیقی و صلبی بیٹے حضرت شیث علیہ السلام سے جوڑا ہے اور لکھتے ہیں کہ ایودھیا کے اولین بانی حضرت شیث علیہ السلام ہیں، اور بہت سے مؤرخین نے حضرت شیث علیہ السلام کا مدفن ایودھیا ہی کو قرار دیا ہے، چنانچہ آپ کے نام سے منسوب ایک قبر ایودھیا میں آج بھی موجود ہے جس کی تفصیل کتاب کے آخری باب میں ذکر کی گئی ہے، لیکن آثار قدیمہ کی اس جدید تحقیق کی رو سے یہ روایت بھی مخدوش ہو جاتی ہے۔

ایودھیا کے متعلق ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ تریاگ کے بعد ایودھیا گم ہو گیا تھا جس کو کوکرمادتیہ نے دوبارہ دریافت کیا، اس روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

”وکرما دتتیه کو جب اجودھیا کی جستجو ہوئی تو انھیں کسی ذریعہ سے پتہ چلا کہ تیرتھوں کے حکمران پریاگ کو اجودھیا کے جائے وقوع کا علم ہے چنانچہ وکرما ان کی خدمت میں پہنچے اور ان سے اجودھیا کے جائے وقوع کے بارے میں معلومات چاہی، پریاگ نے انھیں اس مقام کی نشاندہی کر دی جہاں پہلے اجودھیا واقع تھا، لیکن پریاگ سے صحیح پتہ معلوم کر لینے کے باوجود وکرما اجودھیا کو پا نہیں سکے تو انھوں نے ایک یوگی سے رجوع کیا، یوگی نے ان سے کہا کہ وہ ایک گائے اور ایک بچھڑی کو کھلے مہار آزا دچھوڑ دیں جس جگہ پہنچ کر بچھڑی کے ٹھن سے دودھ ٹپکنے لگے وہی اجودھیا ہوگا، وکرما نے یوگی کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا اور اجودھیا کے پالینے میں کامیاب ہو گیا۔ (۱)

اس روایت کی تمام تر بنیاد مذہبی خوش اعتقادی پر ہے، جس کا تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں، یہی وجہ ہے کہ عصر جدید کے ہندو مؤرخین جنھوں نے مذہبی خوش عقیدگی کے بجائے تاریخی دلائل و شواہد پر اپنی تحقیق و بحث کی بنیاد رکھی ہے وہ المیکی میں مذکور اجودھیا کو ایک شاعرانہ تخیل سے زیادہ کی حیثیت نہیں دیتے۔

اجودھیا کی شناخت

موجودہ اجودھیا کی شناخت تاریخی لحاظ سے پانچویں صدی عیسوی سے ہوئی ہے، اس سلسلے میں تاریخ نے اپنے صفحات میں جو تفصیلات محفوظ کی ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ گپت خاندان کے راجہ سکند گپت جس کی راجدھانی سکپٹھ یا ساکا (موجودہ ساکیت) تھی اپنے بعض سیاسی مصالحوں کے پیش نظر اس کا نام تبدیل کر کے اسے اجودھیا سے موسوم کر دیا تھا، اجودھیا سے ملحق ساکیت نام کی ایک آبادی آج بھی موجود ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سکپٹھ اجودھیا بن جانے کے باوجود ایک حد تک باقی رہا، اسی کے ساتھ سکوں میں اپنا اصلی نام کندہ کرانے کے بجائے جدید نام وکرماجیت کندہ کرایا، بہت سے مؤرخین کا خیال

ہے کہ ان جذبات طراز یوں سے اس کا مقصد سور یہ نوی راجوں کا وقار حاصل کرنا تھا کیونکہ راجہ رام چندر جی کے بارے میں یہی روایت ہے کہ وہ سور یہ نوی (سورج بنسی) تھے، یہ سکند گپت (الملقب بہ وکرماجیت) خود سانکیہ دھرم کا پیرو تھا اور بعد میں بدھ مت کا معتقد ہو گیا تھا، رام جی سے اسے کوئی مذہبی عقیدت نہیں تھی۔

سکند گپت (وکرماجیت) کے بارے میں کیننگھم نے لکھا ہے کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مت کے پیروؤں کا دشمن تھا، لیکن کیننگھم کی یہ سنی سنائی بات درست نہیں ہے کیونکہ ونسنٹ اے اسمتھ نے اپنی مختصر تاریخ ہند میں تاریخی حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ اولاً سانکیہ دھرم کا پیرو تھا، بعد میں ایک بدھسٹ عالم کی تبلیغ سے بودھ مت کا معتقد ہو گیا، اسمتھ لکھتا ہے۔

”۵۵۰ء کے قریبی زمانہ میں بودھ مذہب کے ایک زبردست عالم ’بسو بندھو‘ کی سوانح عمری ’پرمارتھ‘ نامی عالم نے لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ اجودھیا کا راجہ بکرماجیت (سکند گپت) جو سانکیہ کے فلسفہ کا پیرو تھا اس کو ’بسو بندھو‘ نے بودھ مت کا معتقد بنا لیا تھا، یہ سوانح عمری چینی زبان میں محفوظ رہ گئی ہے‘۔ (۱)

عہد وسطیٰ کی تاریخی تصنیفات میں اجودھیا کا ذکر

مسلم دور حکومت میں لکھی گئی تاریخوں میں اجودھیا کا قدرے مفصل ذکر شہنشاہ اکبر کے درباری فاضل علامہ ابوالفضل متونی ۱۰۱۱ء نے اپنی فاضلانہ تصنیف آئین اکبری میں کیا ہے ابوالفضل نے بھی عوامی روایتوں ہی کے بیان پر اکتفاء کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

اودھ از بزرگ شہر ہائے ہند طول صد و ہتر درجہ و شش دقیقہ عرض بست و ہفت درجہ و پست دود دقیقہ پیش زماں دراز صد و چہل دہشت کردہ و پہناسی و شش آباد بود از کزیریں معابد باستان بر شمارند بسواد شہر خاک بیزی کنند و طلا

الگزنڈر کیننگھم کی رپورٹ

اجودھیا سے متعلق سب سے مفصل وہ رپورٹ ہے جو الگزنڈر کیننگھم نے ۱۸۷۱ء میں مرتب کی تھی، اس میں مندرج بعض باتیں قطعی طور پر غلط اور فساد انگیزی پر مبنی ہیں، پھر بھی اجودھیا کے بارے میں اب تک اس سے زیادہ معلومات افزا تحریر نہیں لکھی گئی ہے، ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان پر انگریزی حکومت کا تسلط مستحکم ہو گیا تو اپنے سامراجی مقاصد کے تحت حکومت نے جہاں بہت سے کام انجام دیئے وہاں آثار قدیمہ کا محکمہ قائم کر کے ان پر کتابیں لکھوانی شروع کیں اور ہر ضلع کے گزیٹ بھی مرتب کرائے، بظاہر یہ کام بہت مفید دکھائی دیا مگر ان میں جو زہر بھرا گیا اس سے عام طور پر لوگ بے خبر رہے، الگزنڈر کیننگھم ہندوستانی آثار قدیمہ کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، اس کی رپورٹیں آج تک تحقیقی و تاریخی کاموں کے لئے ناگزیر سمجھی جاتی ہیں، کیننگھم نے اپنی رپورٹ کی جلد اول میں اجودھیا پر جو باب لکھا ہے اس موقع پر اس کے کچھ ضروری اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

”چینی سیاح ہیون سیانگ کا بیان ہے کہ گوتم بدھ وساکا میں چھ سال رہے یہ سرسوتی کے جنوب میں کچھ فاصلہ پر تھا، میرے خیال میں وساکا اور ساکیت دونوں ایک ہی جگہ ہیں۔“

اس کے بعد وہ اجودھیا کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

”اجودھیا کا موجودہ شہر پرانے شہر کے اتر پورب میں واقع ہے، لمبائی میں دو میل ہے اور پون میل چوڑا ہے، لیکن اس شہر کا آدھا حصہ بھی عمارتوں سے آباد نہیں ہے، پورے شہر میں زوال کے آثار ہیں، کھنڈروں کے اونچے اونچے ٹیلے بھی نہیں ہیں، وہاں ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بھی نہیں ملتی ہیں، منقش ستون بھی نہیں پائے جاتے ہیں جیسا کہ دوسرے شہروں کے ویرانوں میں پائے جاتے ہیں، کوڑے کرکٹ کے تودے تو ضرور ہیں جن سے اینٹیں

برگیرند بنگاہ راجہ رام چندر بود در دور تیا فرماں روائی معنوی با تخت نشینی صوری فراہم داشت یک کروے شہر دریائے گھگھر بدریائے سرو پیوستہ پایاں قلعہ بگذرد، نزد ایں شہر دو قبر بزرگ ساخته اندشش و ہفت گزی عامہ خوابگاہ شیدٹ و ایوب پیغمبر پندارند و بولے افسانہا بر خواند۔ (۱)

اودھ ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہے اس کا طول البلد ایک سو اٹھارہ درجہ چھ دقیقہ اور عرض البلد ۲۷ درجہ بائیس دقیقہ ہے، قدیم زمانہ میں اس کی آبادی ایک سو اڑتالیس کوس لمبائی میں اور چھتیس کوس چوڑائی میں تھی، یہ ہندوستان کی بہت بڑی تیرتھ گاہ ہے، اطراف شہر میں زمین کھودنے سے سونا نکلتا ہے یہ شہر راجہ رام چندر کا مسکن تھا جو تریا دور میں ظاہری و باطنی ریاست کے حامل تھے، شہر سے ایک کوس کے فاصلے پر دریائے گھاگھرا دریائے سر جو سے مل گیا ہے، اور قلعہ (سلطان سکندر لودھی کا تعمیر کردہ قلعہ جو اب دریا برد ہو چکا ہے) کے پاس سے گذرتا ہے، شہر کے نزدیک چھ سات گز لمبی دو قبریں ہیں جنھیں عوام شیدٹ اور ایوب پیغمبر کا مدفن بتاتے ہیں، اور ان کے متعلق عجیب و غریب قصے سناتے ہیں۔

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ اجودھیا کے متعلق یہ درج کیا ہے۔

اجودھیا (بفتح ہمزہ و ضم مجہول جیم و سکون واو و کسر دال و ہائے خفی و یائے تحتانی و الف) بہ اودھ مشہور از مشرق تا چہل کردہ معبد شمرند و از شمال تا جنوب بیست کردہ در نہم شکل پچھ ماہ چیت ہنگامہ پرستش فراہم آید۔ (۲)

اجودھیا جو اودھ سے مشہور ہے پورب جانب سے چالیس کوس اور دکن سے اتر بیس کوس کے علاقہ کو متبرک شمار کرتے ہیں، چیت کی نویں تاریخ کو یہاں مذہبی میلہ ہوتا ہے۔

(۱) آئین اکبری ج ۲ ص ۷۸۔

(۲) آئین اکبری ج ۲ ص ۷۸۔

نکال کر پڑوسی شہر فیض آباد کے مکانات بنائے گئے ہیں، یہ مسلمانوں کا شہر ڈھائی میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے یہ شہر ملبوں سے بنا ہوا ہے جو اجدھیا میں کھود کر نکالے گئے ہیں دونوں شہر چھ مربع میل میں واقع ہیں، یہ گویا رام کی قدیم راجدھانی اجدھیا کا نصف ہے۔“

کیونگھم آگے لکھتا ہے:

رامائن کے بیان کے مطابق اجدھیا کو ”منو“ نے آباد کیا، منو انسان کے ابوالآباء سمجھے جاتے ہیں، رام چندر کے پتا دسر تھ کے زمانہ میں اس میں قلعہ بند شہر تھے، پھانگ بھی تھے اور اس کے چاروں طرف خندقیں تھیں، لیکن ان کا نام و نشان اب دکھای نہیں دیتا، اس کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں، کہا جاتا ہے کہ ”رام“ کا اجدھیا درمی ہا دبالا کی موت کے بعد ایک بڑی لڑائی میں ۱۴۲۶ ق م میں برباد ہو گیا اس وقت سے وکرماجیت کے زمانہ تک یہ ویران رہا، مشہور روایت یہ ہے کہ وکرماجیت اجین کا مشہور شکاری راجہ تھا، موجودہ دور کے ہندو کرما کے سارے اعمال اسی سے منسوب کرتے ہیں، اس سلسلے میں ان کی رائے مہمل ہے، ہیون سیانگ کا بیان ہے کہ اس نام کا ایک طاقتور راجہ سوسوتی کے پڑوس میں کنشک سے بعد کا تھا اور تقریباً ۸۷۰ ق م کا زمانہ تھا، (۱) اور یہی سالی واہانہ کے شروع سا کاسنگ کا زمانہ تھا اس وکرماجیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مذہب کے پیرووں کا دشمن تھا وہ بڑا سرگرم برہمن تھا، میری رائے ہے کہ اسی نے اجدھیا کی ازسرنو تعمیر کی اور رام چندر کی تاریخ میں جو مقدس جگہ ان کے نام سے موسوم تھی ان کو تلاش کرایا روایت یہ بات کہی جاتی ہے کہ جب وہ اجدھیا آیا تو یہ بالکل

(۱) گپت خاندان کے راجاؤں نے اودھ اور شمالی ہند میں ابتداً ۳۱۹ء تا ۳۷۵ء سلطنت کی البتہ شمالی ہند کا زمانہ ۵۷۵ء ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ گپت خاندان راجہ شمالی ہند کے ۲۳۱ سال بعد مندر آرائے سلطنت ہوئے ہیں، کیونگھم کا بیان اس سلسلے میں مجمل ہے تفصیل کیلئے دیکھئے مختصر تاریخ ہند ۱۳۸ء از ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر۔ کچھ آگے چل کر لکھتا ہے۔

کھنڈر تھا اور جنگلوں سے بھرا تھا، اس نے رام چندر کی مشہور جگہ کی کھوج لگائی سرجو کے گھاٹ سے اس نے پیمائش شروع کی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین سو ساٹھ مندر، رام چندر، ان کی بیوی سینتا، لکشمن اور شتر گھن، ہنومان اور دوسرے ناموں پر بنوائے، تین سو ساٹھ کی تعداد کا تعلق سالی واہانہ سے بھی ہے کیونکہ راجہ کے قبیلہ کے دیس راجپوت کہتے ہیں کہ راجہ کی تین سو ساٹھ بیویاں تھیں یعنی ہر بیوی کی خاطر اس نے ایک مندر بنوایا۔

اجدھیا میں بہت سے برہمنوں کے مندر ہیں لیکن وہ جدید زمانہ کے ہیں ان میں اثری خوبیاں نہیں ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ مندر زیادہ تر ان مندروں کی پرانی جگہوں پر بنائے گئے ہیں جن کو مسلمانوں نے مسمار کر دیا تھا۔ (۱) رام کوٹ کا ہنومان گڑھی شہر کے پورب جانب ہے یہ چھوٹا سا قلعہ ہے جو دیواروں سے گھرا ہے یہ ایک جدید مندر کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے جو ایک ٹیلہ کے اوپر ہے، رام کوٹ یقیناً پرانا ہے اس کا تعلق منی پر بت سے ہے، ہنومان کا مندر زیادہ پرانا نہیں ہے، اورنگ زیب کے عہد سے پہلے کا نہیں ہے۔ (۲) شہر کے پوربی کونے پر رام گھاٹ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رام چندر نے اشنان کیا تھا، سرگ دواری یا سورگ دواری، سورگ کا پھاٹک ہے، اتر پورب میں اس کا تعین کیا جاتا ہے،

(۱) کیونگھم اسی رپورٹ میں آگے کی سطروں میں لکھتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وکرماجیت کے بنوائے ہوئے تین سو ساٹھ مندر ختم ہو چکے تھے اور اجدھیا تباہ ہو رہا تھا۔ اور اجدھیا پر مسلمانوں کا اقتدار گیارہویں صدی عیسوی کے آخر یا بارہویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں قائم ہوا ہے اس لئے جو مندر ساتویں صدی یعنی مسلمانوں کے آنے کے چار سو سال پہلے ہی تباہ اور ختم ہو چکے تھے انہیں مسلمانوں نے کس طرح مسمار کر دیا؟ دراصل کیونگھم نے اس یکسر خلاف عقل افسانہ کو لکھ کر ہندوؤں کو مسلمانوں سے برگشتہ کرنا چاہا جو اس کا اور ہراگریز کا مقصد اولین تھا جس کے حصول کیلئے یہ لوگ خلاف عقل بعید از قیاس اور صدنی صد غلط اور جھوٹی باتوں کے کہنے اور لکھنے سے قطعاً نہیں گھبراتے۔

(۲) ہنومان گڑھی کے اس مندر کی ابتدائی تعمیر نواب شجاع الدولہ متوفی ۱۷۷۵ء/ ۱۱۸۸ھ کے عہد میں ہوئی ہے اور ہنومان گڑھی کی تعمیر اس کے بھی بعد میں ہوئی، تفصیل کتاب میں ملاحظہ کریں۔

جہاں رام چندر جلائے گئے، کچھ سال پہلے یہاں برگد کا درخت تھا، جو اشوک بڑا کہلاتا تھا یعنی یہ وہ برگد ہے جس کے پاس غم نہیں پھٹکتا۔ شاید یہ نام سورگ وغیرہ کے تعلق سے رکھا گیا ہو جس کے بارے میں لوگوں کو یقین ہے کہ جو لوگ یہاں آکر مر جاتے ہیں یا جلائے جاتے ہیں وہ دوسرے جنم سے آزاد ہو جاتے ہیں، اسی کے پاس لکشمی گھاٹ ہے، جہاں رام چندر کے بھائی لکشمی نے ایشان کیا تھا، اور یہاں سے ۱۰ میل کے فاصلے پر شہر کے قلب میں جنم استھان کا مندر کھڑا ہے، یہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے، پھر پچھم کی طرف پانچ میل کے فاصلے پر گپتا گھاٹ ہے، یہاں کئی سفید مندر ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہاں سے لکشمی غائب ہو گئے تھے اسی لئے اس کا نام گپتا ہے جس کے معنی چھپا ہوا ڈھکا ہوا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے لکشمی نہیں بلکہ رام غائب ہوئے، سورگ داری میں ان کے جلائے جانے کے قصہ سے اس کی تطبیق نہیں ہوتی۔

کھینکھم یہ بھی لکھتا ہے۔

پرانے شہر میں بودھ کے بیس مندر تھے (۱) وہاں تین ہزار بھکشور تھے اسی کے ساتھ برہمنوں کے پچاس مندر تھے اور برہمنوں کی آبادی تھی اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وکرماجیت کے بنائے ہوئے تین سو ساٹھ مندر ختم ہو چکے تھے اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا۔ (۲)

اجودھیا کی مذہبی حیثیت

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجودھیا رام بھگتی کے مرکزی حیثیت سے بہت بعد میں متعارف ہوا ہے اس سے پہلے وہ بودھ مت، جین مت، شیو مت اور اسلامی (۱) ہیونگ شیانگ کے بیان کے مطابق اس وقت اجودھیا میں بودھوں کے بیس نہیں بلکہ سومندر تھے، تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) بابری مسجد، تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں۔ از سید صباح الدین، ص ۴۰ تا ۴۳۔

تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا ہے، چنانچہ جن بارہ غیر مسلم دانش وروں کا حوالہ گذشتہ سطور میں گذر چکا ہے وہ مشترکہ طور پر لکھتے ہیں۔

”اجودھیا رام بھگتی کے مرکز کی حیثیت سے بہت بعد میں سامنے آتا ہے، پرانے زمانے میں یہ کئی مذاہب کے لئے مقدس مقام رہ چکا ہے، پانچویں صدی سے آٹھویں صدی بلکہ بعد کے کتبوں میں بھی اجودھیا کے باشندوں کے حوالوں میں کہیں بھی اس کا تعلق رام بھگتی سے نہیں ملتا ہے۔“ (۱)

(۱) اہی گرافی کا انڈیا، ص ۱۰، ص ۱۵، ص ۱۳۳-۱۳۴

پیٹھ اور دہلی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سابق صدر، قدیم ہندوستانی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر رام سرن شرما اپنی کتاب کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا میں لکھتے ہیں۔

”جب ہم ہندو عقائد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اجودھیا کو ازمنہ وسطی میں تیرتھ استھان کی حیثیت حاصل ہوئی ہے اس سے قبل اجودھیا کو یہ مقام حاصل نہیں تھا، وشنو سمرتی کے باب پچاسی میں باون تیرتھ استھانوں کی ایک فہرست ہے جس میں شہروں تالابوں، دریاؤں اور پہاڑوں کے نام موجود ہیں لیکن اس فہرست میں اجودھیا کا نام موجود نہیں ہے، اس سمرتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی کے قریب کی ہے اور اس میں درج تیرتھ گاہوں کی فہرست قدیم ترین فہرست ہے۔“ (۲)

چین کا مشہور بدھسٹ عالم اور سیاح ہیون سیانگ راجہ ہرش (مشہور بہ راجہ سلاوت) کے زمانہ ۶۳۰ء میں ہندوستان آیا اور تقریباً پندرہ سولہ سال اور بقول مولوی ذکاء اللہ صاحب تیس سال یہاں رہ کر ملک کا چپہ چپہ چھان مارا جس کی مکمل تفصیل اس نے اپنے سفر نامہ میں درج کی ہے اس کا یہ سفر نامہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کے لئے ایک

(۱) تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز دہلی ۶ نومبر ۱۹۹۰ء

(۲) کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا، ص ۲۰ ہندی ایڈیشن، مطبوعہ مئی ۱۹۹۰ء

دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا انگریزی اردو وغیرہ بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، ہیونگ شیانگ نے اپنی تحریر کے مطابق کشمیر، پنجاب، سندھ، گجرات، مالوہ، مٹھرا، تھائیسر، قنوج، بنارس، پٹنہ، بہار، بنگال، آسام، اڑیسہ، مدراس، آندھرا، ممالک متوسط، مہاراشٹر، کونکن، ٹرانکور وغیرہ اہم مقامات کی سیاحت کی، وہ ان جگہوں کے باشندوں، حاکموں اور عالموں کے حالات پوری بصیرت و قابلیت کے ساتھ لکھتا ہے وہ جب قنوج پہنچتا ہے تو اسے وہاں بودھ مذہب کی سوغادت گا ہیں اور دس ہزار پجاری ملتے ہیں اس وقت وہاں کا راجہ ویش ذات کا راجپوت ہرشاد دھن (راجہ ہرش یعنی راجہ سلادت) تھا جس کے والد کا نام ہیونگ شیانگ پر اکرو دھن بتاتا ہے یہ راجہ بدھ مت کا پیرو تھا اور بدھ کی تعلیمات کے مطابق پانچویں سال مہاموکش (کفارہ گناہ کیلئے دان کا عظیم میلہ) کرتا تھا، ہیونگ شیانگ نے قنوج میں دریائے گنگا کے کنارے دو سو فٹ بلند اشوک کی لاٹ بھی دیکھی، شہر قنوج کے ایک ویدھار (بودھ عبادت گاہ) میں اس نے ڈیرسبن نامی ایک عالم کی مدد سے بودھ مت کی بعض کتابوں کا مطالعہ بھی کیا، قنوج کی سیاحت کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ یہاں سے میں اجودھیا کے لئے روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر اس نے جو کچھ دیکھا اس کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے۔

”یہاں (اجودھیا میں) ایک سوغادت گا ہیں (ویدھار) اور کئی ہزار پجاری ہیں، وہ لکھتا ہے کہ میں نے اجودھیا میں بودھ مذہب کے قدامت پسندو

جدت پسند دونوں فرقوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔“ (۱)

بودھ مت کے مرکز کی حیثیت سے

ہیونگ شیانگ کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی میں اجودھیا بدھوں کا مرکز تھا، بودھ دھرم والوں کا یہ بھی خیال ہے کہ گوتم بدھ نے اجودھیا میں کچھ دن قیام کیا ہے لیکن جب بہار کے ایک عظیم برہمن رہنما کمارل نے شیو کی پوجا کی ترویج و اشاعت اور

(۱) مقدمہ تاریخ ہندج ص ۱۸۰۔ از اکبر شاہ نجیب آبادی۔

بودھ مذہب کی مخالفت میں ایک زبردست تشدد آمیز تحریک شروع کی اور خوش قسمتی سے انھیں دکن کے ایک طاقتور راجہ کی مکمل ہم نوائی بھی حاصل ہو گئی تو بدھسٹ جو پہلے ہی مذہبی تحریک اور باہمی فرقہ بندیوں کی وجہ سے اپنی طاقت کھو چکے تھے اس پر تشدد تحریک کا مقابلہ نہ کر سکے، برہمن رہنما کمارل کے بعد ان کے مشہور حیلے شکر اچار یہ (جن کا زمانہ آٹھویں صدی کا آخر یا نویں صدی کا ابتدائی متعین کیا جاتا ہے) نے اپنی بے پناہ اور انتھک جدوجہد سے اس تحریک کو ارتقاء کی آخری حدوں تک پہنچادیا، جس کے نتیجے میں بودھوں کے بڑے بڑے ویدھار اور قدیم عبادت گا ہیں یا تو مسما کر دی گئیں یا انھیں شیو کے مندر میں تبدیل کر لیا گیا۔

مہاراشٹر کے ایک مؤرخ ڈاکٹر جمنا داس نے انگریزی زبان میں شائع شدہ اپنی کتاب ”تروپتی بالاجی مندر بدھوں کی عبادت گاہ تھی“ کی تحیض پندرہ روزہ اخبار دلت وائس، انگریزی مورخہ یکم تا ۱۵ جنوری ۱۹۹۰ء میں شائع کرائی ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ میری کتاب میں بودھ مت کے زوال کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے جس میں بودھ مت کی عبادت گاہوں کو برہمن دھرم کے لئے استعمال کرنے کا جائزہ لیا گیا ہے، ماہرین و محققین یہ بات پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ پوری کا گنا تھ مندر، بندھا پور کا وشو بھا مندر اور بدری ناتھ مندر ابتدا میں بودھ عبادت گا ہیں تھیں آندھرا پردیش کا مشہور تروپتی مندر بھی ایک ایسا ہی مندر ہے جو ابتدا میں بودھ ویدھار تھا۔

آگے چل کر ڈاکٹر جمنا داس نے کتاب کی جلدوں اور اس کے ابواب کی تفصیل پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جلد اول کے باب دوم میں بودھ عبادت گاہوں پر برہمنوں کے قبضہ کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، جن میں امراتتی، تیر، چنولا، ایہول، انداولی، ایلورا، پوری، اور سرنگیری کے مندروں کا ذکر ہے کہ یہ ابتدا میں بودھ ویدھار تھے۔ باب سوم میں اس دعویٰ کے ثبوت فراہم کئے گئے ہیں کہ جگنا تھ پوری کا مندر بودھ عبادت گاہ تھی، باب چہارم میں ثابت کیا گیا ہے کہ وٹھالہ پنڈھار پور کا مندر بودھ خانقاہ تھی، باب پنجم میں اس بات کے ثبوت ہیں کہ ورک شرم مندر بودھ عبادت گاہ تھی، اور کس طرح بدھ ”ایا کا“

کوننگ پوجا کے لئے استعمال کیا گیا، باب ہفتم میں اس دعویٰ کو مدلل کیا گیا ہے کہ نیلاملائی میں سری سلیم مندر ابتداء میں بودھ عبادت گاہ تھی۔ (۱)

یہ ساری تفصیلات تقریباً ایک خاص خطے سے تعلق رکھتی ہیں، جس سے ہندوستان کے دوسرے مقامات کی بودھ خانقاہوں کے متعلق نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل اور دشوار امر نہیں ہے، غالب گمان یہی ہے کہ شیومت کے احواء اور بودھ مخالف تحریک کے اسی دور میں اجودھیا کی وہ یک صد خانقاہیں جن کی ہیونگ شیانگ سیاح نے زیارت کی تھی شیو مندروں میں تبدیل کر لی گئیں اور اجودھیا سے بودھ پجاریوں کو دیس نکالا دے کر وہاں سے بودھ مت کی مرکزیت ختم کر دی گئی۔

شیومت کا غلبہ اور شیومت کا آغاز

اس وقت سے لے کر تقریباً اٹھارہویں صدی تک دیگر ہندو فرقوں کے مقابلے میں شیومت کا ہی اجودھیا میں غلبہ اور بول بالا رہا۔

مذکورہ بالا غیر مسلم دانشوران لکھتے ہیں:

”تیرہویں صدی عیسوی سے رام بھگتی عوام میں پھیلنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ رام نندی فرقہ کی ترقی اور ہندی میں رام کہانی کی ترتیب کے ساتھ اس کا زور پکڑتا ہے لیکن پندرہویں سوہویں صدی تک بھی رام نندی ایودھیا میں کسی بڑی تعداد میں نہیں بسے تھے شیو بھگتی کی یہاں رام بھگتی سے کہیں زیادہ اہمیت تھی۔“ (۲)

نامور مورخ ڈاکٹر رام سرن شرما تو یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف اجودھیا ہی نہیں بلکہ پورے اتر پردیش میں کسی ایک جگہ بھی سوہویں صدی سے پہلے کوئی رام مندر نہیں پایا گیا ہے کیونکہ اس وقت تک رام بھگتی کا وجود ہی نہیں تھا۔ (۳)

(۱) ہفت روزہ نئی دنیا دہلی، ۱۳ تا ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء

(۲) تاریخ کا بھاساسی استعمال، قومی آواز ۶ نومبر ۱۹۹۰ء

(۳) کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا، ہندی ایڈیشن ص ۲۰ مطبوعہ مئی ۱۹۹۰ء

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ رامانج (جو ۱۱۱۶ء میں مدراس کے ایک گاؤں پر میر میں پیدا ہوئے) نامی ایک ہندو مصلح نے شیومت کی مخالفت پر کمر باندھی اور شیو بھگتی کے مقابلہ میں وشنومت کا پرچار شروع کیا، بعد ازاں رامانج کے پانچویں جانشین رامانند (۱۲۹۹ء میں الہ آباد کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے) نے اپنی غیر معمولی جدوجہد سے پورے شمالی ہند میں اس تحریک کو عام کر دیا، وشنومت کے نامور اور مشہور بھگتوں میں ناواجی، سورداس، تلسی داس (جنہوں نے ہندی زبان میں رامان مرتب کی) جے دیو اور کبیر داس وغیرہ کی مشترکہ کوششوں سے سوہویں صدی آتے آتے رامانندی فرقہ (ویشنومت) کو شیومت پر غلبہ ہو گیا اور شیو پوجا کے بجائے وشنو کے اوتار کی حیثیت سے رام کی پوجا عام ہو گئی اور اسی زمانہ سے رام کے نام پر مندروں کی تعمیر شروع ہوئی۔ (۱)

جین مت کے استھان کی حیثیت سے

بودھ مت، شیومت، وشنومت (رامانندی فرقہ) کے علاوہ اجودھیا جین مت کی بھی اہم ترین زیارت گاہ رہ چکا ہے، جینی اپنے پہلے اور تیسرے تیر تھنکر کی جنم بھومی اجودھیا ہی کو بتاتے ہیں، چوتھی، تیسری صدی ق م کا ایک کچی مٹی کا جینی پتلا اجودھیا میں پایا گیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں اجودھیا جین مت کا استھان رہ چکا ہے مگر آج وہاں اس مذہب کی کوئی علامت اور نشانی نہیں پائی جاتی۔

مسلمانوں کی آمد اور اسلامی آثار کا فروغ

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے درمیانی عہد سے اجودھیا میں مسلمانوں کی باقاعدہ آبادی قائم ہو گئی تھی اور ہندوستان کے دیگر مقامات کی طرح اجودھیا کا علاقہ بھی مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گیا تھا اور حکومت کی جانب سے اس علاقے کے نظم و ضبط کو قائم

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، چودھری غلام رسول ایم اے ص ۱۹ اور مختصر تاریخ ہندو بلو

ڈبلو ہنرارد وائیڈیشن نول کشور ۱۸۹۳ء ص ۱۵۹، اور ۱۶۱۔

رکھنے کے لئے امیر وقاضی مقرر تھے، ہماری تحقیق کے مطابق اجودھیا کے اولین قاضی شیخ معین الدین چشتی اجیری کے خواجہ تاش اور پیر بھائی قاضی قدوة الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی ہیں جن کی وفات اجودھیا ہی میں ۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء میں ہوئی، کتاب کے پہلے باب میں ان کا مختصر سا تذکرہ موجود ہے اس وقت سے لے کر تقریباً اٹھارہویں صدی عیسوی تک اجودھیا پر اسلامی تہذیب و ثقافت چھائی رہی اس مدت میں اجودھیا کے افتخار سے علم و فضل کے ایسے ایسے آفتاب و ماہتاب چمکے جن کی تابانیوں کے سامنے خود دار الخلافہ دہلی کے علمائے نامدار کے چراغ مدہم پڑ گئے جن کے تذکرے اس کتاب میں آپ پڑھیں گے اسی سرزمین میں عام روایت کے مطابق حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کے صلیبی صاحبزادے اور جانشین حضرت شیت علیہ السلام کا مدفن ہے جس کی زیارت کو مسلمان اپنے لے سرمایہ سعادت سمجھتے ہیں اور آج بھی پچاسوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے قبرستان اور خانقاہوں و مزارات کے کھنڈرات زبان حال سے یہ شہادت دے رہے ہیں کہ اس ارض متک پر اسلامی قافلہ کبھی آکر ٹھہرا تھا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ☆ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پاکی

یہ تفصیلات بتا رہی ہیں کہ پچھلی صدیوں میں ایک مقدس مرکز ہونے کی حیثیت سے اجودھیا کے احوال بدلتے رہے ہیں کبھی یہ بودھوں کا مرکز تو جہ رہا ہے تو کبھی جینیوں نے اپنی عقیدت کے نذرانے اس پر نچھاور کئے ہیں کبھی علماء اسلام اور مشائخ تصوف نے اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں کا اسے محور بنایا تو کبھی شیو مت اور وشنو مت کے پجاریوں کا یہ مقصود نظر رہا، غرضیکہ اس کا رشتہ مختلف مذہبوں کی تاریخ سے پیوستہ رہا ہے اور مختلف ادوار میں مختلف مذہبی جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر اسے عزت و عظمت کا مقام عطا کیا ہے اس لئے اس شہر پر کسی ایک مذہب کا دعویٰ تاریخی اعتبار سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

☆ ☆ ☆

بابری مسجد حقائق اور افسانے

کیم فروری ۱۹۸۶ء (۲۱ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ) سنیچر کے دن ”بابری مسجد“ واقع اجودھیا ضلع فیض آباد، ناجائز اور غیر منصفانہ طور پر نہایت ڈرامائی انداز سے ”رام جنم استھان مندر“ میں تبدیل کر دی گئی، اس حادثہ فاجعہ پر مسلمانوں کو جس قدر غم ہو کم ہے۔

”آسماں را حق بود گر خون بہا بر زمین“

یہ ظالمانہ اقدام محض جبر و تشدد اور کثرت و طاقت کے نشہ میں کیا گیا ہے، لیکن دنیا کو فریب دینے کے لئے اس پر عدالت کے فیصلے کی چادر ڈال دی گئی ہے حالانکہ اس غیر قانونی عمل کو عدالت کا فیصلہ کہنا خود عدلیہ کی توہین ہے اور اب اس نام نہاد فیصلہ کو حق بجانب اور درست ثابت کرنے کی غرض سے ”بابر“ اور اس کی جانب منسوب ”بابری مسجد“ کی تاریخ مسخ کرنے کی ملک گیر تحریک چلائی جا رہی ہے، اس رسوائے زمانہ تحریک کا سلسلہ اگرچہ عرصہ دراز سے جاری تھا مگر اسے آج کل تیز تر کر دیا گیا ہے اور وشو ہندو پریشد، آریہ پریتی ندھی سبھا، بھارتیہ جنتا پارٹی، وغیرہ فرقہ پرست تنظیمیں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ ”بابری مسجد کو بابر شاہ نے رام جنم استھان مندر توڑ کر اس کے کھنڈر پر تعمیر کرایا تھا، اس لئے اس مسجد کو ہندو فرقہ کے حوالہ کرنے کا فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہے۔“

اس بے بنیاد اور من گھڑت افسانے کو ایک صحیح اور سچا واقعہ باور کرانے کے لئے علم و تحقیق کی آبرو کو بالائے طاق رکھ کر پوری جسارت کے ساتھ ترک بابری، آئین اکبری اور عالم گیری نامہ جیسی اہم تاریخی کتابوں کا بالکل غلط طور پر حوالہ بھی دیا جا رہا ہے۔

اس لئے جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ منعقدہ ۲۲/۲۱ فروری ۱۹۸۶ء نے ضرورت محسوس کی کہ بابری مسجد کی صحیح تاریخ عوام کے سامنے پیش کی جائے تاکہ سرکاری

وغیر سرکاری ذرائع ابلاغ کی مدد سے پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا یہ بادل چھٹے جس نے ملک کی فضاء کو خطرناک حد تک مسموم بنا دیا ہے، اور ملک کا انصاف پسند طبقہ کذب و افتراء کی تاریکیوں میں بھٹکنے کے بجائے اس انتہائی حساس اور نازک معاملہ میں علم و تحقیق کی روشنی میں غور کر سکے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر محترم حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم نے یہ خدمت احقر کے سپرد کی، مظلوم بابر کی مسجد کے سلسلہ میں یہ تحریر اسی حکم کی تعمیل میں سپرد قلم کی گئی ہے اور قارئین ماہنامہ دارالعلوم کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

کیا بابر اجدودھیا آیا تھا؟

چونکہ یہ مظلوم مسجد بابر کی جانب منسوب ہے، اس لئے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسے بابر نے تعمیر کرایا تھا، پھر اس مفروضہ کی بنیاد پر یہ افسانہ گھڑ لیا گیا کہ بابر نے اجدودھیا آکر ”رام جنم استھان مندر کو گرایا“ اور پھر اس کی جگہ پر یہ مسجد بنوائی چنانچہ حکومت یوپی کے محکمہ اطلاعات کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامہ ”اتر پردیش“ میں جینم یہی بات کہی گئی ہے۔

”۱۹۲۸ء میں بابر یہاں (اجدودھیا) آیا تھا اس نے ایک ہفتہ قیام کیا اور جنم استھان مندر کو گرایا اور اس مندر کے ملبہ پر تعمیر کی تھی“۔ (ماہنامہ اتر پردیش شمارہ اپریل ۱۹۸۴ء ص: ۲۷)

اس لئے پہلے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ ”بابر“ اجدودھیا آیا تھا! کیونکہ (جنم استھان مندر) گرانے کی داستان اسی دعویٰ کی بنیاد پر گھڑی گئی ہے۔

مورخین ہند خواہ مسلم دور حکومت سے تعلق رکھتے ہوں یا اس عہد کے بعد کے ہوں سب اس پر متفق ہیں کہ ”بابر“ کے حالات میں مستند ترین مآخذ خود اس کے اپنے ہاتھ لکھا ہوا وہ سوانحی روزنامہ ہے جو علمی حلقوں میں ”تزک بابر“ کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے، ”بابر“ نے ۸۹۲ھ سے جبکہ اس کی عمر صرف بارہ سال تھی، اسے لکھنا شروع کر دیا تھا اور اپنے مرض وفات میں مبتلا ہونے سے چھ ماہ قبل یعنی ۹۳۶ھ تک اس سلسلہ کو جاری رکھا تزک

میں اس کی آخری تحریر ۳۱ محرم ۹۳۶ھ کی ہے اور اسی سال رجب کے مہینہ میں بیمار ہوا اور اسی بیماری میں ۱۵ جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ کو انتقال کر گیا اس طرح یہ روزنامہ آخری ایک سال کے علاوہ اس کے پورے سوانح حیات کو حاوی ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو تفصیل سے قلم بند کر دیا ہے حتیٰ کہ وہ جن مقامات پر گیا ہے وہاں کے عوام کی حالت، جانوروں کی قسمیں، آب و ہوا، باغات اور عمارتوں کا تذکرہ بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ کرتا ہے، اصل کتاب ترکی زبان میں ہے، اس کا سب سے پہلا ترجمہ ”اکبر“ کے حکم سے خانخانان عبدالرحیم نے فارسی میں کیا تھا، جواب تک غیر مطبوعہ ہے، اس کے بعد انگریز مورخ ”اے، ایس بیورج“ نے دی بابر نامہ ان انگلش کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا جو دو جلدوں میں ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا، یونیورسٹیوں اور دیگر علمی حلقوں میں عام طور پر یہی ترجمہ رائج ہے، مسز بیورج نے ترجمہ کے ساتھ تفصیلی فٹ نوٹ بھی لکھا ہے، جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے ”بابر نامہ“ کے نام سے اردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے، اب یہی انگریزی اور اردو کے دونوں ترجمے تذکرہ نویسوں کے لئے مآخذ و مرجع کا کام دیتے ہیں، کوئی بھی شخص ان ترجموں کو اول سے آخر تک پڑھ جائے اسے ان میں کہیں بھی ”بابر“ کے ”اجدودھیا“ آنے کا ذکر نہیں ملے گا، البتہ ۹۳۵ھ کے واقعات کے ضمن میں اس کی یہ تحریر ضرور ملتی ہے۔

”ہفتہ ۷ رجب کو ہم نے ”اودھ“ سے دو تین کوس (چھ میل) پر ”گھاگھرا“ اور ”سردا“ (ساردا) کے سنگم پر قیام کیا (یہ سنگم بہرائچ میں ہے) اس وقت تک ”شیخ بایزید“ سردا (ساردا) کی دوسری جانب تھا اور سلطان (حسین تیمور) سے خط و کتابت کر رہا تھا اس کی دھوکہ بازیوں سے واقفیت کی بناء پر ہم نے بوقت ظہر ”سلطان کو حکم دیا کہ وہ دریا پار کرنے کے لئے تیار ہو جائے، قباچہ کے پہنچنے پر انھوں نے فوراً دریا پار کیا وہاں پچاس گھوڑے اور تین چار ہاتھی موجود تھے وہ مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور فرار کی راہ اختیار کی چند لوگ جو گھوڑے سے اتر گئے تھے ان کے سر کاٹ کر حاضر کئے گئے“ (بابر نامہ اردو ۳۳۹)

”بابر“ کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ وہ ”شیخ بایزید“ کی بغاوت فرو کرنے کے

لئے رجب ۹۳۵ھ میں اس دیار میں آیا تھا مگر بقول خود اس کا قیام اجودھیا سے ۶ میل دور ساردا کے سنگم پر ہوا، شیخ بایزید کی شکست کے بعد اپنے ایک امیر سید ”میر باقی اصفہانی“ کو اس علاقے کا حاکم مقرر کر کے یہیں سے براہ الہ آباد و کٹرہ بہار چلا گیا جہاں سلطان محمود بن سکندر لودھی نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ تقریباً ایک ماہ بہار کے علاقے میں گزار کر واپس لوٹا اور واپسی کے موقع پر بھی وہ اجودھیا سے کافی فاصلے سے گذرا، جیسا کہ تزک کی درج ذیل تحریر سے ظاہر ہے۔

”بروز دوشنبہ ۲۲ رمضان کو ہم چو پادہ میں پہنچے چترکھ کے راستے دریائے سر جو کے کنارے ہوتے ہوئے بہار اور سردا (ساردا) کے قصبوں سے فارغ ہو کر اور دس کوس (۲۰ میل) چلنے کے بعد دریائے سر جو کے کنارے کیلبرہ نامی گاؤں میں جو فتح پور کے علاقے میں ہے قیام کیا، ہم نے کئی دن اس مقام پر گزارے، یہاں آب رواں ہے، اچھی عمارتیں ہیں اشجار خاص طور پر آم کے درخت اور رنگ برنگ کی چڑیاں ہیں، پھر ہم نے غازی پور کی طرف کوچ کا حکم دیا“ (بابر نامہ اردو)

ان دونوں تحریروں کے علاوہ ”تزک بابر“ میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملتی جس سے ”بابر“ کے اس دیار میں آنے کا سراغ لگایا جاسکے۔

تزک بابر کے علاوہ طبقات اکبری تالیف خواجہ نظام الدین احمد، اکبر نامہ ابوالفضل، منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی خلاصۃ التاریخ منشی سبحان رائے، تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ، منتخب اللباب محمد ہاشم خانی خان، غرضیکہ کسی بھی معاصر یا غیر معاصر مستند و معتبر تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر نہیں ملتا، اس لئے جس بنیاد پر مندر توڑ کر مسجد بنانے کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، جب اس بنیاد ہی کا وجود نہیں تو عمارت کا جو حال ہوگا اہل نظر سے مخفی نہیں۔

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

”بابر“ کے حالات میں اس وقت جتنی بھی کتابیں دستیاب ہیں ان میں ”بابر“ کے

نہ صرف اجودھیا بلکہ کسی بھی مقام پر مندر توڑنے کا ذکر نہیں ہے، حتیٰ کہ جد و ناتھ سرکار، ایسٹ اور ڈاؤن نے بھی ”بابر“ کی مندر شکنی کا کوئی واقعہ نقل نہیں کیا ہے، جبکہ یہ مؤرخین مسلم حکمرانوں کی مندر شکنی کے واقعات میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

بابر کی ایک وصیت

ان تاریخی شواہد کے علاوہ خود ”بابر“ جس ذہن و مزاج کا حکمراں ہے اس کے پیش نظر یہ امر بعید از قیاس ہے کہ وہ کسی بھی مذہبی عبادت گاہ پر غلط نگاہ ڈالے گا، اس کے اس مزاج کو سمجھنے کیلئے وہ وصیت نامہ کافی ہے جو اس نے اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کے لئے قلم بند کیا تھا وہ اس میں ہمایوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹا دو، اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اسی سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دہی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج و ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلاف سے چشم پوشی کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر رابعہ کے مطابق ملاؤ جس طرح کہ انسانی جسم ملاتا ہے، تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے، یکم جمادی الاولیٰ ۹۳۵ھ (۱ ائیڈی ڈی ڈاؤنڈ ۱۳۹ از ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند)

ان دلائل و شواہد کی روشنی میں ایک دیانت دار مؤرخ اور حقیقت پسند مبصر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہے کہ ”بابر“ مندر شکنی کے الزام سے قطعاً بری ہے، چنانچہ پروفیسر ”شری رام شرما“ اپنی مشہور کتاب ”مغل امپائر ان انڈیا“ میں پوری صفائی سے لکھتے ہیں: ”ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ ”بابر“ نے کسی مندر کو منہدم کیا یا کسی ہندو کی ایذا رسانی محض اس لئے کی کہ وہ ہندو ہے۔“ (ص ۱۵۵ ایڈیشن ۱۹۳۵ ÷)

(بحوالہ معارف فروری ۸۶ ÷)

تلاش حقیقت

جب یقینی طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ ”بابر“ اجدودھیا آیا ہی نہیں تو اس کے بابر مسجد تعمیر کرانے کا سوال نہیں پیدا ہوتا، لہذا اب ہمیں تاریخ ہی کی روشنی میں یہ پتہ لگانا چاہئے کہ اس مسجد کا بانی حقیقتاً کون اور اس نے اسے کب تعمیر کرایا ہے، اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ بابر مسجد اجدودھیا ہندوستان میں موجود لاکھوں مسجدوں کے مقابلے میں کسی خصوصی امتیاز کی حامل نہیں ہے، اسی لئے مؤرخین جس طرح عام مسجدوں کی تاریخ بیان کرنے کا عام طور پر اہتمام نہیں کرتے یعنی ”بابر مسجد اجدودھیا“ کے بارے میں بھی ان کا یہی رویہ ہے، بالفرض اگر یہ مسجد کسی خصوصی اہمیت کی حامل ہوتی یا اس کی تعمیر کے ساتھ کوئی جذباتی واقعہ وابستہ ہوتا یا کم از کم اسے کسی بادشاہ کی تعمیر کا شرف حاصل ہوتا تو مؤرخین اس طرح سے اس کے بارے میں خاموش نہ رہتے بلکہ اس کی تفصیلات ضرور لکھتے لیکن مؤرخین کے اس مکمل سکوت کے باوجود ”بابر مسجد“ کی تاریخ تاریکی میں نہیں ہے بلکہ اس میں نصب کتبوں کی بناء پر آئینہ کی طرح روشن ہے۔

آج کی دنیا میں کتبات کی جواہریت ہے، وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں، آج حکومتیں ان کی فراہمی اور حفاظت پر کڑوں روپے خرچ کر رہی ہیں، اور ان سے صرف عمارتوں ہی کی تاریخ معلوم نہیں کی جاتی بلکہ قوموں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی تاریخ کی تدوین میں انہیں مستند ترین مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بابر مسجد اجدودھیا کے کتبے

اسے اتفاق ہی کہتے کہ ”بابر مسجد“ میں ایک کے بجائے تین کتبے نصب کئے گئے تھے جن میں دو تاریخی حیثیت سے خاص اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان میں مسجد کی تعمیر کا سن اور بانی کے نام کی تصریح موجود ہے۔

(۱) یہ کتبہ پتھر کی دو میٹر لمبی اور ۵۵ سینٹی میٹر چوڑی تختی پر ہے جو مسجد کے مسقف حصہ کے درمیانی مرکزی در کے اوپر نصب ہے، جس پر بسم اللہ کے علاوہ تین سطروں میں آٹھ اشعار لکھے ہوئے ہیں، جن میں پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں بانی کا نام نسبت کی صراحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے اور آٹھویں شعر کا دوسرا مصرعہ تعمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

| بسم اللہ الرحمن الرحیم | | |
|---------------------------|--|----------------------------|
| بنام آنکہ او داناست اکبر | کہ خالق جملہ عالم لامکانے | درود مصطفیٰ بعد از ستائش |
| کہ سرور انبیاء زبده جہانے | فسانہ در جہاں بابر قلندر | کہ شد در دور گیتی کامرانے |
| چناں کہ مطع کشور گرفتہ | ز میں راچوں مبارز آسمانے | دراں حضرت یکے سید معظم |
| کہ نامش میر باقی اصفہانے | مشیر سلطنت تدبیر ملکش | کہ زیں مسجد حصار مہستانے |
| خدایا در جہاں تابندہ ماند | کہ خیر و بخت و تخت و زندہ گانے | دریں عہد و دریں تاریخ میوں |
| کہ نہ صدق و ہی بودہ نشانے | (ان دو سطروں میں عربی میں کچھ لکھا ہوا ہے جو پڑھا نہیں جا سکا) | (حبیب الرحمن) |

اس کتبے کے اشعار میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پھر نبی کریم پر درود ہے اور آپ کو تمام انبیاء کا سردار اور خلاصہ کائنات کہا گیا ہے، پھر دو شعروں میں ”بابر“ کی تعریف اور اس کی فتح و کامرانی کو نہایت لطیف اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے، یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے، کہ اس موقع پر بابر کو بادشاہ کے بجائے قلندر کہا گیا ہے، یہ لفظ صوفیوں کی اصطلاح میں مرنجاں مرنج اور ہر قسم کی مذہبی تعصب سے بے نیاز شخصیتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

پھر بیان کیا گیا ہے کہ ”بابر“ کے درباریوں میں ایک صاحب عظمت سید ہیں جن کا اسم گرامی ”میر باقی اصفہانی“ ہے پھر ”میر باقی“ کے انتظام ملکی کی تعریف ہے اس کے بعد کے شعر میں بتایا گیا ہے کہ ان ہی ”میر باقی“ کی بدولت یہ مسجد روشن ضمیروں کے لئے حصار بنائی گئی ہے اس کے بعد کے چار شعروں میں ان کے لئے دعاء ہے کہ خدا یا دنیا میں ان کے اس خیر یعنی مسجد اور ان کے مقام و مرتبے اور زندگی کو تابندہ رکھتا کہ ۹۳۵ھ کی یہ یادگار باقی اور پائیدار رہے۔

”مسز بیورج“ نے اپنے ترجمہ ”دی بابر نامہ ان انگلش“ کی دوسری جلد کے ضمیمہ میں ”بابری مسجد اچھوڑ دیا“ کے کتبات کے عنوان کے تحت منبر کے بائیں سمت والے کتبہ کے علاوہ، مندرجہ بالا کتبہ کو بھی درج کیا ہے، لیکن انھوں نے اس کے آٹھ شعروں میں سے شروع کے صرف تین اشعار نقل کئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ اشعار کو وہ پڑھ نہ سکیں اس لئے انہیں چھوڑ دیا۔

۳،۲ یہ دونوں کتبہ مسجد کے اندرونی حصہ میں ”منبر“ کے داہنی اور بائیں جانب تھے۔
(داہنی سمت کا کتبہ) (۲)

بمنشائے بابر خدیوں جہاں بسائیکہ با کاخ گردوں عنان
بنا کرد ایں خانہ پائیدار امیر سعادت نشاں میر خان
بماند ہمیشہ چینیں بانیش چناں شہریار زمیں وزماں
(بائیں جانب کا کتبہ) (۳)

بفرمودہ شاہ بابر کہ عدلش بنائیسٹ با کاخ کردوں ملاقی
بنا کردہ ایں مہیٹ قدسیاں را امیر سعادت نشاں میر باقی
بودنبر باقی وسال بنائش عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی
۹۳۵ھ

معمولی سے فرق کے علاوہ ان دونوں کتبوں کے مفہوم میں یکسانیت ہے البتہ دوسرے کتبہ کا آخری شعر دعائیہ ہے اور تیسرے کے آخری جملہ سے تاریخ تعمیر نکلتی ہے اس

آخری کتبہ کو مسز بیورج نے بھی نقل کیا ہے لیکن ان سے اس کے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہے، جس سے تعمیر کی معنویت متاثر ہوتی ہے وہ آخری شعر کو اس طرح لکھتی ہیں۔
بود خیر باقی چو سال بنائش عیاں شد کہ گفتم بود خیر باقی
جبکہ صحیح اس طرح ہے۔

بود خیر باقی وسال بنائش عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۲۷ مارچ ۱۹۳۴ء مطابق ۱۱ ارذی الحجہ ۱۳۵۳ھ کو اچھوڑ دیا میں ایک زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، اس موقع پر فساد یوں نے ”بابری مسجد“ میں گھس کر توڑ پھوڑ کیا تھا اسی وقت ان دونوں کتبوں کو بھی اکھاڑ لے گئے، لیکن بعد میں منبر کے بائیں جانب والے کتبہ کی ایک نقل تیار کر کے تہور خان ٹھیکیدار نے نصب کر دیا البتہ دائیں جانب کی نقل وہ بھی نہ کرا سکے۔

سید بدر الحسن فیض آبادی کے پاس اس ضائع شدہ کتبہ کی ایک نقل موجود تھی اسی نقل کے حوالہ سے یہ کتبہ یہاں درج کیا گیا ہے۔

ان تینوں کتبوں کی فلم اور اس کا فوٹو (ضمیمہ فارسی و عربی ہندوستانی کتبات ۱۹۶۵ء ÷ ناگپور میں موجود ہے) جسے حاصل کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔

مسجد کی مرکزی دروازا اصلی کتبہ اور منبر کی بائیں جانب والا نقل شدہ کتبہ یہ دونوں کتبہ ۱۹۴۹ء سے پہلے تک مسجد میں موجود تھے، اب موجود ہیں یا وہ بھی بیراگیوں کے دست کرم کے شکار ہو گئے خدا ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ تقریباً ۳۷ سال کی طویل مدت سے مسلمانوں کا اپنی اس قدیم عبادت گاہ کے پاس سے گذرنا بھی ممنوع ہے اس کے اندر جانا تو بہت دور کی بات ہے اس لئے اس وقت ان کتبوں کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔

لیکن ان کتبوں کے اب مسجد میں ہونے یا نہ ہونے سے ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ ان کی مستند نقلیں حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ اور تاریخ کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔

یہ کتبہ آج بھی شہادت دے رہے ہیں کہ ”بابری مسجد“ اچھوڑ دیا کا بانی ”شاہ بابر“

نہیں بلکہ اس کا ایک امیر ”میر باقی اصفہانی“ تھا جسے بابر نے ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء میں علاقہ اودھ کا حاکم مقرر کیا تھا ”میر باقی“ نے اسی تقرری کی یادگار کے طور پر اس مسجد کی تعمیر کرائی تھی، جیسا کہ پہلے کتبہ کے آخری مصرعہ ”کہ نہ صدق وہی بودہ نشانی“ سے واضح ہے۔

اور تیسرے کتبہ کے دوسرے شعر ”بنا کردایں مہبط قدسیاں“ سے اشارہ ملتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر عدل و انصاف کے مطابق ہوئی ہے کیونکہ اسلامی نقطہ نظر سے فرشتوں کی درود گاہ وہ مقام کبھی بھی نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد ظلم و جور پر رکھی گئی ہو، اور اسلامی قوانین کی رو سے کسی مذہب کی عبادت گاہ کو منہدم کرنا ظلم و زیادتی ہے، اور اس غیر منصفانہ حرکت سے آنحضرت نے سختی سے منع فرمایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسز بیورج نے ان کے ترجمہ اور تشریح میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ ”مسجد“ جنم استھان کو توڑ کر بنائی گئی ہے، اسی طرح ولیم ارسلن، آزر بروک ولیم جنھوں نے بابر کے عہد کی تاریخ لکھی ہے بابر کے کسی مندر توڑنے کا ذکر نہیں کرتے۔

ان مستند تاریخی شواہد کے علاوہ مسجد کا جائے وقوع بھی یہی کہتا ہے کہ یہاں مسجد سے پہلے مندر نہیں ہو سکتا، کیونکہ مسجد کے احاطے کی چہار دیواری سے متصل پورب اور دکھن سمت ”گنج شہیداں“ ہے یعنی ان شہیدوں کے مزارات ہیں جو سپہ سالار مسعود غازی کے رفقاء میں سے تھے اور دو قدم فاصلے پر ”قاضی قدوہ“ کی قبر ہے جو خاندان قدوائی کے مورث اعلیٰ تھے۔

مسعود غازی پانچویں صدی ہجری میں اس دیار میں آئے تھے،... اس لئے اس مقام پر ان کے رفقاء کے مزارات کا ہونا یہ بتاتا ہے کہ اس حصہ زمین پر اس وقت کوئی مندر وغیرہ نہیں تھا کیونکہ کسی مندر کے متصل شہیدوں کے مزارات نہیں بنائے جاتے ان مزارات کے بعد محلہ قضاہ اور ایک اور مسلم محلہ کی آبادی شروع ہو جاتی تھی جس میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا آبائی مکان تھا، اور مسجد کے پورب سمت ذرا سے فاصلے پر محلہ بیگم پورہ تھا، جو نوابان اودھ کے دور تک خالص مسلم آبادی پر مشتمل تھا، اور مسجد کے اتر جانب احاطہ مسجد سے بالکل متصل تقریباً پندرہ میٹر چوڑی قدیم سڑک ہے اسی سڑک کے متصل اتر

پورب سمت میں جنم استھان کا احاطہ ہے۔ الحاصل اس قدیم سڑک سے دکھن جانب خالص مسلمانوں کی آبادی اور ان کے قدیم مزارات ہیں اس جانب نوابان اودھ کے دور سے پہلے نہ ہندو آبادی تھی اور نہ کوئی مندر وغیرہ ان کے سارے مندر سڑک کے اتر سمت میں تھے جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی جگہ پہلے ہی سے مسلمانوں کی ملکیت میں تھی اس لئے یہاں کسی مندر کے ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

چنانچہ آج سے تقریباً آٹھ، نو سال قبل حکومت نے محکمہ آثار قدیمہ کے ذریعہ ”بابری مسجد“ کی مغربی دیوار سے بالکل متصل بڑے پیمانے پر کھدائی کرائی تھی اس کھدائی سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ یہاں مسجد سے پہلے کسی قسم کی کوئی عمارت نہیں تھی کیونکہ کھدائی کے بعد کسی عمارت کے کوئی آثار اس جگہ نہیں پائے گئے اس کھدائی کی رپورٹ حکومت کے پاس محفوظ ہے ان دلائل و قرائن کے بعد ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں ایک ہندو محقق کی تحقیق بھی پیش کر دیں تاکہ حقیقت حال اچھی طرح روشن ہو کر سامنے آجائے۔

جنم استھان کے بارے میں ایک ہندو محقق کی تحقیق

ڈاکٹر آر، ایل شکلا استاذ دہلی یونیورسٹی دہلی نے ۱۹۸۴ء میں ایک مقالہ بعنوان (jkehdhuxjh iz;/;; ;feFkd) (رام کی نگری اجودھیا جھوٹ یا سچ) لکھا تھا، یہ اقتباس اسی مقالہ سے ماخوذ ہے یہ مقالہ اگرچہ اس قابل ہے کہ اسے پورا نقل کر دیا جائے لیکن طوالت کے خوف سے اس کے ضروری اقتباسات اس موقع پر نقل کئے جا رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ

”بعض مؤرخین ”مہا بھارت“ میں بیان کئے گئے ”رام“ کو حقیقی کردار مانتے ہیں یہ مؤرخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار قبل مسیح مانتے ہیں، اور مہا بھارت کا زمانہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک ہزار پہلے کا بتایا جاتا ہے، اگر ہم اس تحقیق کو صحیح مان لیں تو رامائن میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے، ان جگہوں میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے ڈھائی ہزار سال پہلے انسانی زندگی کے آثار ملنے چاہئے اسی مقصد کے پیش نظر تین مقامات کی

کھدائی ہوئی ہے: (۱) فیض آباد ضلع میں ”اجودھیا کی (۲) الہ آباد سے ۳۵ کلومیٹر شمال کی سمت واقع موضع ”شنگوپور“ کی (۳) اور الہ آباد میں واقع ”بھاردواج“، آشرم کی، اجودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پہلے بھی ہوئی تھی اس وقت بھی وہاں آبادی کے نشان عیسیٰ (علیہ السلام) سے ۶۰۰ سال پہلے کے نہیں ملے تھے اور اب سے تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانے پر وہاں (اجودھیا) کھدائی ہوئی، (اس کھدائی سے) بھی آبادی کے متعلق وہی نتیجہ نکلا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے (زیادہ سے زیادہ) ۷۰۰ سال قبل کی آبادی کے نشان پائے گئے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی (موجودہ) اجودھیا ”رام جی“ کی نگری تھی جو ان کی جنم بھومی مانی جاتی ہے تو (سوال پیدا ہوتا ہے) کہ رام جی کے زمانہ سے اجودھیا کے زمانے کا تعلق اور جوڑ کیوں نہیں قائم ہوتا، اجودھیا کی آبادی عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے سے ۶۰۰ یا ۷۰۰ سال پہلے کی ہے جبکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰ سے ۲۵۰۰ سال قبل یا بعض مورخین کی تحقیق کے اعتبار سے اس سے بھی پہلے کا ہے تو پھر اجودھیا رام کی بھومی کیسے ہو سکتی ہے اور اس کا کیا ثبوت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مشرقی یوپی، شمالی بہار اور مگدھ کے علاقوں میں پہلے جنگل ہی جنگل تھے ان علاقوں میں تقریباً ۵۰ سے ۱۶۰ نچ تک بارش ہوتی ہے جس کی بناء پر میدانوں میں جنگل کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے، جب تک ان جنگلوں کو کاٹ کر صاف نہیں کیا گیا وہاں بستیوں کا آباد ہونا ممکن نہ تھا ان جنگلوں کی صفائی کا کام انہیں جلا کر یا لوہے کے کلہاڑوں سے کاٹ کر کیا گیا ہے اور جدید تحقیقات سے یہ طے ہو چکا ہے کہ لوہے کا استعمال ان علاقوں میں ۷۰۰ سال قبل از مسیح نہیں تھا۔

قدیم پالی ادب میں بڑی بڑی حکومتوں کا ذکر ہے جنہیں ”مہاجن پد“ کہا جاتا تھا، نیز پالی ادب میں ”اجودھیا“ کا بھی ذکر ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”بدھ“ کے عہد میں اس علاقہ میں حکومت کا قیام ہو گیا تھا، لیکن اس سے پہلے کسی حکومت کے قیام کا ثبوت نہ تو قدیم ادب سے ملتا ہے اور نہ آثار قدیمہ ہی سے، اس لئے جو لوگ اجودھیا کو رام کی جنم بھومی کہتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔

بالمیکی رامائن (کے مطابق) ”کوشل“ کا پایہ تخت ”اجودھیا“ سر جوندی کے داہنی سمت سر جو سے ڈیڑھ یوجن (۱۳ ۱/۲ میل) کے فاصلے پر تھا اور سر جو اس سے پچھم سمت تھی، اور آج کا اجودھیا سر جو کے بالکل کنارے پر ہے پھر آج سر جو اجودھیا سے پورب سمت ہے نہ کہ پچھم میں (بالمیکی کے اس بیان سے بھی موجودہ اجودھیا رام کی جنم بھومی نہیں ہو سکتا ہے) (ایٹک سنوواد، ماہ نومبر ۱۹۸۴ء ÷ ص: ۱۲، ۱۳)

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہندو مذہب کی اہم ترین کتاب ”اتھروید“ سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ ”ایودھیا“ اسم علم (نام) کے طور پر نہیں بلکہ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے ”انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ“ کے فیلو پروفیسر ”بی، بی، لال“ جو آریکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائریکٹر جنرل بھی رہ چکے ہیں، انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ

”کسی ایک جگہ بھی لفظ اجودھیا اسم معرفہ (نام) کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے اس لئے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ کسی شہر کا نام ہے“ (ہفت روزہ نئی دہلی شماره ۲۰۱۸ مارچ ۱۹۸۶ء ÷ ص: ۱۳، ۱۵)

کیا رام کرشن کوشل کے راجہ تھے؟

ان تحقیقات کے علاوہ بعض محققین کی رائے یہ بھی ہے کہ رام کرشن کا ”جن کی راجدھانی (اجودھیا) بتائی جاتی ہے“ وہ کوشل کے راجہ تھے ہی نہیں بلکہ وہ بنارس کے حکمراں تھے۔

چنانچہ اے، ایل ہاشم لکھتے ہیں:

”یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ ”رام“ کوشل کا بادشاہ تھا کیونکہ اس افسانے ”رامائن“ کا قدیم ترین نسخہ جو ہمارے پاس ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنارس کا بادشاہ تھا جو تھوڑے زمانے کے لئے ایک اہم حکومت تھی“ (ہندوستان کا شاندار ماضی ص: ۶۷، ۶۸، ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ء ÷)

الحاصل قدیم ہندو ادب اور جدید تحقیقات دونوں کے اعتبار سے موجودہ ”اجودھیا“ کا تعلق رامائن کے کردار (ہیرو) ”رام“ سے کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ اجودھیا کی آبادی رام کے اٹھارہ سو (۱۸۰۰) سال بعد وجود میں آئی ہے، اس لئے علم و تحقیق کی رو سے اجودھیا کو رام جنم بھومی کہنا انتہائی مضحکہ خیز ہے جس کی حیثیت دیومالائی افسانے سے زیادہ نہیں۔

غالباً اسی بناء پر غیر ملکی سیاح جب ہندوستان کے قدیم آثار کی سیر کے لئے آتے ہیں تو انہیں بنارس، سارناتھ، مگدھ، نالندہ، کھجور اہوا اجنٹا وغیرہ کی سرکاری و غیر سرکاری طور پر سیر کرائی جاتی ہے اور ”اجودھیا“ کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اس لئے جب خود ”اجودھیا“ کا رام جنم بھومی ہونا تاریخی و تحقیقی شواہد سے غلط ہے تو اس میں واقع ایک مسجد کو تقریباً ساڑھے چار سو سال کے بعد متعین کر کے یہ کہنا کہ اسی جگہ رام جی پیدا ہوئے تھے، ایک من گھڑت افسانہ نہیں تو پھر کیا ہے۔

اس افسانہ کی ابتدا اور اس کے مقاصد

رام جی کے زمانہ سے تقریباً سو چار ہزار سال کے بعد بابری مسجد اجودھیا کی تعمیر ہوئی اگر واقعاً اس جگہ کوئی مندر ہوتا اور اس اہمیت کا جسے آج ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کے اوپر ملک کی سالمیت اور یگانگت کو قربان کرنے کا قصد کر لیا گیا ہے تو اس کا ذکر مذہبی اور تاریخی کتابوں میں ضرور ہوتا یا کم از کم محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے کھدائی کے موقع پر اس کے کچھ آثار و نشانات ہی ملتے لیکن اوپر کی سطور میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ”اجودھیا“ کی آبادی کا وجود ”رام جی“ کے زمانے سے تقریباً اٹھارہ سو سال بعد ہوا ہے تو پھر ”رام جی“ کی وہاں پیدائش کیسے ہو سکتی ہے کہ ان کی پیدائش کی یادگار میں اس جگہ مندر بنایا جاتا۔

دراصل ”رام جنم استھان“ کا یہ قضیہ انگریزوں کی منحوس ڈپلومیسی ”لٹراؤ اور حکومت کرو“ کی پیداوار ہے واجد علی شاہ کے ابتدائی دور میں انگریزوں نے اس افسانہ کے پلاٹ کو تیار کیا، وہ اس طرح کہ ایک بدھشٹ نجومی کو پہلے سے تیار کیا چنانچہ اس نے

انگریزوں کی منشاء کے مطابق زاچھینچ کر ”جنم استھان“ اور سیتا رسوئی گھر کو ”بابری مسجد“ کے احاطہ کے اندر ہونا متعین کیا، پھر ہندو طبقہ کے بعض مفاد پرست افراد کو آمادہ کیا گیا کہ وہ ان دونوں مقامات کے حاصل کرنے کی کوشش کریں چونکہ ”نواب واجد علی شاہ کا وزیر“ نقی علی خان رشوت خور ہونے کے ساتھ انگریزوں کا وفادار تھا اس لئے اس نے بھی اس افسانے کے خاکے میں رنگ بھرنے کی خدمت انجام دی اور ”واجد علی شاہ“ کو اس پر راضی کر لیا کہ حد و مسجد سے باہر لیکن اس کے احاطہ کے اندر ”رام استھان“ اور سیتا رسوئی گھر کے لئے جگہ دیدی جائے چنانچہ مسجد کے مسقف حصہ کے بالمقابل داہنی سمت احاطہ کی دیوار سے متصل سیتا رسوئی کیلئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں اور پورب کی طرف ”جنم استھان“ کے طور پر ۲۱ فٹ لمبی اور ۷ فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی جس پر ایک بالشت بلند چبوترہ بنانے کی اجازت تھی... اسی موقع پر مسجد کے صحن کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دیا گیا، جواب تک بالکل کھلا ہوا تھا، یہ ہے سیتا رسوئی اور جنم استھان کی اصل حقیقت سچ کہا ہے حافظ شیرازی نے:

چوں نہ یا بند حقیقت در افسانہ زدند

جنم استھان کو جس دیومالائی حیثیت سے ثابت کیا گیا تھا وہ عوام کو تو کسی حد تک متاثر کر سکتا تھا، لیکن پڑھا لکھا طبقہ اس پر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس دیومالائی کارروائی کے ایک عرصہ بعد جب فیض آباد کا نیا گزیٹریٹر مرتب کیا گیا تو پہلی بار اس میں یہ افسانہ بھی گھڑ کر لکھا گیا کہ ۱۵۲۸ء میں ”بابر“ اجودھیا آیا اور ایک ہفتہ یہاں قیام کیا اس قدیم مندر (رام جنم استھان) کو ڈھا دیا اور اسی مقام پر ایک مسجد تعمیر کرائی جو اب تک ”بابری مسجد“ کے نام سے جانی جاتی ہے۔

حیرت ہے کہ حکومت اتر پردیش نے ۱۹۶۰ء میں ضلع فیض آباد کا جو گزیٹریٹر شائع کیا اسی میں اس انگریزی افسانہ کو بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے درج کر دیا، حکومت یوپی کا یہ رویہ بتا رہا ہے کہ ہماری حکومت ذہنی طور پر آج بھی انگریزوں کی غلام ہے جو آزاد قوم کے لئے انتہائی ننگ و عار کی بات ہے۔

اختلاف کا آغاز

بہر حال انگریزوں کی یہ چال کامیاب ہوگئی اور اجمودھیا میں آباد ہندو مسلم دونوں فرقوں میں اس مسئلہ کو لے کر کشیدگی شروع ہوگئی چنانچہ سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں رکھویر داس نامی مہنت نے سب نج کی عدالت میں ایک دعویٰ دائر کیا کہ ”جنم بھومی استھان پر کوئی عمارت نہیں ہے اور پوجاریوں کو جاڑا گرمی اور برسات میں تکلیف ہوتی ہے لہذا اس پر عمارت بنانے کی اجازت دی جائے اس نے اپنے دعویٰ میں یہ بھی ظاہر کیا کہ مسلمانوں کے اعتراض پر ڈسٹرکٹ جج نے رام جنم بھومی چبوترہ پر عمارت تعمیر کرنے سے روک دیا ہے۔

سب نج ہری کشن پنڈت نے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا وہ اپنے فیصلے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے، اس احاطہ میں جس پھاٹک سے داخلہ ہوتا ہے اس پر لفظ ”اللہ“ کندہ ہے اس کے فوراً بعد بائیں جانب چبوترہ ہے جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے اس چبوترہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ رام جنم استھان ہے چبوترہ کے چاروں طرف مسجد کی دیوار ہے چبوترہ اور مسجد کے درمیان علیحدہ علیحدہ حد بندی ہے، اگر اس چبوترہ پر مندر تعمیر ہو اور اس میں گھنٹیاں اور سنگھ بجائے گئے اور مسلمانوں کا گذر ہوتا رہتا تو مستقبل میں بہت زیادہ خون خرابہ کا اندیشہ ہے اور ہزاروں جانیں تلف ہو سکتی ہیں اس لئے مندر کی تعمیر کی اجازت دینے کا مطلب بلوا، قتل اور فساد کو دعوت دینا ہے اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ مندر تعمیر کرنے کی اجازت نہ دی جائے اس مقدمہ کے دعویٰ اور فیصلہ دونوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جنم استھان کا چبوترہ مسجد سے باہر تھا۔

اس فیصلہ کے خلاف اپیل بھی ضلع مجسٹریٹ فیض آباد نے ۲۶ مارچ ۱۸۸۵ء کو خارج کر دی دیکھتے سول اپیل (۲۷) ۱۸۸۶ء اگرچہ اس مقدمہ کے وقت سے دونوں فرقوں کے درمیان عملی طور پر کشیدگی پیدا ہوگئی جو دن بدن بڑھتی رہی لیکن مسلمان معمول کے مطابق مسجد میں پنج وقتہ نماز پڑھتے رہے چنانچہ تعمیر کے وقت یعنی ۱۵۲۸ء/۹۳۵ھ

سے ۲۲ دسمبر ۱۹۲۹ء تک بغیر کسی رکاوٹ کے پنج وقتہ باجماعت نماز ہوتی رہی اور مستقل طور پر اس مسجد کے مؤذن اور امام مغلیہ عہد سے برابر متعین ہوتے رہے مسجد کے مصارف کے لئے مغلیہ عہد میں ساٹھ روپے سالانہ سرکاری خزانہ سے مقرر تھا نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپے تین آنہ ۶ پائی کر دی گئی برٹش حکومت نے بھی اس رقم کو جاری رکھا پھر بندوبست اول کے وقت رقم کی بجائے دو گاؤں ”بھورن پور“ اور ”شولا پور“ متصل اجمودھیا بطور معافی.... دیئے گئے، جن کی آمدنی برابر مسجد کے مصارف پر خرچ ہوتی رہی، چنانچہ رجسٹریڈ فوٹو (۳۰) میں اس وقت کے متولی، جواد حسین ساکن موضع شہنواں ڈاکخانہ درشن نگر ضلع فیض آباد اور جائیداد کی تفصیل، عمارت مسجد بابری مع اراضی واقع موضع بھورن پور اور شولا پور تحصیل ضلع فیض آباد درج ہے، پھر سنی وقف ایکٹ ۱۳/۱۹۲۰ء کے تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے معائنہ کر کے اس کا باقاعدہ رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا۔

غرض کہ ۱۹۲۹ء تک تاریخی اور قانونی ہر اعتبار سے ”بابری مسجد“ بغیر کسی اختلاف اور نزاع کے مسجد کی حیثیت سے مسلمانوں کے قبضہ میں رہی اور مسلمان بغیر کسی مزاحمت اور روک ٹوک کے اس میں پنج وقتہ باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔

بابری مسجد میں مجرمانہ طور پر مورتی کی تنصیب

۴۹-۱۹۲۸ء میں ملک کے اندر بالخصوص یوپی، دہلی، بیوات، پنجاب وغیرہ صوبوں میں اس بڑے پیمانہ پر فرقہ دارانہ فسادات اور قتل و خون ریزی کے حادثات ہوئے کہ اس نے ملک کے سارے نظام کو کچھ دنوں کے لئے معطل کر کے رکھ دیا، اسی اتھل پتھل اور افراتفری کے زمانہ میں ۲۲، ۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ء کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت ”ابھے رام داس“ نے ضلع مجسٹریٹ ”کے، کے، نائر“ کی سازش اور اپنے چیلوں کی مدد سے مسجد کی دیوار پھاند کر مسجد میں گھس گئے اور مسجد کے درمیانی گنبد میں عین محراب کے اندر ”رام کی مورتی“ رکھ دی صبح کو جب مسلمان فجر کی نماز پڑھنے گئے تو مورتی کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے اور اسی وقت مورتی کو نکالنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ ۲۳ صبح کو ڈیوٹی پر

متعین پولیس ”ماتوپرشاد“ نے اس وقت کے تھانہ انچارج ”شری رام دیو“ کو جو تحریری رپورٹ درج کرائی اس میں لکھا ہے کہ ”ابھے رام داس، شکل داس، سدیشن داس، اور پچاس، ساٹھ آدمی نامعلوم نے مسجد میں مورتی استھاپت (نصب) کر کے مسجد کو ناپاک کر دیا ہے جس سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اسی رپورٹ کی بنیاد پر سٹی مجسٹریٹ ضلع فیض آباد نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کر لیا اور پر یہ دت رام چیرمین میونسپل بورڈ فیض آباد کو ریسیور مقرر کر کے مسجد پر تالا ڈال دیا اور فریقین کے نام نوٹس جاری کر دی کہ وہ اپنے اپنے دعویٰ کے سلسلے میں ثبوت پیش کریں۔

اس انتہائی مجرمانہ اور غیر مذہبی حرکت پر پورے ملک کے مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی پھیل گئی چنانچہ جمعیۃ علماء کے اکابر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حافظ الرحمن صاحب سیوہاری وغیرہ نے صورت حال کی نزاکت سے اس وقت کے وزیر اعظم آنجنمانی ”جواہر لال نہرو“ کو مطلع کیا پنڈت جواہر لال جی نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری پنٹھ کو لکھا کہ وہ ضلع مجسٹریٹ کو حکم دیں کہ مسجد سے مورتی فوراً نکال دی جائے چنانچہ پنٹھ نے وزیر اعظم کے حکم کے مطابق ضلع مجسٹریٹ کو یہ آرڈر بھیج دیا چونکہ ضلع مجسٹریٹ اس سازش میں خود ملوث تھا اس لئے اس آرڈر پر عمل کرنے کے بجائے اس نے ابھے رام داس وغیرہ کو کئی صورت حال کی اطلاع دیدی اور ان سے کہا کہ میں اس آرڈر کے نفاذ میں کچھ تاخیر کر دوں گا تم لوگ اس درمیان میں عدالت سے اسٹے حاصل کر لو ان لوگوں نے اس کے کہنے کے مطابق اس حکم کے خلاف عدالت سے اسٹے حاصل کر لیا اس طرح مورتی مسجد سے ہٹائی نہ جاسکی، چنانچہ ضلع مجسٹریٹ، کے، کے نائر سے پنٹھ جی نے اسی بنیاد پر استعفا لے لیا، لیکن اس کے بعد پنٹھ جی نے اس معاملہ میں دلچسپی نہیں لی اور مورتی اسی جگہ باقی رہی۔

مقدمات کا سلسلہ

مسجد میں مورتی کو غیر قانونی طور پر رکھنے کے تقریباً ۲۳-۲۴ دن بعد ۱۶ جنوری

۱۹۵۰ء کو ہندو فرقہ کے ایک شخص گوپال سنگھ نامی کی طرف سے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیکو، احمد حسین عرف اچھن، محمد سمیع، ڈی ایم، سٹی مجسٹریٹ اور سرکار اتر پردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کیا گیا کہ یہ جنم بھومی ہے ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں مسلمانوں اور ضلع انتظامیہ نے اس میں رکاوٹ ڈال دی ہے لہذا اس رکاوٹ کو ختم کر کے ہمیں پوجا پاٹ کی اجازت دی جائے۔ یاد رہے کہ ۱۸۸۵ء کے دعویٰ میں جو رگھوناتھ داس کی طرف سے دائر کیا گیا تھا، اس میں مسجد کے باہر چبوترہ کو جنم استھان بتایا گیا تھا اور اسی پر عمارت بنانے کی اجازت چاہی گئی تھی اور اس دعویٰ میں جو نظری نقشہ پیش کیا گیا تھا اس میں مسجد کو ”بابری مسجد“ ہی کی حیثیت سے دکھایا گیا تھا۔

کیم جولائی ۱۹۵۶ء کو ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے عدالت میں جواب دعویٰ داخل کرتے ہوئے اپنے بیان کے پیرا گراف ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ میں لکھا ہے:

یہ جائیداد نزاعی ”بابری مسجد“ کے نام سے مشہور ہے اور لمبے عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمانوں کے ذریعہ عبادت کیلئے استعمال ہوتی چلی آ رہی ہے اس کا استعمال رام چندر جی کے مندر کے روپ میں کبھی نہیں ہوا ۲۲ ستمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں رام چندر جی کی مورتی کو چوری اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا، اس غلط اور غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بے چینی پیدا ہو گئی اور علاقے میں نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا اس لئے سٹی مجسٹریٹ گرو دت سنگھ نے ۲۳ ستمبر ۱۹۴۹ء کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی اور اسی تاریخ کو ایڈیشنل مجسٹریٹ ”شری مارکھنڈے سنگھ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اس مسجد کو قرق کر کے ریسیور مقرر کر دیا۔“

ڈپٹی کمشنر کے جواب دعویٰ سے ایک ماہ پہلے یعنی کیم جون ۱۹۵۰ء کو ایس، پی ضلع فیض آباد کو پال سنگھ نے بھی جواب دعویٰ داخل کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ

”یہ زمانہ قدیم سے ”بابری مسجد“ ہے اور اس میں ہمیشہ سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔“

اس مقدمہ کے بعد ہندوؤں کی جانب سے دو مقدمات اور دائر کئے گئے ایک پریم ہنس رام چندر اس کی جانب سے اور دوسرا نرموہی اکھاڑا کی طرف سے، اسکے بعد ۱۹۶۸ ÷ میں یوپی سنٹرل وقف بورڈ اور مسلمانوں کی جانب سے ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں جمعیت علماء کی طرف سے مولانا نصیر احمد صاحب فیض آبادی بھی مدعی تھے، اس دعویٰ میں کہا گیا تھا کہ یہ ”بابری مسجد“ مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸ ÷ سے برابر عبادت کرتے چلے آ رہے ہیں یہ مسجد ان کو واپس دی جائے اور نماز میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

اب تک ان تمام مقدموں کی فائل الگ الگ تھیں بغرض سہولت عدالت کے حکم سے انہیں یکجا کر دیا گیا اور سٹی سنٹرل وقف بورڈ کے مقدمہ ۱۲/۶۱ اور ہنما کیس قرار دیدیا گیا۔

اسی اثناء میں ریسیور پر یہ دت کا انتقال ہو گیا، تو عدالت نے ان کی جگہ ”شری کے کے رام ورما“ آنریری مجسٹریٹ کو ریسیور مقرر کیا اسی درمیان مسلمانوں کو اطلاع ملی کی مسجد میں تبدیلی کی جا رہی ہے، اس لئے انھوں نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے الگ کرنے کی درخواست دی مسلمانوں کی شکایت کو صحیح مانتے ہوئے سول جج نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے ہٹانے کا حکم دیدیا اس حکم کے خلاف ہندوؤں نے ہائی کورٹ لکھنؤ بینچ میں ”رویشن“ دائر کر کے اسٹے لے لیا اس موقع پر ہنما کیس اور جملہ مقدمات کی فائل، ہائی کورٹ میں طلب کر لی گئی اور فیض آباد میں تمام مقدمات رک گئے اور تقریباً پندرہ سال کی طویل مدت گزر گئی مگر فیض آباد کی عدالت میں اس مقدمہ کے سلسلے میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی حالانکہ اس مدت میں مسلمانوں کی جانب سے بار بار درخواست پیش کی گئی کہ اس کا فیصلہ جلد کر دیا جائے اور ہائی کورٹ کی طرف سے بھی عدالت فیض آباد کو ہدایت دی گئی کہ اس مقدمہ کا جلد فیصلہ کر دیا جائے مگر اس کا کوئی اثر نہیں لیا گیا۔

دوران مقدمہ خلاف قانون مسجد میں تبدیلیاں

گذشتہ سطور میں معلوم ہو چکا ہے کہ ”بابری مسجد“ کے چاروں سمت چہار دیواری ہے، مسجد کا صدر دروازہ اتری سمت ہے اس دروازے پر موٹے خط میں لفظ اللہ کندہ تھا مگر

ریسیور اور پولیس کی نگرانی کے ہوتے ہوئے اسے کھرچ کر مٹا دیا گیا اور دروازے پر ”جنم استھان مندر“ کا ایک بورڈ لگا دیا گیا، احاطہ کی اتری چہار دیواری اور صحن مسجد کے درمیانی خالی جگہ پر سفید وسیاہ سنگ مرمر کا فرش بنا لیا گیا ہے جسے ”پری کرما“ (مطاف) کا نام دیا گیا ہے، صحن مسجد میں اتری جانب ہینڈ پائپ گاڑ لیا گیا ہے، صحن مسجد سے باہر پوربی سمت ایک سفالہ پوس مندر تعمیر کر لیا گیا ہے، اسی کے متصل مہنتوں کی قیام گاہ بھی بنائی گئی ہے، دکھن سمت اس چہوتراہ پر جسے شروع میں رام جنم استھان کا نام دیا گیا ہے، مندر تعمیر کر لیا گیا ہے اور اسی کے متصل دو مندر اور بھی بنائے گئے ہیں، مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک جھنڈا لگا دیا گیا ہے، یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷ ÷ سے ۱۹۸۶ ÷ کی درمیانی مدت میں کی گئی ہیں جبکہ ریسیور کا تقرر قانونی طور پر اس لئے ہوتا ہے کہ متنازع عمارت میں فریقین کی جانب سے کوئی ترمیم و اضافہ نہ کیا جاسکے لیکن یہ تمام تبدیلیاں ہوتی رہیں نہ مقرر ریسیور رام ورمانے اس کا کوئی نوٹس لیا اور نہ وہاں متعین نگران پولیس نے اس لئے کہ جذباتی طور پر یہ سب لوگ ان غیر قانونی تبدیلیوں میں باہم شریک کار تھے۔

مسجد مندر بنادی گئی

ہائی کورٹ بینچ لکھنؤ میں ریسیور ورما کے سلسلہ میں داخل رٹ زیر سماعت ہے اور قانونی طور پر ابھی اس کے خلاف اپیل نہیں کی جاسکتی لیکن ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ ÷ پر پیش چندر پانڈے نامی ایک غیر متعلق شخص نے جواب تک کے کسی مقدمہ میں فریق نہیں ہے منصف صدر فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ (۲) ۱۹۵۰ ÷ میں ایک نئی درخواست دی کہ جنم استھان میں پوجا پاٹ کرنے کی چھوٹ ہونی چاہئے لہذا عدالت ضلع انتظامیہ کو حکم دے کہ جنم بھومی یا بابری مسجد کا تالا کھول دے تاکہ ہم اور ہندو لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے پوجا کر سکیں اس پر منصف صدر نے.... یہ کہتے ہوئے درخواست خارج کر دی کہ اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لئے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا اس فیصلہ کے خلاف ڈسٹرکٹ جج مسٹر کے، ایم پانڈے کی عدالت میں سول اپیل

نمبر (۶) ۱۹۸۲ ÷ ۳۰ جنوری کو داخل کی گئی اور ۳۱ جنوری کو دیوانی کے سرکاری وکیل نرائن دت کھتری پیش ہو گئے ضلع مجسٹریٹ نے ڈی، ایم اور ایس، پی کا بیان لینا چاہا چنانچہ کلیم فروری ۱۹۸۶ ÷ کو یہ دونوں حکام بھی حاضر ہو گئے جن سے ضلع مجسٹریٹ نے سوال کیا کہ اگر مسجد یا جنم بھومی کا تالا کھول دیا جائے تو کیا آپ لائینڈ آرڈر بحال کر سکیں گے جس پر انھوں نے کہا کہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے اور ہم اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ اس فرضی کارروائی کے بعد اسی دن یعنی سنیچر کو پونے پانچ بجے جج نے یہ فیصلہ سنایا کہ ضلع انتظامیہ اس جگہ کا تالا کھول دے اور ریش چندر پانڈے اور دیگر ہندوؤں کو پوجا پاٹ کرنے کی کھلی چھوٹ دی جائے اس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے نیز ضلع انتظامیہ لائینڈ آرڈر بحال رکھنے کیلئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔

مسلمانوں کی طرف سے اس مقدمہ کے سلسلے میں تین درخواستیں دی گئیں لیکن جج نے یہ کہتے ہوئے کہ معاملہ ضلع انتظامیہ سے متعلق ہے اس میں مسلمانوں کو فریق بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تینوں درخواستیں رد کر دیں اور فیصلہ کے فوراً بعد ۵ رنج ۱۹ منٹ پر بابری مسجد کا دروازہ کھول دیا گیا اور ہزاروں ہندو پوجا پاٹ کیلئے اس وقت مسجد میں پہنچ گئے اس طرح سے ۲۵۸ سال کی قدیم مسجد بیک جنبش قلم مندر میں تبدیل کر دی گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ۵

اس مقدمہ کا یہ پہلو کس قدر ڈرامائی ہے کہ اس میں مدعی ریش پانڈے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اندرکار پانڈے، ڈسٹرکٹ جج کے، ایم پانڈے اور وکیل ویریشور دودیدی سب کے سب پنڈٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اس میں جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہی سے ظاہر تھا۔

اسی کا شہر وہی مدعی، وہی منصف ہمیں یقین تھا ہمارا قصور نکلے گا

فیصلہ پر ایک نظر

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ پونے پانچ بجے ہوتا ہے لیکن اجودھیا اور

فیض آباد میں پی، اے، سی اضافی طور پر دن کے دو بجے ہی لگا دی گئی اور مسلمانوں کے محلوں میں ان کا زبردست گشت شروع ہو گیا اور فیصلے سے پہلے ہی عدالت کو پولیس اور پی، اے سی نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

فیصلہ سے قبل یہ تیاریاں صاف بتلا رہی ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے طے شدہ اسکیم کے تحت ہوا ہے، یہ بات بھی کم حیرت کی نہیں ہے کہ صرف پانچ دن کے اندر منصف عدالت سے لے کر ضلع جج کی عدالت تک مقدمہ کی ساری کارروائی عمل میں آگئی اور فیصلہ بھی کر دیا گیا ہندوستان کی عدالتوں میں کیا مقدمات اتنی ہی سرعت کے ساتھ نمٹائے جاتے ہیں، کیا ہندوستانی عدلیہ اس کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

پھر جو مقدمہ ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہو اس کی اپیل اور وہ بھی ماتحت عدالت میں کس قانونی دفعہ کے تحت کی گئی ہے؟۔

کیا کسی مقدمہ میں فریق ثانی کو نوٹس دیئے بغیر فیصلہ کر دینا قانونی رو سے درست کہا جاسکتا ہے؟

آخری بات

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر اس طرح کے بلکہ اس سے بھی سنگین تر حالات پیش آئے ہیں لیکن مسلمانوں نے اپنے استقلال و استقامت، صبر و تحمل اور حکمت و جرأت سے ہر موقع پر حالات کے رخ کو موڑ دیا ہے اس لئے آج بھی ہمیں تاریخ سے سبق لینا چاہئے غم و غصہ، مایوسی و نامرادی، جھنجھلاہٹ اور چیخ و پکار کے بجائے صبر و استقامت اور جرأت سے خدا کے سہارے آگے بڑھنا چاہئے ظلم و جبر کی کشتی زیادہ دنوں تک نہیں چلتی، کامیابی و کامرانی ہمیشہ حق و انصاف کے قدم چومتی ہے۔

واتسم الاعلون ان کنتم مؤمنین.

☆ ☆ ☆

تمت هذا التوحيد ولعت ومدح وصفته نور اللہ برہانہ بخط عبدالضعیف نجیف
فتح اللہ محمد غوری۔

اس بڑے کتبہ کے علاوہ اندرون مسجد منبر کی دونوں جانب ایک ایک کتبہ نصب تھا،
۲۷ مارچ ۱۹۳۲ء کے ہنگامہ کے موقع پر جو گاؤ کشی کے عنوان کا بہانہ بنا کر برپا کیا گیا
تھا، مسجد میں گھس کر بلوائیوں نے توڑ پھوڑ کی تھی، جس میں یہ دونوں کتبے بھی اٹھالے گئے
تھے، بعد میں ”تہور خاں ٹھیکیدار“ نے منبر کی بائیں سمت والے کتبہ کی نقل تیار کر کے اسی
پہلی جگہ پر اسے نصب کرادیا، داہنی جانب کے کتبہ کی ایک نقل سید بدر الحسن فیض آبادی
کے پاس محفوظ تھی، اس لئے اس کتبہ کی عبارت بھی دستیاب ہوگئی۔

بائیں سمت کا کتبہ حسب ذیل اشعار پر مشتمل تھا۔

بفرمودہ شاہ بابر کہ عدلش بنا بیست با کاخ گردوں ملاقی
بنا کرد این مہبط قدسیاں را امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی و سال بناکش عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی
داہنی جانب والے کتبہ کے اشعار یہ تھے۔

بمنشائے بابر خدیو جہاں بنائے کہ با کاخ گردو عنان
بنا کرد این خانہ پائیدار امیر سعادت نشاں میر خاں
بماند ہمیشہ چینیں بانیش چناناں شہر یار زمیں و زماں

ابتدائے تعمیر سے باہری مسجد میں نماز پنج گانہ اور جمعہ ہوتا رہا ہے، عدالتی کاغذات
سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قریب یعنی ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۰ء تک اس مسجد کے امام و
خطیب ”محمد اصغر“ تھے، ۱۸۷۰ء تا ۱۹۰۰ء کی درمیانی مدت میں مولوی ”عبدالرشید“ نے
امامت کے فرائض انجام دیئے، ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۰ء کے عرصہ میں یہ خدمت مولوی
عبدالقادر کے سپرد رہی، اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء مسجد کے فرق ہونے کی تاریخ تک
مولوی عبدالغفار کی اقتداء میں مسلمان اس مسجد میں نماز پنج وقتہ اور جمعہ ادا کرتے تھے، یہ
آخری امام ابھی حیات ہیں۔

بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں



مسجد کی تعمیر اور اس کی تاریخی حیثیت

تین گنبدوں والی یہ قدیم مسجد شہنشاہ ”بابر“ کے دور میں اودھ کے حاکم ”میر باقی
اصفہانی“ نے ۹۳۵ھ/۱۵۲۸ء میں تعمیر کرائی تھی، مسجد کے مسقف حصہ میں تین صفیں تھیں
اور ہر صف میں ایک سو بیس نمازی کھڑے ہو سکتے تھے، صحن میں چار صفوں کی وسعت تھی،
اس طرح بیک وقت ساڑھے آٹھ سو مصلی نماز ادا کر سکتے تھے۔

مسجد کے درمیانی مرکزی در کے اوپر دو میٹر لمبی اور پچپن سینٹی میٹر چوڑی پتھر کی تختی
کا ایک کتبہ نصب تھا، جس کی پہلی اوپر سطر میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ و بہ ثقتی“ خوشنما بیلوں
کے درمیان لکھا ہوا تھا، اور نیچے کی تین سطروں میں یہ اشعار تھے۔

بنام آنکہ او دانائے اکبر کہ خالق جملہ عالم لامکانی
درود مصطفیٰ بعد از ستائش کہ سرور انبیاء زبدہ جہانی
فسانہ در جہاں بابر قلندر کہ شد در دور گیتی کامرانی
چنانکہ ہفت کشور در گرفتہ زمیں را چوں مثالے آسمانی
در آں حضرت یکے میر معظم کہ نامش میر باقی اصفہانی
مشیر سلطنت تدبیر ملکش کہ این مسجد حصار ہست بانی
خدایا در جہاں تابندہ ماند کہ چتر و تخت و بخت و زندگانی
دریں عہد و دریں تاریخ میہوں کہ نہ صد پنج و سی بودہ نشانی

بابری مسجد کے مصارف کے واسطے عہد مغلیہ میں مبلغ ساٹھ روپے سالانہ شاہی خزانے سے ملتے تھے، نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپے تین آنہ چھ پائی کردی گئی تھی، برطانوی اقتدار میں بھی یہ رقم بحال رہی، پھر بندوبست اول کے وقت نقد کی بجائے دو گاؤں بھورن پور اور شولا پور متصل اجودھیا اس کے مصارف کے لئے دیئے گئے، غرض کہ اپنی ابتداء تعمیر ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء ÷ سے ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء تک یہ مسجد بغیر کسی نزاع و اختلاف کے مسجد ہی کی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک مقدس و محترم عبادت گاہ رہی اور مسلمان امن و سکون کے ساتھ اس میں اپنی مذہبی عبادت ادا کرتے تھے۔



مسجد، مندر قضیہ کا آغاز

مستند تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر سے صدیوں پہلے مسلمان اجودھیا میں آباد تھے، اور یہاں کے ہندو مسلم پوری یک جہتی اور یگانگت کے ساتھ رہتے سہتے تھے، ۱۸۵۵ء ÷ ۱۲۷۲ھ سے پہلے کسی مذہبی معاملہ میں یہاں کے باشندوں کے درمیان کوئی تنازعہ رونما ہوا یا باہمی ٹکراؤ کی نوبت آئی ہو صحیح تاریخوں اور مذہبی نوشتوں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، لیکن جب اس ملک پر انگریزوں کا منحوس سایہ پڑا اور ان کا یہاں عمل دخل شروع ہوا تو انہوں نے اپنی بدنام زمانہ پالیسی ”لٹاؤ اور حکومت کرو“ کے تحت یہاں کے لوگوں میں باہمی منافرت اور تصادم پیدا کرنے کی غرض سے مسجد، مندر، جنم استھان وغیرہ کا خود ساختہ قضیہ چھیڑ دیا جس کے نتیجے میں ۱۸۵۵ء ÷ ۱۲۷۲ھ میں اجودھیا کے اندر زبردست خونریزی ہوئی، جس کی تفصیل احقر کی تالیف ”اجودھیا کے اسلامی آثار“ میں ملاحظہ کی جائے، اسی وقت سے اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی، اور نوبت بایں جا رسید۔

شاہراہ انگریزوں نے سب سے پہلے ”جنم استھان“ اور ”سیتا کی رسوئی“ کا افسانہ ترتیب دیا اور ایک بدھسٹ نجومی کو پہلے سے سکھا پڑھا کر ان دونوں مقامات کی جگہ معلوم

کی، اس نے طے شدہ سازش کے مطابق زانچہ کھینچ کر بتا دیا کہ ”جنم استھان“ اور ”سیتا کی رسوئی“ بابری مسجد سے متصل احاطہ کے اندر ہے، پھر اپنے زیر اثر ہندوؤں کو اکسایا کہ ان دونوں ”پوتر استھانوں“ کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، ”نقی علی خاں“ جو نواب واجد علی کا خسر اور وزیر تھا، انگریزوں کی اس سازش میں ان کا مؤید اور طرف دار تھا، اس نے اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ ناعاقبت اندیش نواب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ بابری مسجد سے باہر مگر اس کے احاطہ کے اندر جنم استھان و سیتا رسوئی کے لئے جگہ دیدی جائے، چنانچہ مسجد کے مسقف حصہ کے بالمقابل احاطہ مسجد کی دیوار سے متصل داہنی سمت ”سیتا رسوئی“ کے لئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں پورب کی جانب جنم استھان کے نام سے ۲۱/۲ فٹ لمبی اور ۱۷/۱ فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی، جس پر اسی وقت سے پوجا پاٹ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا، حالانکہ جس وقت یہ افسانہ ایجاد کیا گیا اس سے برسہا برس پہلے سے قلب شہر میں جنم استھان کا مندر موجود تھا اور آج بھی موجود ہے، اس وقت مسجد اور جنم استھان کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کی غرض سے صحن مسجد کے ارد گرد آہنی سلاخوں کی باڑھ کھڑی کردی گئی، اسی منحوس تاریخ سے اجودھیا میں مذہبی کش مکش شروع ہو گئی اور یہاں کے ہندو مسلم، مندر مسجد کے نام پر آپس میں دست بگریباں ہو گئے۔

خدا سمجھے بت سحر آفریں سے
گریباں کو لڑایا آستیں سے

۱۸۵۷ء ÷ میں جب کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے متحد ہو کر بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا یگل بجایا، ضلع فیض آباد کے گزیٹر سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت باہمی اتفاق و یگانگت کو مستحکم کرنے کی غرض سے اجودھیا کے مسلم رہنما امیر علی اور ہندو رہنما بابا چرن داس نے رام جنم استھان اور بابری مسجد کے تنازعہ کو ہمیشہ کے واسطے ختم کرنے کی غرض سے ایک معاہدہ کیا کہ رام جنم استھان کی مخصوص تنازعہ راضی ہندوؤں کے حوالہ کردی جائے اور ہندو بابری مسجد کی عمارت سے دست کش ہو جائیں، چنانچہ اس معاہدہ پر فریقین خوشی خوشی راضی ہو گئے اور دو سال سے اختلاف کی

جو آگ بھڑک رہی تھی وہ ٹھنڈی ہوگئی، مگر انگریزوں کو یہ ہندو مسلم اتحاد گوارا نہ ہوا، انہوں نے بابا رام چرن داس اور امیر علی دونوں کو ایک ساتھ اٹلی کے پیڑ پر لٹکا کر پھانسی دیدی اور مندر مسجد کے نزاع کو از سر نو زندہ کرنے کی غرض سے متنازعہ رام جنم استھان اور باہری مسجد کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی، دونوں کے راستے بھی الگ الگ بنا دیئے اور مسجد کے شمالی دروازہ سے مسجد میں داخلہ پر پابندی عائد کر دی، اور — جذباتی ہندوؤں کو اکسایا کہ وہ اس تقسیم کو مسترد کر کے پوری مسجد پر دعویٰ کریں، اسی کے ساتھ مسلمانوں کو بھی برا بھونچتا کیا کہ وہ مسجد کی اراضی کے اس بڑاڑہ کو تسلیم نہ کریں چنانچہ یہ کشاکش پھر شروع ہوگئی جس کا ایک طویل سلسلہ ہے، تفصیل کے لئے ”اجودھیا کے اسلامی آثار“ کا مطالعہ کیجئے۔

﴿ ۳ ﴾

مسجد کو مندر بنانے کی شرمناک سازش

۱۹۲۸/۲۹ء میں جب کہ ملک فرقہ وارانہ تشدد کی آگ میں جل رہا تھا، اور پورے ہندوستان میں افراتفری مچی ہوئی تھی ۲۲، ۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ء کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت ”ابھے رام داس“ نے اپنے کچھ چیلوں کے ساتھ مسجد میں گھس کر عین محراب کے اندر ایک مورتی رکھ دی جس کے خلاف اس وقت ڈیوٹی پر مقرر کانسٹیبل ”ماتو پرشاد“ نے صبح کو تھانہ میں حسب ذیل رپورٹ درج کرائی۔

”ابھے رام داس، سدرشن داس اور پچاس ساٹھ نامعلوم لوگوں نے مسجد کے

اندر مورتی استھاپت (نصب) کر کے مسجد کو ناپاک کر دیا ہے۔ جس سے

نقص امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔“

اس رپورٹ کو بنیاد بنا کر فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۲۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کر کے مقفل کر دیا اور پر یہ دت رام چیرمین کو اس کی حفاظت کے لئے رسیور مقرر کر دیا، نیز فریقین کے نام نوٹس جاری کیا کہ اپنے اپنے دعویٰ پر ثبوت پیش کریں، سٹی مجسٹریٹ کا یہ غیر منصفانہ عمل زبان حال سے بتا رہا ہے کہ مسجد میں

بت رکھنے کی کارروائی گہری سازش کے تحت عمل میں لائی گئی تھی، ورنہ ایک قدیم جمعہ وجماعت سے آباد مسجد کے بارے میں ثبوت طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ سیدھی بات یہ تھی کہ ماتو پرشاد کانسٹیبل کی رپورٹ کے مطابق مجرمین کو قراوقعی سزا دی جاتی اور مسجد سے مورتی نکال کر اس مسئلہ کو ختم کر دیا جاتا، مگر حیرت ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کو اس سنگین معاملہ پر توجہ دلائی اور انہوں نے یوپی کے وزیر اعلیٰ گووند پلہ پنت کو لکھا کہ اس مسئلہ کو فی الفور حل کریں، پھر بھی اس سلسلے میں کوئی مثبت کارروائی نہیں کی گئی، اور مذہبی جانبداری و اقتدار سیکولرزم اور قانون و انصاف پر غالب رہا، گویا ملک کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کا اولین صلہ آزاد ہونے کے بعد یہ دیا گیا کہ ان کی قدیم متبرک عبادت گاہ میں مورتیاں رکھ دی گئیں اور اس کے منبر و محراب جو اب تک رکوع و تجود سے آباد تھے مقفل کر دیئے گئے۔

دیکھیں اس آغاز کا ہوتا ہے کیا انجام کار

اس حادثہ کے وقت مولانا آزاد نے کہا تھا کہ ”میرے ذہن میں یہ سوال گونج رہا ہے کہ مستقبل میں مسلمانوں کو ایک ملت کی حیثیت سے قبول کیا جائے گا یا نہیں، اگر اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو باہری مسجد سے بت ہٹا دیئے جائیں گے، اور اگر آئندہ چل کر اس کی نفی ہوتی ہے تو انتظار کیجئے دوسری مسجدوں میں بھی اس طرح کے حادثات پیش آسکتے ہیں۔“ آج کے واقعات سے مولانا آزاد کے خدشات صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔

اس حادثہ کے بعد ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو گوپال سنگھ نامی ایک شخص نے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیلو، احمد حسن عرف اچھن، محمد سمیع، ڈی، نیم سٹی مجسٹریٹ اور سرکار اتر پردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کر دیا کہ مسجد جنم استھان ہے، ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں مگر مسلمان اور ضلع حکام اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، لہذا اس رکاوٹ کو ختم کر کے ہندوؤں کو اس میں پوجا پاٹ کی باضابطہ اجازت دی جائے، اس مقدمہ کے دائر ہونے کے تیسرے دن یعنی ۱۹ جنوری ۱۹۵۰ء کو عدالت نے ایک حکم امتناعی کے ذریعہ

ہندو مسلمان دونوں کا داخلہ مسجد میں ممنوع قرار دے دیا پھر ۱۳ مارچ ۱۹۵۱ء میں عدالت نے پجاری کو مسجد کے اندر جا کر پوجا اور بھوگ کرنے کی اجازت دیدی، مگر مسلمان اپنی عبادت گاہ میں خدائے وحدہ لا شریک لہٰ کا نام لینے سے محروم رہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب ظلم و نا انصافی کو طاقت و حکومت کی پشت پناہی حاصل ہو جاتی ہے تو آئین و قانون اور عدالت سب اس کے آگے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔

دعویٰ مذکورہ کی جواب دہی کرتے ہوئے فیض آباد کے ایس پی کرنا سنگھ نے یکم جون ۱۹۵۰ء کو جو جواب دعویٰ عدالت میں داخل کیا اس میں لکھا تھا کہ

”زمانہ قدیم سے بابر مسجد ہے اس میں مسلمان ہمیشہ سے نماز پڑھتے

چلے آ رہے ہیں ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔“

ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اسی مقدمہ سے متعلق یکم جولائی ۱۹۵۰ء کو جو حلف نامہ داخل کیا تھا اس میں بھی ”بابر مسجد“ کی مسجدیت کا اعتراف و اقرار موجود ہے، مذکورہ بالا مقدمہ کے علاوہ ۱۹۶۱ء میں دو مزید مقدمات دائر کئے گئے ایک رام چندر داس کی جانب سے اور دوسرا نرموہی اکھاڑہ کی طرف سے، جس کے جواب میں جمعیۃ علماء ہند اور یو پی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی طرف سے بھی مقدمات قائم کئے گئے جن میں کہا گیا تھا کہ یہ بابر مسجد مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸ء سے برابر عبادت کرتے رہے ہیں لہذا یہ مسجد انھیں واپس دی جائے اور نماز وغیرہ میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

تقریباً ۳۵ سال کے طویل عرصہ تک یہ مقدمات عدالت میں معطل پڑے رہے، ان سے متعلق کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی گئی، اس دوران پولیس اور ریسور کی نگرانی کے باوجود مسجد کے اندر اور باہر خلاف قانون بہت سی تبدیلیاں کردی گئیں، مثلاً مسجد کے صدر دروازہ پر چلی حرفوں میں ”اللہ“ کندہ تھا جسے کھرچ دیا گیا، دروازہ پر جنم استھان مندر کا بورڈ لگا دیا گیا، احاطہ کی شمالی چہار دیواری اور مسجد کی درمیانی جگہ میں سفید و سیاہ سنگ مرمر کا فرش بنایا گیا جسے پری کرما کا نام دیا گیا، صحن مسجد میں اتر جانب ایک پینڈ پائپ نصب کر لیا گیا، مسجد سے باہر پورب سمت ایک سفالہ پوش مندر اور مندر کے پجاری کے لئے ایک کمرہ تعمیر

کر لیا گیا دکن جانب نام نہاد جنم استھان کے چبوترہ پر بھی ایک مندر بنا لیا گیا اور مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک بھگوا جھنڈا لگا دیا گیا یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷ء اور ۱۹۸۶ء کے درمیانی عرصہ میں کی گئیں مگر ریسور، انتظامیہ اور عدالت کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔



عدالت نے اقتدار کے دباؤ میں مسجد کے اندر

مورتی پوجا کی غیر منصفانہ اجازت دیدی

مسلمانوں کو کسی حد تک اطمینان تھا کہ مسجد مقفل ہے اور ہائی کورٹ میں اس کے مقدمات کی سماعت ہو رہی ہے، عدلیہ اس بارے میں جو فیصلہ کرے گی اسے تسلیم کر لیا جائے گا، کیونکہ عدلیہ پر ان کا اعتماد ابھی مجروح نہیں ہوا تھا، اسی پر امن ماحول میں ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء کو ”میش پانڈے“ ایک غیر متعلق شخص نے جو بابر مسجد سے متعلق کسی بھی مقدمہ میں فریق نہیں تھا صدر منصف فیض آباد کی عدالت میں یہ درخواست گذاری کہ

”جنم استھان میں پوجا پاٹ کی اجازت ہونی چاہئے اس لئے عدالت ضلع

انتظامیہ کو حکم دے کہ جنم بھومی بابر مسجد کا تالا کھول دے تاکہ میں اور

دوسرے ہندو بغیر کسی رکاوٹ کے پوجا کر سکیں۔“

صدر منصف نے یہ کہہ کر درخواست مسترد کر دی کہ ”اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لئے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا“ منصف کے اس فیصلہ کے خلاف مسٹر کے، ایم، پانڈے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں ۳۰ جنوری ۱۹۸۶ء کو اپیل دائر کی گئی ڈسٹرکٹ جج نے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو پونے بارہ بجے یہ یکطرفہ فیصلہ سنا دیا کہ ”ضلع انتظامیہ تالا کھول دے اور ریش پانڈے و دیگر پجاریوں کو پوجا پاٹ کی عام اجازت دی جائے، اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے، نیز ضلع انتظامیہ لائینڈ آرڈر بحال رکھنے کے لئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔“

اس غیر عادلانہ فیصلے کے بعد بغیر کسی تاخیر کے ۵/۱۹ بجکر ۱۹ منٹ پر بابری مسجد کا تالا کھول دیا گیا جو ۱۹۵۰ء میں حکم امتناعی کے نفاذ میں لگایا گیا تھا اور ہزاروں ہندو جو وہاں جمع کئے گئے تھے پوجا پاٹ کے لئے مسجد میں داخل ہو گئے، تالا کھولنے کی اس شرمناک تقریب کو ہمارے سیکولر ملک کے نشریاتی ادارہ ’دور درشن‘ نے بڑے اہتمام سے نشر کیا تاکہ مسلمانوں کے زخمی دلوں پر اچھی طرح سے نمک پاشی ہو جائے، علاوہ ازیں پورے ملک میں اس کا جشن منایا گیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کو شکست دیدی گئی، اس کھلی ہوئی بے انصافی پر مسلمانوں کی طرف سے احتجاج کیا گیا تو رائفل کی گولیوں سے احتجاج کرنے والوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا، خاص طور پر بارہ بنکی، بنارس، بنگلور وغیرہ شہروں میں سرکاری پولیس نے مسلمانوں کے خلاف دردناک بہیمیت کا برتاؤ کیا، بعد میں یہ بات عام طور پر مشہور ہو گئی کہ سیکولرزم کی علمبردار کانگریس حکومت کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش اور ایک مرکزی وزیر کے اشارے پر تالا کھولا گیا تھا، آئندہ کے واقعات و مشاہدات نے واضح کر دیا کہ یہ شہرت بے بنیاد نہیں تھی۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ بغیر مضبوط سیاسی پشت پناہی کے عدالت کو اس طرح سے قانون و انصاف کی دھجیاں اڑانے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔



مسجد کو مسما کر کے اسکی جگہ پر رام مندر بنانے کا مجرمانہ اعلان و سرگرمیاں

مسجد میں عام پوجا پاٹ کی اجازت حاصل ہو جانے سے ہندو اہلیاء پرستوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور اب ایک قدم آگے بڑھا کر مسجد کو منہدم کر کے اس کی جگہ نیا مندر بنانے کی تشدد آمیز جدوجہد شروع کر دی گئی، حکومتوں کے تجاہل اور دورخی پالیسی کی بنا پر انھیں مزید حوصلہ ملا، چنانچہ وشوہندو پریشد کے سربراہ سنگھل نے دھمکی کی زبان میں یہ کھلا اعلان کیا کہ ۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو مندر کا شلانیاس (سنگ بنیاد) ہوگا، اور ملک کی کسی سیاسی پارٹی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ ہمارے اس پروگرام کو روک دے عام ہندوؤں کو ہم نوا بنانے

کی غرض سے پروگرام یوں ترتیب دیا گیا کہ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ء سے ملک گیر شلانیاس پوجن مہم شروع کی جائے جس کے تحت ملک بھر کے پانچ لاکھ پچھتر ہزار گاؤں میں ایک ایک شلانیاس (اینٹ) بھیج کر اس کا پوجن کرایا جائے اور دیواستھان اکاشی (۹ نومبر) کے دن یہ ساری اینٹیں اجودھیا پہنچادی جائیں اور اسی دن رام مندر کا شلانیاس کیا جائے، وشوہندو پریشد وغیرہ جارحیت پسند تنظیمیں اپنے سربراہ کے اعلان کے مطابق شلانیاس پوجن کے نام پر گاؤں گاؤں گھوم کر نفرت و تشدد کا زہر پھیلاتی رہیں اور ہماری سیکولر حکومتیں اپنی خاموشی سے ان کا تعاون کرتی رہیں تا آنکہ کانگریسی حکومت کے وزیر داخلہ نے متعینہ تاریخ یعنی ۹ نومبر کو وشوہندو پریشد کے ہاتھوں متنازعہ اراضی پر شلانیاس کی اجازت دے کر مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ بابری مسجد کے انہدام اور مندر کی تعمیر کا وقت قریب آ گیا ہے، وزیر داخلہ نے اس سلسلہ میں حیرت ناک حد تک گمراہ کن رویہ اختیار کیا، ایک طرف تو وہ اعلان کرتے رہے کہ متنازعہ جگہ پر شلانیاس کی اجازت نہیں دی جائے گی اور دوسری طرف اندر اندر وشوہندو پریشد سے ساز باز بھی کرتے رہے، حکومت کی اس منافقانہ پالیسی نے فرقہ پرست تنظیموں کو اس قدر جری بنا دیا کہ ۲۳ جون ۱۹۹۰ء کو ہری دوار میں ہندو مذہبی لیڈروں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر طے کیا کہ اگست سے اکتوبر تک پورے ملک میں جگہ جگہ جلوس نکالے جائیں، گاؤں گاؤں سے مندر کی تعمیر کے لئے والینٹیر جمع کئے جائیں، اور ۳۰ اکتوبر کو مسجد کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے، اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آر، ایس ایس، بی، جے، پی، وشوہندو پریشد، بجرنگ دل اور ان کی ہم نوا تمام فرقہ پرست پارٹیاں میدان میں نکل پڑیں، بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر لال کرشن ایڈوانی نے سومناٹھ سے اجودھیا تک کی رتھ یا ترا شروع کی، اس رتھ یا ترا میں انتہائی اشتعال انگیز اور دل خراش تقریریں کی گئیں، جس کے نتیجے میں بڑودہ، بنگلور، کرناٹک، مدھیہ پردیش اور یوپی کے بعض اضلاع میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی، لیکن حکومت وقت جس کی اولین و اہم ترین ذمہ داری اپنے شہریوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت ہے خود اپنی حفاظت کے بندوبست اور اپنی جان بچانے کی فکر میں مصروف رہی



بابری مسجد کی المناک شہادت

بھارتیہ جنتا پارٹی اپنی فرقہ پرست ذہنیت کی بنا پر ہمیشہ ہی سے بابری مسجد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اسے غلامی کی علامت قرار دیتی تھی، اب ریاست میں اس کی حکومت تھی اس لئے وہ اس مسجد کو کیونکر برداشت کر سکتی تھی، چنانچہ بھاجپائی وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے وزارت سازی کے بعد جو اولین کام کیا وہ یہ تھا کہ اپنے وزیروں کو ساتھ لے کر اجدھیا آئے اور بابری مسجد میں نصب مورتی کے پاس کھڑے ہو کر یہ عہد کیا کہ ”رام للہ ہم آئیں گے مندر یہیں بنائیں گے“ اس عہد و پیمان کے بعد کلیان سنگھ حکومت نے قانون و انصاف کو نظر انداز کر کے رام مندر کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کی مہم شروع کر دی، بابری مسجد سے ملحق موقوفہ متنازعہ اراضی کو اپنی تحویل میں لے لیا، پھر اسے وشو ہندو پرشید کے حوالہ کر دیا، جس پر مستحکم بنیادوں کے ساتھ پختہ چبوترہ کی تعمیر کا کام نہایت زور و شور کے ساتھ جاری ہو گیا، جبکہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے احکامات تھے کہ متنازعہ جگہ پر کسی قسم کی تعمیر نہ کی جائے، تو یہاں عدالت کا ارتکاب کرتے ہوئے تعمیر ہوتی رہی اور مسلم لیڈران اس غیر قانونی اقدام پر مرکزی سرکار سے احتجاج کرتے رہے، لیکن مرکزی حکومت نے اس وقت تک کوئی مؤثر حرکت نہیں کی جب تک کہ وشو ہندو پریشد نے اپنے منصوبہ کی تکمیل نہ کر لی۔

چبوترہ کی تعمیر کے بعد وزیر اعظم نے فریقین کے درمیان از سر نو مذاکرات کا سلسلہ شروع کر لیا جس کے دو دور حکومت کے ترجمان کے بقول اطمینان بخش اور امید افزا رہے، تیسرے دور کا آغاز ہونے والا ہی تھا کہ اچانک حیرتناک انداز میں وشو ہندو پریشد نے یکطرفہ اعلان کر دیا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۱ء کو کارسیوا ہوگی، ظاہر ہے کہ اس اعلان کے بعد گفت و شنید کی کیا گنجائش تھی، اس لئے یہ سلسلہ ختم ہو گیا، کارسیوا کے اعلان ہوتے ہی ساری فرقہ پرست تنظیمیں حرکت میں آ گئیں۔ بھاجپا کے سابق اور موجودہ صدر ایڈوانی اور جوشی یا ترا

اور جارحیت کا عفریت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم کر آگ و خون کا طوفان برپا کرتا رہا بہر حال اعلان کے مطابق بھاری تعداد میں کارسیوک ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو اجدھیا پہنچ گئے، اور بابری مسجد کو مسمار کرنے کی اپنی جیسی کوششیں بھی کیں، حتیٰ کہ مسجد کے گنبدوں اور دیواروں کو مجروح بھی کر دیا، مگر وزیر اعلیٰ یو پی کے سخت رویہ کی وجہ سے انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے قابل تعریف ہمت و جرأت کا ثبوت دیا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر نہ صرف بابری مسجد کو بچا لیا بلکہ سیکولر اور جمہوری قدروں کی آبرورکھ لی رام بھگت اور کارسیوک کے نام سے اجدھیا میں اکٹھا بلوائی جب بابری مسجد کے انہدام میں ناکام ہو گئے تو انھوں نے اپنا غصہ مسلمانوں پر اتارا، اور پی، اے، سی کے تعاون سے ملک گیر فساد برپا کر دیا جس میں سینکڑوں مسلمان شہید کئے گئے اور ان کی کروڑوں کی جائیدادیں لوٹ لیں، یا نذر آتش کر دی گئیں، وی، پی سنگھ جنھوں نے بھاجپا کے اشتراک سے حکومت بنائی تھی اپنے اقتدار کو بچانے کی غرض سے منافقانہ پالیسی پر عمل پیرا ہے، لیکن ان کا یہ بزدلانہ رویہ ان کی کرسی اقتدار کو نہ بچا سکا، نفرت کی آگ نے ملک کے امن کے ساتھ اسے بھی بھسم کر دیا۔

وی، پی سنگھ سرکار کے خاتمہ کے بعد چندر سیکھر نے زمام اقتدار سنبھالی انھوں نے اپنے عہد حکومت میں یہ کام کیا کہ وشو ہندو پریشد اور اس کی حلیف پارٹیوں کو (جنھوں نے روز اول سے تشدد کی راہ اختیار کر کے نہ صرف مصالحانہ گفت و شنید کا دروازہ بند کر رکھا تھا بلکہ عدالت کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھیں) بات چیت پر راضی کر لیا، چنانچہ ان کے اور ایکشن کمیٹی بابری مسجد کے لیڈروں کے درمیان براہ راست گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا، فریقین نے اپنے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تحریری دلائل بھی فراہم کئے، گفتگو کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ چندر سیکھر حکومت ہی ختم ہو گئی، بالآخر ملک میں ایکشن ہوا جس کے نتیجے میں کلیان سنگھ کی زیر سرکردگی یو پی میں بھاجپا کی حکومت قائم ہوئی اور مرکز میں کانگریس نے سیکولرزم کی علامت نرسمہا راؤ کی قیادت میں حکومت بنائی۔

پر نکل پڑے، تخریب کار عناصر کارسیوک کے نام پر اجدوہیا میں جمع ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک کا ماحول کشیدہ و سراسیمہ ہو گیا۔

یوپی کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے عدالت اور مرکزی حکومت کو حلفیہ اطمینان دلایا کہ کارسیوک صرف علامتی ہوگی، عدالت اور مرکزی حکومت کے حکم کی سرمخلاف ورزی نہیں ہوگی، مرکزی وزیر داخلہ قوم کو اطمینان دلاتے رہے کہ بابر مسجد کی حفاظت کا پورا منصوبہ مرتب کر لیا گیا ہے، سیکولر نواز وزیر اعظم ہند بھی اعلان پر اعلان کرتے رہے کہ بابر مسجد کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے مرکز سے۔ اچھی خاصی تعداد میں فوج بھی اجدوہیا پہنچ گئی مگر اسے نامعلوم مصالح کی بنیاد پر بابر مسجد سے دو ڈھائی کلومیٹر دور رکھا گیا، صوبہ اور مرکز کے نیم فوجی دستے مسجد کی حفاظت کے لئے اس کے چاروں سمت میں متعین کئے گئے مگر انھیں وزیر اعظم کی سخت ہدایت تھی کہ رام بھگتوں پر کسی حال میں بھی گولی نہ چلائی جائے۔

بہر حال ان سارے اعلانات و انتظامات کے سائے میں ۶ دسمبر کی وحشتناک تاریخ آگئی، ایڈوانی، سنگھل، ونے کٹیاری، اوما بھارتی وغیرہ دولاکھ کارسیوکوں کی فوج لئے اجدوہیا کے میدان میں پہلے ہی سے موجود تھے، ان لیڈروں کی رہنمائی میں کارسیوک شروع ہوئی اور تشدد پر آمادہ تربیت یافتہ کارسیوکوں نے گیارہ بج کر پچپن منٹ پر بابر مسجد پر دھاوا بول دیا اور بغیر کسی مزاحمت کے پورے اطمینان سے چار بجے تک اسے توڑتے اور ملکہ کو دوڑھینکتے رہے یہاں تک کہ صفحہ زمین سے بابر مسجد کا نام و نشان ختم کر دیا گیا۔

وزیر داخلہ اور وزیر اعظم کو ایک ایک منٹ کی خبر پہنچتی رہی مگر نہ مسجد کی حفاظت کا مرتبہ منصوبہ رو بہ عمل آیا اور نہ ہی اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا فریضہ ادا کیا گیا، اس طرح ۲۲/۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو بابر مسجد کے خلاف جو تحریک شروع کی گئی تھی، ۶ دسمبر ۱۹۹۱ء کو سیکولرزم و جمہوریت کے زیر سایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔

وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کا منصوبہ چونکہ پورا ہو چکا تھا اس لئے وہ حکومت سے دست بردار ہو گئے، نظم و نسق کی ذمہ داری مرکز کے سر آگئی، صدر راج کا نفاذ ہو گیا، اس کے

باوجود تقریباً ۳۸ گھنٹے تک اجدوہیا مکمل طور پر کارسیوکوں کے تصرف میں رہا جنھوں نے اجدوہیا کی دیگر بہت ساری مسجدوں کو بھی بالکل مسمار کر دیا یا توڑ پھوڑ کر اپنے خیال میں ناقابل استعمال بنا دیا، اور اجدوہیا میں آباد مسلم گھرانوں کو تہس نہس کر ڈالا، اسی وقفہ میں بابر مسجد کی جگہ پر ایک گھر وندا بنا کر مورتی نصب کر دی جس کی پوجا پاب بھی شروع کر دی گئی، رام بھگت جب اپنی رام بھگتی کے سارے کاموں سے باطمینان فارغ ہو گئے تو مرکزی سرکار کے انتظام میں سرکاری سوار یوں کے ذریعہ باعزت طور پر انھیں ان کے ٹھکانوں تک پہنچا دیا گیا۔

مسلمانوں کے مذہبی ناموس پر یہ ایسا حملہ تھا جس کی کرب ناک سے بے چین اور مضطرب ہو کر وہ چیخ اٹھے تو مظلوموں کی یہ پیتا بانہ آہ بھی ہماری سیکولر حکومتوں کو گوارا نہیں ہوئی جس کی سزا میں ہزاروں مسلمانوں کو خون کی موجوں اور آگ کی لہروں میں غرق کر دیا گیا، آج وہ کون سی ریاست ہے جو مظلوم مسلمانوں کے خون سے لہولہا نہیں ہے، وہ کون سا شہر ہے جس کی فضائی قیہوں کی گریہ وزاری، بیواؤں کے نالہ و شیون اور غزدہ ماؤں کی آہ سرد سے کربناک نہیں ہے، جمہوریت اور سیکولرزم کے دعویدار ملک اور ایک سیکولر پارٹی کی حکومت میں اس جماعت پر یہ انسانیت سوز مظالم جس نے ملک کی آزادی میں بے لوث قربانیاں دی ہیں کس قدر شرمناک بات ہے، آخر مسلمان اس ملک کی قربان گاہ پر کب تک بھینٹ چڑھتا رہے گا۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہئے اے ارض وطن جو ترے عارض بے رنگ کو گلزار کریں
کتنی آہوں سے کلیچہ ترا ٹھنڈا ہوگا کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں
سب کچھ لٹ جانے کے بعد وزیر داخلہ ہند صاحب بیان دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انھیں مکمل انصاف ملے گا، وزیر اعظم نے بھی اعلان کیا کہ بابر مسجد دوبارہ تعمیر کرائی جائے گی، مگر اس اعلان پر ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ بمبئی میں مسلمانوں پر شیوسینا کے خونخوار درندے ٹوٹ پڑے، سیکڑوں مسلمان ان کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے، اربوں کھربوں کی ان کی املاک لوٹ لی گئیں یا نذر آتش کر دی گئیں، شیوسینا

نظام امارت فی الہند کی مختصر تاریخ

احیاء دین، اعلاء کلمۃ اللہ اور خدا کی زمین پر خدا ہی کے احکام و فرمان کے نفاذ و اجراء کے لئے نظام امارت و تنظیم جماعت کی ضرورت و اہمیت کو ہمارے اسلاف نے کبھی بھی فراموش نہیں کیا۔ بلکہ حالات نے جب بھی اجازت دی حسب استطاعت اس اہم ترین ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی مخلصانہ جدوجہد کی ہے۔ اور احوال و ظروف کے مطابق بتوفیق ایزدی ملی و مدنی دونوں عہد کی سنتوں کو زندہ کر دکھایا ہے۔ آئندہ صفحات میں اکابر جمہم اللہ کی اسی انقلابی جدوجہد کی مختصر تاریخ پیش کی جا رہی ہے۔ انشاء اللہ اس کے مطالعہ سے شبہات کے پردے ہٹیں گے۔ خدشات کے زخم مندمل ہوں گے مسافران منزل کو حوصلہ ملے گا۔ اور اس راہ کی صعوبتوں کے تصور نے جن کی ہمتیں پست کر دی ہیں۔ ان میں بھی قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ہمت پیدا ہوگی۔

(۱) امارت شرعیہ کی تاسیس

قیام امارت کی ضرورت علمائے اسلام نے اسی وقت محسوس کر لی تھی جبکہ ہندوستان کی مسلم حکومت کا چراغ مفلس کے دیئے کی طرح ٹٹمانے لگا تھا۔ چنانچہ اس عہد کے جماعت علماء کے سربراہ اور خاندان ولی اللہی کے چشم و چراغ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتویٰ دارالرحب و قیام امارت اسی احساس کا جرأت مندانہ اظہار تھا۔ اور اس فتویٰ کو غیر منقسم ہندوستان میں پہلی بار جس جماعت نے عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا وہ بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی ساختہ پر داختہ تھی۔ یعنی حضرت سید احمد شہید بریلوی اور آپ کے رفقاء کا۔ اس اجمال کی تفصیل جناب غلام رسول مہر کی زبانی سنئے۔ مہر صاحب لکھتے ہیں۔

کے یہ درندے عروس البلاد میں درندگی چاٹتے گھومتے رہے اور ہماری حکومت دم سادھے بیٹھی رہی، جب مسلمانوں کا خون پیتے پیتے ان درندوں کا جی بھر گیا تب جا کر بہیمیت کا یہ رقص ختم ہوا، رہا باری مسجد کی تعمیر کا مسئلہ، تو جو حکومت قدیم عمارت کی حفاظت نہ کر سکی اس سے جدید تعمیر کی توقع رکھنی خود اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔

اس وقت تو حکومت تذبذب کا شکار ہے ایک طرف قانون و انصاف کے تقاضے ہیں تو دوسری طرف ووٹ اور کرسی اقتدار کا مسئلہ ہے، اس لئے گھبراہٹ میں کبھی آرڈی منس کا سہارا لے رہی ہے تو کبھی عدالت کی پناہ تلاش کرتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مینی سنٹرل جیل میں بغاوت کے مقدمہ میں اپنا جو تحریری بیان دیا تھا اس کے درج ذیل اقتباس کو تاریخ کے حوالہ کے بغیر پڑھئے، اس کی ایک ایک سطر میں حالات حاضرہ کی عکاسی نظر آئے گی، مولانا آزاد اپنے بیان کے ایک پیرا گراف میں لکھتے ہیں:

”یہ پریشانی گورنمنٹ کو خود اسی کی منافقانہ روش کی وجہ سے پیش آرہی ہے ایک طرف وہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بے دریغ جبر و تشدد کرے، دوسری طرف چاہتی ہے کہ نمائش قانون و عدالت کی آڑ بھی قائم رہے، یہ دونوں باتیں متضاد ہیں، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں نتیجہ یہ ہے کہ اس کی پریشانی و درماندگی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔“

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے اس لئے کہ شریف آدمی آنکھیں بند کر لیں گے، شریف آدمیوں نے سچ مچ آنکھیں بند کر لی ہیں لیکن دنیا کی آنکھیں بند نہیں ہیں، فی الحقیقت ”لا“ اور ”آرڈر“ کا ایک ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں کہہ سکتے ہیں وہ تماشائی کی طرح مضحک بھی ہے اور مقتل کی طرح درد انگیز بھی، لیکن میں ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔“

باری مسجد کی تاریخ کے ساتویں مرحلے کا انتظار کیجئے دیکھئے یہ کب معرض وجود میں

آتا ہے۔ ”لعلّ اللہ یحدث بعد ذلك امرًا“

”سید صاحب سرحد تشریف لائے تھے تو آپ کو یقین ہوگا کہ شرع شریف کے احکام کی پابندی اور اسلامیت پر فداکاری میں اہل سرحد مسلمانان ہند سے فائق و برتر ہونگے، لیکن یہاں پہنچ کر دو برس تک ایک ایک طبقے کے احوال و مراسم دیکھ چکنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اسلام بھی سہی ہے اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اس وقت اہل سرحد کی زندگی جاہلیت کے لواٹھ سے آلودہ تھی لہذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ سر و سامان جہاد کے ساتھ ساتھ انھیں اسلامیت کا پابند بنایا جائے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ جہاد کی بیعت کے ساتھ ساتھ سب سے اقامت شریعت کی بیعت بھی لی جائے پٹھانوں کی اصلاح و تنظیم کے سلسلے میں یہ دو سرا قدم تھا۔

چنانچہ فیصلہ کے مطابق کام کا آغاز کر دیا گیا اور منفرد ہزاروں آدمیوں نے سید صاحب کی اس دعوت کو قبول کر لیا لیکن اصل غرض انفرادی قبول و پزیرائی سے پوری نہیں ہو سکتی تھی ضروری تھا کہ ایک ہمہ گیر نظام پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے علماء و اکابر کا اجتماع ضروری تھا۔ اس اجتماع کیلئے موزوں مقام پختار سمجھا گیا۔ چنانچہ سید صاحب اپنی جماعت کے ساتھ رئیس پختار فتح خاں کی دعوت پر وہاں پہنچے اور پہنچتے ہی بیعت شریعت کیلئے دعوت عام کا سلسلہ شروع کر دیا اس سلسلے میں آپ مختلف بستوں اور قبیلوں میں دورے فرماتے اور علماء و اکابر کو جمع کر کے پابندی احکام اسلام کی ہدایت کرتے، دوروں اور وعظ و نصیحت کے ذریعے سے قبول عام کا جذبہ بیدار ہو گیا تو فیصلہ ہوا کہ پختار میں اجتماع عظیم منعقد کیا جائے۔ جس میں سرحد کے ہر حصے سے علماء و خوانین شریک ہوں یکم شعبان ۱۲۴۲ھ (۶ فروری ۱۸۲۹ء) کی تاریخ اور جمعہ کا دن اس اجتماع کیلئے تجویز ہوا۔ خوانین و اکابر کے علاوہ دو ہزار کے قریب علماء اس موقع پر آئے۔ اتنے ہی ان کے تلامذہ تھے (بعض مکاتب میں ہے قریب ہزار علماء و طلبہ) اس اجتماع میں سید صاحب نے ایک افتتاحی تقریر فرمائی۔ جس کے آخر میں پختار کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر آپ ہماری بات ماننا چاہتے ہیں تو اسی مجمع میں مان لیجئے ورنہ اتحاد کا رشتہ کٹ جائے گا میں خدائے عزوجل کا ایک عاجز بندہ ہوں۔ میری خواہش اس کے سوا کچھ نہیں۔ کہ سب لوگ احکام الہی کے فرمانبردار بن جائیں۔

تقریر پوری کر کے سید صاحب خود مجمع میں سے اٹھ گئے۔ علماء آپس میں مشورے کرتے رہے آخر اس فیصلے پر پہنچے کہ ”نظام شرعی کا قیام“ لازم ہے۔ نماز جمعہ کے بعد سب نے سید صاحب کے ہاتھ پر ”اقامت شریعت“ کے لئے بیعت کی۔

استفتاء اور اس کا جواب

بیعت کے بعد ایک استفتاء علماء کی خدمت میں پیش کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ ”اگر کوئی شخص امام کی بیعت کرنے اور اس کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لینے کے بعد خدمت دین اور اجرائے شرع عین کے سلسلے میں امام کے کسی حکم کو رد کر دے اور مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے؛ بلکہ جدال و قتال میں بھی شامل نہ ہو تو اس کے اور اس کے ساتھیوں کے متعلق شریعت کا فیصلہ کیا ہے؟

علماء نے غور و فکر کے بعد اس کا مفصل جواب مرتب کیا اسکے مطالب کا خلاصہ یہ تھا۔

۱- اثبات امامت کے بعد حکم امام سے سر تابی سخت گناہ اور قبیح جرم ہے۔

۲- مخالفوں کی سرکشی اگر اس پیمانے پر پہنچ جائے کہ قتال کے بغیر اس کا استیصال ممکن نہ رہے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان مخالفوں کی تادیب کے لئے تلواریں نکالیں اور امام کے حکم کو بزدور مخالفوں برنا فرمائیں۔

۳- اس معرکے میں لشکر امام سے جو شخص قتل ہوگا وہ شہید سمجھا جائے گا اور لشکر مخالف کے مقتولین مرد و دونا ری متصور ہوں گے۔

اس فتوے پر علماء سرحد میں سے پچیس افراد کے دستخط تھے۔ (جن کے نام سیرت احمد شہید میں مرقوم ہیں)

اصلاح عام

غالباً ۱۵ شعبان ۱۲۴۲ھ کو جمعہ کے دن (۲۰ فروری ۱۸۲۹ء) پھر ایک اجتماع ہوا جو فتح خاں رئیس پختار کے قبیلے کے افراد پر مشتمل تھا۔ خان نے ان سب کو بیعت کی ترغیب دی

اور انھوں نے بطیب خاطر نظام اسلامی کی پابندی قبول کر لی پھر مختلف علاقوں کیلئے سید صاحب نے قاضی مقرر فرمادیئے۔ مولوی سید محمد حبان کو قاضی القضاة بنایا گیا۔ ملا قطب الدین ننگرہاری کو احتساب کا کام سونپا گیا۔ اور تیس نفی ان کے ساتھ مقرر کئے گئے وہ قریہ فریہ اور دیدیدہ دورہ کرتے رہے۔ جہاں کوئی امر خلاف شرع پاتے اس کا انسداد کرتے۔

نظام امارت کا اثر

راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں پورے علاقے کی کاپلٹ گئی۔ تمام لوگوں نے شریعت کی پابندی اختیار کر لی پٹہ داریاں ٹوٹ گئیں۔ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے۔ اگر ملا قطب الدین کے آدمی دوسرے کام کے سلسلے میں بھی کسی گاؤں میں جاتے تو گاؤں والے دوڑے ہوئے آتے اور بتاتے کہ یہاں کوئی بے نمازی نہیں رہا۔

ایک سوال

کیا بیعت اقامت شریعت کے بعد سید صاحب کے اختیارات فرمانروائی میں کوئی اضافہ ہوا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ بیعت اقامت نے سید صاحب کو نظم قوائے جہاد کا مجاز بنایا تھا۔ بیعت اقامت شریعت کی رو سے وہ اجرائے احکام شرعی کا مرکز بن گئے۔ روسا و خوانین پر صرف اس حد تک پابندیاں عائد ہوئیں جو از روئے شریعت حقہ ضروری تھیں لیکن ان کی ریاستیں اور سرداریاں بدستور قائم رہیں (سیرت احمد شہید ج ۲ ص ۸۳ تا ۸۷ و سید احمد شہید ج ۲ ص ۶۵ تا ۶۵)

ضروری تشبیہ

یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ بیعت شریعت، بیعت جہاد سے الگ ہے۔ چنانچہ غلام رسول مہر صاحب نے بھی اس پر تشبیہ کی ہے۔ وہ بیعت جہاد کی بحث کو ختم کر کے حاشیہ

پر لکھتے ہیں ”یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ بعض سوانح نگاروں نے بیعت امامت جہاد اور بیعت اقامت شریعت کو مخلوط کر دیا ہے۔ حالانکہ دونوں بیعتیں الگ الگ موقعوں پر ہوتی تھیں۔ اور ان میں کم و بیش دو سال دو مہینے کا فصل ہے۔ (ایضاً ج ۱ ص ۳۸۰)

(۲) نظام امارت کی دوبارہ تاسیس

حضرت امام سید احمد شہید کے واقعہ شہادت (۲۴/۲۴/۱۲۳۶ھ) کے بعد باقی ماندہ مجاہدین نے شیخ ولی محمد صاحب پھلتی کو (جو امام شہید کے مخصوص احباب میں تھے) اپنا امیر بنالیا پھر ۱۲۵۰ھ میں جب شیخ نصیر الدین دہلوی داماد حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی (حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی کے مرشد اول) ہجرت مجاہدین کے مرکز استھانہ پہنچے تو تمام مجاہدین نے ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور انھیں اپنا امیر منتخب کر لیا۔ لیکن مجاہدین کی جماعت میں حضرت امام شہید کی غیبت و رجعت کے جدید نظریہ کی وجہ سے اجتماعیت قائم نہ رہ سکی اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ شیخ نصیر الدین دہلوی نے اگرچہ ان کے انتشار و اختلاف کو دور کرنے کی بہت کوشش کی مگر انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کی بناء پر اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد کا وہ سلسلہ جسے امام شہید نے جاری فرمایا تھا اور ان کی شہادت کے بعد منقطع ہو گیا تھا۔ دوبارہ شروع نہ ہو سکا۔ مجاہدین کے اسی انتشار کے زمانہ میں مولانا نصیر الدین دہلوی کا ۱۲۵۶ھ میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد مجاہدین کی قیادت و سیادت کی ذمہ داری مولانا ولایت علی صادق پوری نے سنبھالی۔ چونکہ نظریہ غیبت و رجعت کے مولانا زبردست حامی اور مؤند تھے اور عقیدہ کی رو سے امام شہید کے ظہور کے بعد انھیں کی معیت میں جہاد کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے ان کے عہد امارت میں بھی حضرت امام شہید کے عظیم مقصد کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مجاز چلے گئے تھے انھیں ہندوستان میں دوبارہ اس بابرکت جدوجہد کو دوبارہ شروع کئے جانے کی بڑی تمنا تھی۔ اور اس کی تدبیروں پر اکثر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی بغرض حج و زیارت حرمین شریفین پہنچے اور تقریباً دو سال اس ارض مقدس میں مقیم رہے۔ اس سفر میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی مجلس میں حاضری اور ان سے استفادہ کا خوب خوب موقع ملا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے انہیں جو ہر قابل پا کر ان کی تربیت کی جانب خصوصی توجہ فرمائی اور ہندوستان میں انقلابی جدوجہد کی ہدایات دے کر واپس بھیجا چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے انہیں خطوط پر جن کی ہدایات ”شاہ صاحب“ نے فرمائی تھیں ہندوستان آ کر استاذ الکل مولانا مملوک علی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ کے اشتراک و تعاون کے ساتھ کام شروع کر دیا۔

(ماخوذ از التمهید لتعرف ائمة التجديد۔ تالیف مولانا عبید اللہ سندھی ص ۷۳، ۷۴، ۷۵)

بالآخر ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷ھ میں جب کہ برطانوی سامراج کے ظلم و تشدد کے خلاف برسوں کی سلگتی ہوئی آگ لاوا بن کر پھوٹ پڑی تو ان قافلہ ولی اللہی کے مسافروں نے جو سالوں سے سامان سفر کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے تھانہ بھون کی ایک مسجد میں بیٹھ کر طے کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ”زمین اللہ کی، حکومت بادشاہ کی اور حکم انگریز بہادر کا کے بالمقابل یہ اعلان کیا جائے کہ، زمین اللہ کی، حکومت اللہ کی اور حکم اللہ کا، ظاہر ہے یہ اعلان کوئی معمولی اعلان نہیں تھا بلکہ ایک ایسی جاہر و قاہر حکومت کے خلاف اعلان جنگ تھا جس کی وسیع سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر خوب غور و فکر کرنے کے بعد ایک تنظیم کے تحت یہ انقلابی قدم اٹھایا جائے۔ مزید غور و فکر کی اس لئے بھی ضرورت تھی کہ اپنی ہی جماعت کے ایک بزرگ حضرت مولانا شیخ محمد نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بحالت موجودہ اس اقدام کے شدید مخالف تھے۔ تھانہ بھون کی اسی مسجد میں ایک بار پھر مجلس شوریٰ کے ارکان سر جوڑ کر بیٹھے۔ اس مجلس شوریٰ کا انعقاد کس تاریخ کو ہوا۔ ارباب حل و عقد میں سے کتنے حضرات اس میں شریک ہوئے۔ ان تفصیلات سے تاریخ کا دامن خالی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کے بیان سے صرف درج ذیل اکابر کے

ناموں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، (۲) حضرت حافظ ضامن شہید صاحب (۳) حضرت مولانا شیخ محمد صاحب (۴) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب (۵) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب۔ اول الذکر تین اکابر تو تھانہ بھون ہی میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ البتہ آخر الذکر ہردو بزرگوں کو ان کے گھروں سے بلایا گیا تھا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے کی کارروائی کی تفصیل خود حضرت مدنی قدس سرہ ہی کی زبانی سنی جائے کیونکہ اس سلسلہ الذہب کی آخری کڑی آپ کی قد آور شخصیت تھی۔ اس لئے ان سے زیادہ صحیح رپورٹ کون دے سکتا ہے۔ حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں۔

مجلس شوریٰ کی روداد

جب ہردو حضرات (مولانا نانوتوی و مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما) پہنچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا (چونکہ وہ چچا پیر تھے اس لئے ہمیشہ ان کا ادب کیا جاتا تھا) حضرت کیا وجہ ہے کہ دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں، ہم بالکل بے سروسامان ہیں مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوہ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔ اس پر حافظ ضامن (شہید) صاحب نے فرمایا کہ بس مولانا سمجھ میں آ گیا اور پھر جہاد کی تیاری شروع ہو گئی اور اعلان کر دیا گیا۔

حضرت حاجی صاحب کی امارت پر بیعت اور تنظیم کی تشکیل

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو امام مقرر کیا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا۔ اور حضرت مولانا

رشید احمد گنگوہی کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو مہتمم و میسرہ (فوج کے دائیں و بائیں بازو) کا افسر قرار دیا گیا۔

عام مسلمانوں کی اطاعت گزاری

چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے علم و تقویٰ (تصوف اور تشریح) کا بہت زیادہ شہرہ تھا ان حضرات کے اخلاص اور للہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے، ہمیشہ سے ان کی دین داری اور خدا ترسی دیکھتے رہے تھے اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دئے گئے۔ (نقش حیات ج ۲ ص ۴۲، ۴۳)

اس نظام امارت کا ذکر مولانا عاشق الہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں کیا ہے مگر تذکرۃ الرشید ایسے زمانہ میں ترتیب دی گئی ہے جب کہ واقعہ کو اس کے اصلی رنگ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے مولانا میرٹھی نے اجمال و توریہ سے کام لیا ہے۔ ضرورت تھی کہ بعد کے ایڈیشنوں میں بات و وضاحت کے ساتھ حاشیہ ہی میں صحیح بیان کر دی جاتی مگر ناشرین کی سہل انگاری سے ایسا نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ اس مجمل اور تلیح و توریہ کے پردے میں کہی گئی بات کو ماخذ نہیں بنایا جاسکتا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی سوانح قاسمی بروایت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اس کا تفصیلی تذکرہ لکھا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام اور حضرت قاری صاحب کے بیانات میں جزوی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم نے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی مشہور تصنیف التہمید کے صفحہ ۷۹ پر لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہند نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ مجھ سے بیان کیا تھا مگر حضرت شیخ الہند نے کیا تفصیلات بیان کی تھیں۔ مولانا سندھی اس سے بالکل خاموش۔ کاش کہ مولانا ان تفصیلات

کو بیان کر دیتے تو ممکن تھا کہ اس واقعہ سے متعلق کچھ مزید باتیں منصفہ شہود پر آجائیں۔ بادشاہ دہلی کی گرفتاری اور مجاہدین حریت کی ناکامی کے بعد اس نظام امارت کا شیرازہ بھی منتشر ہو گیا۔ جس کی تفصیلات مذکورہ بالا کتابوں بالخصوص نقش حیات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۳) تنظیم ملت کی تیسری کوشش

اس ناکامی کے بعد اگرچہ حضرت شیخ الہند اپنے پورے عہد میں ”ثمرۃ الترتیب، جمعیت الانصار، نظارۃ المعارف اور ریشمی رومال تحریک کے ذریعہ اسی متاعِ گم شدہ کی بازیافت میں کوشاں رہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی تحریک کا رد عمل اتنا سنگین تھا کہ اس دور میں دین و مذہب کے نام پر کسی تنظیم کی تشکیل تو دور کی بات ہے۔ زبان پر اس کا نام لانا بھی مجرم عظیم تھا۔ اس لئے باقاعدہ طور پر نظام امارت کا قیام تو اس زمانہ میں نہیں ہو سکا۔ پھر بھی حضرت شیخ الہند اپنے مخصوص اور معتمد تلامذہ اور متوسلین سے خفیہ طور پر احیاء دین کے لئے جدوجہد پر بیعت لیتے رہتے تھے۔ بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی بھی انہیں معتمد تلامذہ کی فہرست میں شامل تھے جن سے یہ معاہدہ شرعی ہوا تھا (مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت) لیکن آہستہ آہستہ جب شکوک و شبہات کے بادل کچھ چھٹے یا بالفاظ دیگر جب مجاہدین حریت کے بے درپے حملوں سے برطانوی سامراج کی قوت میں اضمحلال پیدا ہو گیا اور اسیرانِ ظلم و ستم کو کسی حد تک امن و اطمینان کی فضا میں سانس لینے کا موقع نصیب ہوا تو ۶۳ سال کے طویل عرصے کے بعد ۱۹۲۰ء میں اسی بوڑھے مجاہد (جسے درازی عمر، کثرتِ امراض اور مالٹا کی تقریباً تین سالہ قید و بند کی صعوبتوں نے چارپائی پر لٹا دیا تھا۔ لیکن اس کے حوصلے جوان اور عزائم بلند تھے) کی یہ آواز ہمارے کانوں میں گونجتی ہے، میری چارپائی کو اٹھا کر جلسہ گاہ لے چلو۔ پہلا شخص میں ہوں گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ لیکن برہوہم عصری کی چشمک اور منافست کا کہ غیروں نے نہیں بلکہ خود اپنوں نے اس صدائے حیات افزا کو سنی ان سنی کر دیا۔

حضرت سبحان الہند مولانا احمد سعید دہلوی نے اپنی ایک تحریر میں اسی تلخ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”اگر علماء میں مدابنت و منافست نہ ہوتی اور صوفیاء میں ارباباً من دون اللہ بننے کا شوق نہ ہوتا تو آج تمام ہندوستان ایک شرعی امیر کے تحت زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ اور اسلام کی حقیقی برکات سے متمتع ہوتا۔ ان کی روح حکومت کی غلامی سے آزاد ہوتی اگرچہ جسم غلامی میں مقید ہوتا۔“ (حیات سجاد ص ۱۰۷)

قصہ مختصر جب جمعیت علماء کے دوسرے اجلاس میں حضرت شیخ الہند جیسی عظیم و ہمہ گیر شخصیت کی موجودگی اور ان کی شدید خواہش کے باوجود علمائے ذی مراتب امیر الہند کے انتخاب پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تو مولانا ابوالحسن نے اپنی بصیرت سے اسی وقت بھانپ لیا کہ امیر الہند کا مسئلہ حل طے ہونے والا نہیں ہے۔ اس لئے انھوں نے صوبائی پیمانے پر نظام امارت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور اپنے صوبہ بہار میں اس کی داغ بیل ڈالنے کی مہم شروع کر دی۔ چنانچہ ۲۳، ۲۴ شعبان ۱۹۳۹ء (۲، ۳ مئی ۱۹۲۱ء) کو درجہ گنگہ میں جمعیت علماء صوبہ کے اجلاس عام کے موقع پر یہ تجویز منظور کی گئی۔

”صوبہ بہار و اڑیسہ (اس وقت اڑیسہ مستقل صوبہ نہیں بنا تھا بلکہ صوبہ بہار ہی کا ایک جزء تھا) کے محکمہ شرعیہ کے لئے ایک عالم مقتدر شخص امیر منتخب کیا جائے جس کے ہاتھ میں تمام محکمہ شرعیہ کی باگ ہو اور اس کا ہر حکم مطابق شریعت ہر مسلمان کیلئے واجب العمل ہو۔ نیز تمام علماء و مشائخ اس کے ہاتھ پر خدمت و حفاظت اسلام کے لئے بیعت کریں۔ جو جمع و طاعت کی بیعت ہوگی۔ جو بیعت طریقت سے الگ ایک ضروری اور اہم چیز ہے۔ جمعیت متفقہ طور پر تجویز کرتی ہے کہ انتخاب امیر کیلئے ایک خاص اجلاس علماء بہار کا بمقام پٹنہ وسط شوال میں کیا جائے۔“ (تاریخ امارت ص ۵۸، ۵۹)

حسب تجویز ۱۸، ۱۹، ۲۰ شوال ۱۳۳۹ھ (۲۵، ۲۶ جون ۱۹۲۰ء) کو یہ اجلاس پتھری مسجد پٹنہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں مولانا آزاد سبحانی اور

مولانا سبحان اللہ خاں کے علاوہ سو سے زیادہ صوبہ بہار کے علماء شریک تھے۔ چنانچہ اسی اجلاس کی دوسری نشست میں بالاتفاق شرکائے اجلاس مولانا شاہ بدر الدین پھلواری کو امیر شریعت صوبہ بہار۔ اور مولانا ابوالحسن محمد سجاد صاحب کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا مبارک دن تھا جس میں باقاعدہ امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا سلسلہ بحمد اللہ آج تک جاری ہے اب تک یکے بعد دیگرے امارت کے منصب پر چار امراء کا انتخاب ہو چکا ہے اور یہ سب جمعیت علماء ہی کی نگرانی میں ہوا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

(۴) ایک اور صوبہ میں امیر کا انتخاب

صوبہ بہار میں انتخاب امیر اور نظام امارت کے قیام کے بعد، حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کی انجمن ”خدا م الدین“ کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۶ء کے موقع پر جس میں حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا حسین علی کچھراواں، حضرت مولانا علامہ محمد یوسف بنوری، مولانا ظفر علی خاں، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ پانچ سو سے زائد علماء کرام شریک تھے۔ حضرت محدث کشمیری کی تحریک پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت منتخب کیا گیا اور پہلی بیعت خود حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نے کی تھی۔ اس کے بعد بیعت عامہ ہوئی۔ (ماہنامہ ”الرشید“ ساہیوال شمارہ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۲ھ)

اس امارت کے متعلق اس سے زیادہ معلومات پر سردست دسترس حاصل نہیں ہوئی۔ یہ ہے ہندوستان میں نظام امارت کے قیام کی مختصر تاریخ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اکابر اور بزرگوں نے اس شرعی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ہر دور میں حسب استطاعت جدوجہد فرمائی ہے۔ (خدا رحمت کندا میں عاشقان پاک طینت را)

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اسلاف و اکابر کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق اور حوصلہ عطا فرمائے۔

باب ﴿۶﴾
تذکره ارباب فضل و کمال

امام ابوحنیفہ اور علم حدیث

امام ابوحنیفہ کی تابعیت

امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت متوفی ۱۵۰ھ رحمہ اللہ کی جلالتِ قدر و عظمت شان کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ تابعیت کے عظیم دینی اور روحانی شرف کے حامل ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی یہ ایسی فضیلت ہے جس نے انہیں اپنے معاصر — فقہا و محدثین میں اسناد عالی کی حیثیت سے ممتاز کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر ہیتمی لکھتے ہیں۔

”إنه أدرك جماعة من الصحابة كانوا بالكوفة بعد مولده بها سنة ثمانين فهو من طبقة التابعين ولم يثبت ذلك لأحد من أئمة الأمصار المعاصرين له كالأوزاعي بالشام، والحماديين بالبصرة، والثوري بالكوفة ومالك بالمدينة المشرفة، والليث بن سعد بمصر“ (۱)

امام ابوحنیفہ نے اپنی پیدائش سن ۸۰ھ کے بعد صحابہ کی ایک جماعت کا زمانہ پایا ہے جو کوفہ میں تھے اس لیے وہ تابعین کے طبقہ میں ہیں، اور یہ شرف ان کے معاصر محدثین و فقہاء جیسے شام میں امام اوزاعی، بصرہ میں امام حماد بن سلمہ، امام حماد بن زید، کوفہ میں امام سفیان ثوری، مدینہ میں امام مالک، اور مصر میں امام لیث بن سعد کو حاصل نہیں ہو سکا۔

حافظ الدین امام ابن حجر عسقلانی نے بھی ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے امام ابوحنیفہؒ کی تابعیت کو دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے ان کے الفاظ ملاحظہ کیجئے!

(۱) الخيرات المحسان فصل سادس ص: ۲۱، از علامہ ابن حجر ہیتمی مکی۔

أدرك الإمام أبوحنيفة جماعة من الصحابة لأنه ولد بالكوفة سنة ثمانين من الهجرة وبها يومئذ من الصحابة عبدالله بن أبي أوفى فإنه مات بعد ذلك بالاتفاق، وبالبصرة يومئذ أنس بن مالك ومات سنة تسعين أو بعدها، قد أورد ابن سعد بسند لا بأس به أن أبا حنيفة رأى أنساً وكان غير هذين في الصحابة بعده من البلاد احياء.

وقد جمع بعضهم جزءاً فيما ورد من رواية أبي حنيفة عن الصحابة لكن لا يخلو اسنادها من ضعف والمعتمد على ادراكه ما تقدم وعلى رويته لبعض الصحابة ما أورده ابن سعد في الطبقات، فهو بهذا الاعتبار من طبقه التابعين. (۱)

امام ابوحنیفہ نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا ہے کیونکہ آپ کی ولادت ۸۰ھ میں کوفہ میں ہوئی اور اس وقت وہاں صحابہ میں سے عبداللہ بن ابی اوفی موجود تھے کیونکہ ان کی وفات بالاتفاق ۸۰ھ کے بعد ہوئی ہے، اور ان دنوں بصرہ میں انس بن مالک موجود تھے اس لیے کہ ان کی وفات ۹۰ھ یا اس کے بعد ہوئی ہے اور ابن سعد نے اسی سند سے جس میں کوئی خرابی نہیں ہے بیان کیا کہ امام ابوحنیفہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے، نیز ان دنوں اصحاب کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ مختلف شہروں میں بقید حیات تھے اور بعض علماء نے امام ابوحنیفہ کی صحابہ سے روایت کردہ احادیث کو ایک خاص جلد میں جمع کیا ہے، لیکن ان کی سندیں ضعف سے خالی نہیں ہیں، امام ابوحنیفہ کا صحابہ کے زمانے کو پانے کے متعلق قابل اعتماد بات وہی ہے جو گزر چکی ہے اور بعض صحابہ کو دیکھنے کے بارے میں قابل اعتماد بات وہ ہے جس کو ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے، لہذا اس اعتبار سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعین کے طبقہ میں سے ہیں الخ۔

علامہ ہیتمی مکی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے علاوہ امام دارقطنی، حافظ ابو نعیم اصبہانی،

(۱) تبیض الصحیفة ص: ۲۵، ۲۶، ۱، حافظ سیوطی مطبوعہ کراچی ۱۲۱۸ھ

حافظ ابن عبدالبر، امام خطیب بغدادی، ابن الجوزی، امام سمعانی، حافظ عبدالغنی مقدسی، سبط ابن الجوزی، حافظ زین الدین عراقی، ولی الدین عراقی، ابن الوزیر یمنی، وغیرہ ائمہ حدیث نے بھی امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تابعیت کا اقرار و اعتراف کیا ہے۔

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء

طلب حدیث کے لیے اسفار

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فقہ و کلام کے علاوہ بطور خاص حدیث پاک کی تعلیم و تحصیل کی تھی اور اس کے لئے حضرات محدثین کی روش کے مطابق اسفار بھی کئے چنانچہ امام ذہبی جو رجال علم و فن کے احوال و کوائف کی معلومات میں ایک امتیازی شان کے مالک ہیں اپنی مشہور اور انتہائی مفید تصنیف ”سیر اعلام النبلاء“ میں امام صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں و عنی بطلب الآثار و ارتحل فی ذلك (۱) امام صاحب نے طلب حدیث کی جانب خصوصی توجہ کی اور اس کے لئے اسفار کئے۔

مزید یہ بھی لکھتے ہیں:

ان الامام ابا حنیفة طلب الحدیث و اکثر منه سنة مئة و بعدها. (۲)
امام ابوحنیفہؒ نے حدیث کی تحصیل کی بالخصوص ۱۰۰ھ اور اس کے بعد کے زمانہ میں اس اخذ و طلب میں بہت زیادہ سعی کی۔

امام ذہبی کے بیان ”وارتحل فی ذلك“ کی قدرے تفصیل صدر الائمہ موفق بن احمدؒ نے اپنی مشہور جامع کتاب ”مناقب الامام الاعظم میں ذکر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کوئی نے طلب علم میں بیس مرتبہ سے زیادہ بصرہ کا سفر کیا تھا اور اکثر سال، سال بھر کے قریب قیام رہتا تھا۔“ (۳)

(۱) سیر اعلام النبلاء ۶/۳۹۲۔

(۲) سیر اعلام النبلاء ۶/۳۹۶۔

(۳) مناقب الامام الاعظم ۱/۵۹۔

اس زمانے میں سفر حج بھی افادہ و استفادہ کا ایک بڑا ذریعہ تھا کیونکہ بلاد اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے ارباب فضل و کمال حرمین شریفین میں آکر جمع ہوتے تھے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ امام ابوالحسن مرغینانی نے بالسند نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے بچپن حج کئے تھے۔ تاریخ اسلام میں یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اسے مبالغہ آمیز تصور کیا جائے کیونکہ متعدد شخصیتوں کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں جن کی حج کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے چنانچہ امام ابن ماجہ کے شیخ علی بن منذر نے اٹھاون حج کئے تھے اور ان میں اکثر پانچاویں حج تھے۔ (۱) محدث سعید بن سلیمان ابو عثمان واسطی نے ساٹھ حج کئے تھے (۲) اور حافظ عبدالقادر قرشی نے جواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ میں امام سفیان بن عیینہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے ستر حج کئے تھے۔

علاوہ ازیں ۱۳۰ھ سے خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ تک جس کی مدت چھ سال کی ہوتی ہے آپ کا مستقل قیام مکہ معظمہ ہی میں رہا۔ (۳)

ظاہر ہے کہ اس دور کے طریقہ رائج کے مطابق دوران حج اور اس چھ سالہ مستقل قیام کے زمانہ میں آپ نے شیوخ حرمین شریفین اور واردین و صادرین اصحاب حدیث سے خوب خوب استفادہ کیا ہوگا طلب علم کے اسی والہانہ اشتیاق اور بے پناہ شغف کا ثمرہ ہے کہ آپ کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی۔ (۴) پھر ان چار ہزار اساتذہ سے آپ نے کس قدر احادیث حاصل کیں اس کا کچھ اندازہ مشہور امام حدیث حافظ مسعر بن کدام کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جسے امام ذہبی نے ”مناقب امام ابی حنیفہ و صاحبیہ“ میں نقل کیا ہے۔

(۱) سنن ابن ماجہ باب صید الکلب۔

(۲) مناقب امام احمد از ابن الجوزی ص ۳۸۷۔

(۳) عقود الجمان از مؤرخ کبیر و محدث امام محمد بن یوسف الصالحی الشافعی ص ۳۱۲۔

(۴) عقود الجمان میں امام صالحی نے الباب الرابع فی ذکر بعض شیوخہ کے تحت ۲۲ صفحات میں شیوخ امام اعظم کے

اسماء ذکر کئے ہیں۔

علم حدیث میں مہارت و امامت

امام مسعر بن کدام جو اکابر حفاظ حدیث میں ہیں امام صاحب کی جلالت شان کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

طلبت مع ابی حنیفة الحدیث فغلبننا، واخذنا فی الزهد فبرع علینا
وطلبنا معہ الفقه فجاء ماترون (۱)

”میں نے امام ابوحنیفہ کی رفاقت میں حدیث کی تحصیل کی تو وہ ہم پر غالب رہے اور زہد و پرہیزگاری میں مصروف ہوئے تو اس میں بھی وہ فائق رہے اور فقہ ان کے ساتھ شروع کی تو تم دیکھتے ہو کہ اس فن میں کمالات کے کیسے جو ہر دکھائے۔“

یہ مسعر بن کدام وہ بزرگ ہیں جن کے حفظ و اتقان کی بناء پر امام شعبہ انہیں مصحف کہا کرتے تھے (۲) اور حافظ ابو محمد راہر مزنی نے اصول حدیث کی اولین جامع تصنیف المحذث الفاضل میں لکھا ہے کہ امام شعبہ اور امام سفیان ثوری میں جب کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تو دونوں کہا کرتے کہ ”اذھبنا الی المیزان مسعر“ ہم دونوں کو مسعر کے پاس لے چلو جو فن حدیث کے میزان علم ہیں، ذرا غور تو فرمائیے کہ امام شعبہ اور امام سفیان ثوری دونوں امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں پھر ان دونوں بزرگ کی میزان جس ذات کے بارے میں یہ شہادت دے کہ وہ علم حدیث میں ہم پر فوقیت رکھتی ہے اس شخصیت کا فن حدیث میں پایہ کیا ہوگا۔

مشہور امام تاریخ و حدیث حافظ ابوسعید معانی کتاب الانساب میں امام صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

اشتغل بطلب العلم وبالغ فیہ حتی حصل له مالم یحصل لغيره (۳)

(۱) مناقب ذہبی ص: ۲۷۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ از امام ذہبی ۱/۱۸۸۔

(۳) کتاب الانساب طبع لندن ورق ۱۹۶۔

”امام ابوحنیفہ طلب علم مشغول ہوئے تو اس درجہ غایت انہماک کے ساتھ ہوئے کہ جس قدر علم انہیں حاصل ہوا دوسروں کو نہ ہوسکا۔“

غالباً امام صاحب کے اسی کمال علمی کے اعتراف کے طور پر امام احمد بن حنبل اور امام بخاری کے استاذ حدیث شیخ الاسلام حافظ ابو عبد الرحمن مقرئ جب امام صاحب سے کوئی حدیث روایت کرتے تو اس الفاظ کے ساتھ روایت کرتے تھے اخبرنا شاہنشاہ ہمیں علم حدیث کے شہنشاہ نے خبر دی۔ یہ حافظ ابو عبد الرحمن مقرئ امام ابوحنیفہ کے خاص شاگرد ہیں اور امام صاحب سے نو سو (۹۰۰) حدیثیں سنی ہیں جیسا کہ علامہ کردی مناقب الامام الاعظم (ج ۲ ص ۲۱۶ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد) میں لکھتے ہیں عبد اللہ بن یزید المقرئ (ابو عبد الرحمن) سمع من الإمام تسع مائة حدیث۔

اسی بات کا اعتراف محدث عظیم حافظ یزید بن ہارون نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

کان ابو حنیفة نقیاء، زاہداً عالمماً صدوق اللسان احفظ اهل زمانه (۱)
امام ابوحنیفہ پاکیزہ سیرت، متقی، پرہیزگار، صداقت شعار اور اپنے زمانہ میں بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔

امام ابوحنیفہ کے علوم و قرآن و حدیث میں امتیازی تبحر اور وسعت معلومات کا اعتراف امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن سعید القطان نے ان واقع الفاظ میں کیا ہے۔ إنه والله لأعلم هذه الامة بما جاء عن الله ورسوله (۲)

”بخدا ابوحنیفہ اس امت میں خدا اور اس کے رسول سے جو کچھ وارد ہوا ہے اس کے سب سے بڑے عالم تھے۔“

امام بخاری کے ایک اور استاذ حدیث امام کی بن ابراہیم فرماتے ہیں۔

کان أبو حنیفة زاہداً، عالمماً، راغباً فی الآخرة صدوق اللسان احفظ اهل

زمانه (۳)

(۱) اخبار ابی حنیفة واصحابہ از ہمیری ص ۳۶۔

(۲) مقدمہ کتاب التعلیم از مسعود بن شیبہ سندھی بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۶۷، از محقق کبیر علامہ محمد

عبدالرشید نعمانی۔ (۳) مناقب الامام الاعظم از صدر الائتہ موفق بن احمد کی۔

”امام ابوحنیفہ، پرہیزگار، عالم، آخرت کے راغب، بڑے راست بازار اور اپنے معاصرین میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔“

امام ابوحنیفہؒ کی حدیث میں کثرت معلومات کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ امام صاحب نے حدیث پاک میں اپنی اولین تالیف کتاب الآثار کو چالیس ہزار احادیث کے مجموعہ سے منتخب کر کے مرتب کیا ہے۔ چنانچہ صدر الائمہ موفق بن احمد کی محدث کبیر امام الائمہ بکر بن محمد زرنجری متوفی ۵۱۲ھ کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

وانتخب ابوحنیفۃ رحمہ اللہ الآثار من اربعین الف حدیث. (۱)

”امام ابوحنیفہ نے کتاب الآثار کا انتخاب چالیس ہزار احادیث سے کیا ہے۔“

پھر اسی کے ساتھ امام حافظ ابویحییٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری متوفی ۲۹۸ھ کا یہ بیان بھی پیش نظر رکھئے جسے انھوں نے اپنی کتاب مناقب ابی حنیفہ میں خود امام اعظم سے بہ سند نقل کیا ہے کہ:

عندی صنایق الحدیث ما أخرجت منهما إلا اليسیر الذی ینتفع بہ (۲)

”میرے پاس حدیث کے صندوق کے صندوق بھرے ہوئے موجود ہیں مگر میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں جن سے لوگ نفع اٹھائیں۔“

اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ ان صندوقوں کی تعداد کیا تھی اور ان میں احادیث کا کس قدر ذخیرہ محفوظ تھا۔ لیکن اس سے اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمہ والغفر ان کثیر الحدیث ہیں اور یار لوگوں نے جو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ حدیث کے باب میں امام صاحب تہی دامن تھے اور انھیں صرف سترہ حدیثیں معلوم تھیں یہ ایک بے بنیاد الزام ہے جو علمی دنیا میں قطعاً غیر معروف ہے۔ اور بازاری افسانوں سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

(۱) مناقب الامام الاعظم ۱/۹۵۔

(۲) مناقب الامام الاعظم ۱/۹۵۔

ضروری تنبیہ

اس موقع پر یہ علمی نکتہ پیش نظر رہے کہ یہ چالیس ہزار متون حدیث کا ذکر نہیں بلکہ اسانید کا ذکر ہے پھر اس تعداد میں صحابہ و اکابر تابعین کے آثار و اقوال بھی داخل ہیں کیونکہ سلف کی اصطلاح میں ان سب کے لئے حدیث و اثر کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

امام صاحب کے زمانہ میں احادیث کے طرق و اسانید کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی بعد کو امام بخاری، امام مسلم وغیرہ کے زمانہ میں سندوں کی یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی کیونکہ ایک شیخ نے کسی حدیث کو مثلاً دس تلامذہ سے بیان کیا تو اب محدثین کی اصطلاح کے مطابق یہ دس سندیں شمار ہوں گی، اگر آپ کتاب الآثار اور موطا امام مالک کی احادیث کی تخریج دیگر کتب حدیث کی احادیث سے کریں تو ایک ایک متن کی دسیوں بیسیوں سندیں مل جائیں گی۔

حافظ ابو نعیم اصفہانی نے مسند ابی حنیفہ میں بسند متصل یحییٰ بن نصر کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

دخلت علی ابی حنیفۃ فی بیت مملوء کتباً فقلت: ما ہذہ؟ قال ہذہ احادیث کلھا وما حدثت بہ الا اليسیر الذی ینتفع بہ (۱)

”میں امام ابوحنیفہ کے یہاں ایسے مکان میں داخل ہوا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ان کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا یہ سب کتابیں حدیث کی ہیں اور میں نے ان سے تھوڑی سی حدیثیں بیان کی ہیں جن سے نفع اٹھایا جائے۔“

مشہور محدث ابومقاتل حفص بن مسلم امام ابوحنیفہؒ کی فقہ و حدیث میں امامت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

وکان أبوحنیفۃ إمام الدنیا فی زمانہ فقہا وعلما وورعاً قال: وکان

(۱) الانقضاء حافظ عبدالبرص ۳۱۹ مطبوعہ دارالبشائر الاسلامیہ بیروت ۱۴۱۷ھ

أبو حنيفة محنة يعرف به أهل البدع من الجماعة ولقد ضرب بالسياط على الدخول في الدنيا لهم فابى (۱)

امام ابوحنيفہ اپنے زمانہ میں فقہ وحدیث اور پرہیزگاری میں امام الدنیا تھے۔ ان کی ذات آزمائش تھی جس سے اہل سنت والجماعت اور اہل بدعت میں فرق و امتیاز ہوتا تھا انھیں کوڑوں سے مارا گیا تاکہ وہ دنیا داروں کے ساتھ دنیا میں داخل ہو جائیں (کوڑوں کی ضرب برداشت کر لی) مگر دخول دنیا کو قبول نہیں کیا۔

حفص بن مسلم کے قول ”وكان أبو حنيفة محنة يعرف به أهل البدع من الجماعة“ (امام ابوحنيفہ آزمائش تھے ان کے ذریعہ اہل سنت اور اہل بدعت میں تمیز ہوتی تھی) کی وضاحت امام عبدالعزیز ابن ابی رواد کے اس قول سے ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں: أبو حنيفة المحنة من أحب أبا حنيفة فهو سني ومن أبغض فهو مبتدع (۲) ”امام ابوحنيفہ آزمائش ہیں جو امام صاحب سے محبت رکھتا ہے وہ سنی ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ بدعتی ہے۔“

مؤرخ کبیر شیخ محمد بن یوسف صاکی اپنی معتبر، مقبول اور جامع کتاب ”عقود الجمان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنيفة النعمان“ میں امام صاحب کی عظیم محدثانہ حیثیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اعلم رحمك الله أن الإمام أبا حنيفة رحمه الله تعالى من كبار حفاظ الحديث وقد تقدم انه اخذ عن أربعة آلاف شيخ من التابعين وغيرهم وذكره الحافظ الناقد ابو عبدالله الذهبي في كتابه الممتع طبقات الحفاظ من المحدثين منهم ولقد اصاب وأجاد، ولولا كثرة اعتنائه بالحديث ماتهياله استنباط مسائل الفقه فانه أول من استنبطه من الأدلة ۱هـ (۳)

(۱) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ از امام صمیری ص ۹۹۔

(۲) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ از امام صمیری ص ۹۹۔ (۳) عقود الجمعان ص ۳۱۹۔

”معلوم ہونا چاہئے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کبار حفاظ حدیث میں سے ہیں اور اگلے صفحات میں یہ بات گزر چکی ہے کہ امام صاحب نے چار ہزار شیوخ تابعین وغیرہ سے تحصیل علم کیا ہے اور حافظ ناقد امام ذہبی نے اپنی مفید ترین کتاب تذکرۃ الحفاظ میں حفاظ محدثین میں امام صاحب کا بھی ذکر کیا ہے (جو امام صاحب کے حافظ حدیث ہونے کی بڑی پختہ دلیل ہے) ان کا یہ انتخاب بہت خوب اور نہایت درست ہے اگر امام صاحب تکثیر حدیث کا مکمل اہتمام نہ کرتے تو مسائل فقہیہ کے استنباط کی استعداد ان میں نہ ہوتی جبکہ دلائل سے مسائل کا استنباط سب سے پہلے انھوں نے ہی کیا ہے۔“

علم حدیث میں امام صاحب کے اسی بلند مقام و مرتبہ کی بناء پر اکابر محدثین اور ائمہ حفاظ کی جماعت میں عام طور پر امام اعظم کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام الحدیث ابو عبد اللہ الحاکم اپنی مفید و مشہور کتاب ”معرفة علوم الحديث“ کی انچاسویں (۴۹) نوع کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

هذا النوع من هذه العلوم معرفة الائمة الثقات المشهورين من التابعين وأتباعهم ممن يجمع حديثهم للحفظ والمذاكرة والتبرك بذكرهم من الشرق الى الغرب.

”علوم حدیث کی یہ نوع مشرق و مغرب کے تابعین اور اتباع تابعین میں سے مشہور ائمہ ثقات کی معرفت اور ان کے ذکر میں ہے جن کی بیان کردہ احادیث حفظ و مذاکرہ اور تبرک کی غرض سے جمع کی جاتی ہیں۔“

پھر اس نوع کے تحت بلاد اسلامیہ کے گیارہ علمی مراکز مدینہ، مکہ، مصر، شام، یمن، یمامہ، کوفہ، جزیرہ، بصرہ، واسط، خراسان کے مشاہیر ائمہ حدیث کا ذکر کیا ہے۔

۱- محدثین مدینہ میں سے امام محمد بن مسلم زہری، محمد بن الکنند رقرشی، ربیعہ بن ابی عبد الرحمن الرائی، امام مالک بن انس، عبد اللہ بن دینار، عبید اللہ بن عمر بن حفص عمری، عمر

بن عبدالعزیز، سلمہ بن دینار، جعفر بن محمد الصادق وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۲- محدثین مکہ میں سے ابراہیم بن میسرہ، اسماعیل بن امیہ، مجاہد بن جبر، عمرو بن دینار، عبدالملک بن جریج، فضیل بن عیاض وغیرہ کے اسماء ذکر کئے ہیں۔

۳- محدثین مصر میں سے عمرو بن الحارث، یزید بن ابی حبیب، عیاش بن عباس القتبانی، عبدالرحمن بن خالد بن مسافر، حیوۃ بن شریح الجبلی، رزق بن حکیم الایلی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

۴- محدثین شام میں سے عبدالرحمن بن عمرو الاوزاعی، شعیب بن ابی حمزہ الحمصی، رجاء بن حیوۃ الکنذری، امام کحول (الفقیہ) وغیرہ کے اسماء بیان کئے گئے ہیں۔

۵- اہل یمن میں سے ہمام بن منبہ، طاؤس بن کیسان، ضحاک بن فیروز دیلمی، شریح بن کلیب صنعانی وغیرہ کے نام لئے ہیں۔

۶- محدثین یمامہ میں سے یحییٰ بن ابی کثیر، ابوکثیر یزید بن عبدالرحمن الجبلی، عبداللہ بن بدر یمانی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۷- محدثین کوفہ میں سے عامر بن شراحیل الشعمی، ابراہیم نخعی، ابواسحاق السبعمی، عون بن عبداللہ، موسیٰ بن ابی عائشہ الہمدانی، سعید بن مسروق الثوری، الحکم بن عتیبہ الکنذری، حماد بن ابی سلیمان (شیخ امام ابوحنیفہ) منصور بن المعتمر السلمی، زکریا بن ابی زائدہ الہمدانی، مسعر بن کدام الہلالی، امام ابوحنیفہ النعمان بن ثابت الیثمی، سفیان بن سعید الثوری، الحسن بن صالح بن حنی، حمزہ بن حبیب الزیاتی، زفر بن الہذیل (تلمیذ امام ابوحنیفہ) وغیرہ کا نام لیا ہے۔

۸- محدثین جزیرہ میں سے میمون بن مہران، کثیر بن مرة حضرمی، ثور بن یزید ابوخالدرحبی، زہیر بن معاویہ، خالد بن معدان العابد وغیرہ کے اسماء ذکر کئے ہیں۔

۹- اہل بصرہ کے محدثین میں سے ایوب بن ابی تمیمۃ السخنی، معاویہ بن قرۃ مرنی، عبداللہ بن عون، داؤد بن ابی ہند، شعبہ بن الحجاج (امام الجرح والتعدیل) ہشام بن حسان، قتادہ بن دعامة سدوسی، راشد بن شیح حمانی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۰- اہل واسط میں سے یحییٰ بن دینار رمانی، ابوخالدریزید بن عبدالرحمن دالانی، عوام بن حوشب وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۱۱- محدثین خراسان میں سے عبدالرحمن بن مسلم، عتیبہ بن مسلم، ابراہیم بن ادہم الزاہد، محمد بن زیاد وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ (۱)

اس نوع میں امام حاکم نے پانچ سو سے زائد ان ثقات ائمہ حدیث کا ذکر کیا ہے جن کی مرویات محدثین کے یہاں اہمیت کی حامل ہیں اور انہیں جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور ان ائمہ حدیث میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ذکر ہے، کیا اس کے بعد بھی امام صاحب کے حافظ حدیث بلکہ کبار حفاظ حدیث میں ہونے کے بارے میں کسی تردید کی گنجائش رہ جاتی ہے؟

اسی طرح امام ذہبی جو بقول حافظ ابن حجر عسقلانی نقد رجال میں استقرء تام کے مالک تھے۔ اپنی اہم ترین و مفید ترین تصنیف سیر اعلام النبلاء میں امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے تذکرہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کے قول ”العلم یدور علی ثلثۃ مالک، واللیث وابن عیینہ“

(علم حدیث تین بزرگوں امام مالک، امام لیلیث بن سعد اور امام سفیان بن عیینہ پر دائر ہے) کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

قلت بل وعلی سبعة معهم، وهم الاوزاعی، الثوری، معمر، وأبوحنیفہ، وشعبۃ، والحمادان (۲)

میں کہتا ہوں کہ ان تینوں مذکورہ ائمہ حدیث کے ساتھ مزید سات بزرگوں یعنی امام اوزاعی، امام ثوری، امام معمر، امام ابوحنیفہ، امام شعبہ، امام حماد بن سلمہ اور امام حماد بن زید پر علم دائر ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں امام ذہبی ان کا برائمہ حدیث کے زمرہ میں جن پر علوم حدیث

(۱) معرفۃ علوم الحدیث از امام حاکم نیساپوری ص ۲۴۰-۲۴۹۔

(۲) سیر اعلام النبلاء ۸/۹۴۔

دائر ہے امام ابوحنیفہ کو بھی شمار کر رہے ہیں امام صاحب کے کبار محدثین کے صف میں ہونے کی یہ کتنی بڑی اور معتبر شہادت ہے اس کا اندازہ اہل علم کر سکتے ہیں۔

نیز اسی سیر اعلام النبلاء میں مشہور امام حدیث یحییٰ بن آدم کے تذکرہ میں محمود بن غیلان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

”سمعت أبا أسامة يقول كان عمر في زمانه رأس الناس وهو جامع وكان بعده ابن عباس في زمانه وبعده الشعبي في زمانه وكان بعده سفیان الثوري وكان بعد الثوري يحيى بن آدم“

محمود بن غیلان کہتے ہیں کہ میں نے ابواسامہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عہد میں علم و اجتہاد کے اعتبار سے لوگوں کے سردار تھے اور وہ جامع فضائل تھے۔ اور ان کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ میں، اور ان کے بعد امام شععی اپنے زمانہ میں اور امام شععی کے بعد سفیان ثوری اپنے زمانہ میں اور ان کے بعد یحییٰ بن آدم اپنے زمانے میں علم و اجتہاد کے امام تھے۔

اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس بارے میں امام ذہبی نے اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

قلت: قد كان يحيى بن آدم من كبار أئمة الاجتهاد، وقد كان عمر كما قال في زمانه ثم كان علي، وابن مسعود، ومعاذ، وابو الدرداء، عم كان بعدهم في زمانه زيد بن ثابت، وعائشه و ابو موسى، ابو هريرة، ثم كان ابن عباس وابن عمر، ثم علقمة، ومسروق، وابو ادريس، وابن المسيب، ثم عروة، والشعبي، والحسن، و ابراهيم النخعي، ومجاهد، وطاؤس، وعدة، ثم الزهري، وعمر بن عبدالعزيز، وقتادة، وأيوب، ثم الأعمش، وابن عون، وابن حريج، وعبيد الله بن عمر، ثم الأوزاعي، وسفيان الثوري، ومعمر، وابو حنيفة، وشعبة، ثم مالك والليث، وحماد بن زيد، وابن عيينة، ثم ابن المبارك، ويحيى القطان، ووكيع، و عبدالرحمن، وابن وهب، ثم يحيى بن آدم وعفان، والشافعي، وطائفة ثم

أحمد، واسحاق، و ابو عبيد، و علي المديني وابن معين، ثم ابو محمد الدارمي، و محمد بن اسماعيل البخاري وآخرون من أئمة العلم والاجتهاد. (۱)

میں کہتا ہوں یقیناً یحییٰ بن آدم کبار ائمہ اجتہاد میں سے تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلاشبہ اپنے زمانہ میں علم و اجتہاد میں سر تاج مسلمین تھے پھر ان کے بعد حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل ابودرداء رضی اللہ عنہم کا مرتبہ ہے، ان حضرات کے بعد زید بن ثابت، عائشہ صدیقہ، ابوموسیٰ اشعری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا علم و اجتہاد میں مرتبہ تھا، ان حضرات کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا مقام تھا پھر ان حضرات صحابہ کے بعد علقمہ، مسروق، ابوادریس خولانی اور سعید بن المسیب کا درجہ تھا پھر عروہ بن زبیر، امام شععی، حسن بصری، ابراہیم نخعی، مجاہد، طاؤس وغیرہ تھے پھر ابن شہاب زہری، عمر بن عبدالعزیز، قتادہ، ایوب سختیانی کا مرتبہ تھا پھر امام اعمش، ابن عون، ابن جریج، عبید اللہ بن عمر کا درجہ تھا پھر امام اوزاعی، سفیان ثوری، معمر، امام ابوحنیفہ اور شعبہ بن حجاج کا مقام و مرتبہ تھا پھر امام مالک، لیث بن سعد، حماد بن زید اور سفیان بن عیینہ تھے، پھر عبداللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید قطان، وکیع بن جراح، عبدالرحمن بن مہدی، عبداللہ بن وہب تھے پھر یحییٰ بن آدم، عفان بن مسلم، امام شافعی وغیرہ تھے پھر امام احمد بن حنبل اسحاق بن راہویہ، ابو عبید، علی بن المدینی اور یحییٰ بن معین تھے پھر ابو محمد دارمی، امام بخاری اور دیگر ائمہ علم و اجتہاد اپنے زمانہ میں تھے۔

اس موقع پر بھی امام ذہبی نے اکابر ائمہ حدیث کے ساتھ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ امام ذہبی کے نزدیک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ علم حدیث میں ان اکابر کے ہم پایہ ہیں۔

یہ اکابر محدثین یعنی امام مسعر بن کدام، امام ابوسعید سمعانی، حافظ حدیث یزید بن ہارون، استاذ امام بخاری مکی بن ابراہیم، ابومقاتل، امام عبدالعزیز بن رواد، مؤرخ کبیر الحدیث محمد بن یوسف صالحی، امام الحدیث ابو عبداللہ حاکم نیشاپوری، امام ذہبی وغیرہ

بیک زبان شہادت دے رہے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ اپنے عہد کے حفاظ حدیث میں امتیازی شان کے مالک تھے ان کا برمتقدین و متاخرین علمائے حدیث کے علاوہ امام ابن تیمیہ، ان کے مشہور تلمیذ ابن القیم وغیرہ حفاظ حدیث بھی امام صاحب کو کثیر الحدیث ہی نہیں بلکہ اکابر حفاظ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔

اس موقع پر بغرض اختصار انہیں مذکورہ ائمہ حدیث و فقہ کی نقول پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ امام اعظم کی مدح و توصیف کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ امام حافظ عبدالبر اندلسی مالکی اپنی انتہائی وقیع کتاب ”الانتقاء فی فضائل الائمة الثلاثة الفقہاء“ میں سرسٹھ (۶۷) اکابر محدثین و فقہاء کے اسماء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وکل هؤلاء أئمتنا عليه ومدحوه بألفاظ مختلفة (۱)

ان سارے بزرگوں نے مختلف الفاظ میں امام ابوحنیفہ کی مدح و ثنا کی ہے امام صاحب کے بارے میں تاریخ اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں کے اقوال کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس صحیح حدیث کی روشنی میں دیکھئے، خادم رسول اللہ..... بیان کرتے ہیں کہ:

مرّوا بجنّازہ فأنتموا علیہا خیراً فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم! وجبت فقال عمر ما وجبت؟ فقال هذا أنتمم علیہ خیراً، فوجبت له الجنة أنتم شهداء اللہ فی الأرض (متفق علیہ) (۲)

حضرات صحابہ کا ایک جنازہ کے پاس سے گزر ہوا تو ان حضرات نے اس کی خوبیوں کی تعریف کی اس پر آنحضرت..... نے فرمایا واجب ہوگئی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیا چیز واجب ہوگئی؟ تو رسول خدا..... نے فرمایا تم نے اس کے خیر و بھلائی کو بیان کیا لہذا اس کے لئے جنت واجب ہوگئی تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

اس حدیث پاک کے مطابق یہ اعیان علماء اسلام یعنی محدثین فقہاء، عباد و زہاد اور

(۱) الانتقاء ص ۲۲۹ مطبوعہ دار البیضاء بیروت ۱۴۱۷ھ

(۲) مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۵ باختصار۔

اصحاب امانت و دیانت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت شان اور دینی امامت کے بارے میں شہداء اللہ فی الارض ہیں اور اللہ کے ان گواہوں کی شہادت کے بعد مزید کسی شہادت کی حاجت نہیں۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر اک کا نصیب یہ بخت رسا کہاں

امام صاحب کی عدالت و ثقاہت

سید الفقہاء، سراج الامت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ علم و فضل اور امامت و شہرت کے جس بلند و بالا مقام پر ہیں، ان کی عظمت شان بذات خود انہیں ائمہ جرح و تعدیل کی انفرادی تعدیل و توثیق سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

چنانچہ امام تاج الدین سبکی اصول فقہ پر اپنی مشہور کتاب ”جمع الجوامع“ کے آخر میں لکھتے ہیں۔

”ونعتقد أن أبا حنيفة ومالكاً، والشافعي، وأحمد، والسفيانين، والأوزاعي، واسحاق بن راهويه، وداؤد الظاهري، وابن جرير وسائر أئمة المسلمين على هدى من الله في العقائد وغيرها ولا التفات الى من تكلم فيهم بما هم بريئون منه فقد كانوا من العلوم اللدنية والمواهب الالهية والاستنباط الدقيقة والمعارف الغزيرة والدين والورع والعبادة والزهادة والجلالة بالمحل لايسامى“ (۱)

ہمارا اعتقاد ہے کہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد، سفیان ثوری، وسفیان بن عیینہ، اوزاعی، اسحاق بن راہویہ، داؤد ظاہری، ابن جریر طبری اور سارے ائمہ مسلمین عقائد و اعمال میں منجانب اللہ ہدایت پر تھے اور ان ائمہ دین پر ایسی باتوں کی حرف گیری کرنے والے جن سے یہ بزرگان دین بری تھے مطلقاً لائق التفات نہیں ہیں کیونکہ یہ حضرات علوم لدنی، خدائی عطا یا، باریک استنباط، معارف کی کثرت اور دین و پرہیزگاری، عبادت و زہد

(۱) جمع الجوامع ۳/۴۴۱۔

نیز بزرگی کے اس مقام پر تھے جہاں پہنچا نہیں جاسکتا ہے۔

نیز شیخ الاسلام ابواسحاق شیرازی شافعی اپنی کتاب اللمع فی اصول الفقہ میں رقمطراز ہیں۔

وجملته أن الراوی لا یخلوا إما ان ینكون معلوم العدالة أو معلوم الفسق أو مجهول الحال، فإن كانت عدالته معلومة كالصحابه رضی اللہ عنہم أو أفاضل التابعین كالحسن وعطاء والشعبی والنخعی أو أجلاء الأئمة كمالک، وسفیان، وأبى حنیفة، والشافعی، وأحمد، وإسحاق، ومن یجرى مجراهم وحب قبول خبره ولم یجب البحث عن عدالته. (۱)

(جرح و تعدیل کے باب میں خلاصہ کلام یہ ہے کہ راوی کی یا تو عدالت معلوم و مشہور ہوگی یا اس کا فاسق ہونا معلوم ہوگا، یا وہ مجہول الحال ہوگا (یعنی اس کی عدالت یا فسق معلوم نہیں) تو اگر اس کی عدالت معلوم ہے جیسے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم یا افاضل تابعین جیسے حسن بصری، عطاء بن رباح، امام سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ اور جو ان کے ہم درجہ ہیں تو ان کی خبر ضرور قبول کی جائے گی اور ان کی عدالت و توثیق کی تحقیق ضروری نہیں ہوگی)۔

یہی بات اپنے الفاظ میں حافظ ابن صلاح نے اصول حدیث پر اپنی مشہور و معروف کتاب علوم الحدیث میں تحریر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

فمن اشتهرت عدالته بین أهل النقل من أهل العلم وشاع كالثناء علیه بالثقة والأمانة استغنی فیہ بذلك عن بینة شاهد بعدالته تنصیصاً (۲)

”علمائے اہل نقل میں جس کی عدالت مشہور ہو اور ثقاہت و امانت میں جس کی تعریف عام ہو اس شہرت کی بناء پر اس کے بارے میں صراحئاً انفرادی تعدیل کی حاجت نہیں ہے۔“

(۱) اللمع فی اصول الفقہ ص ۴۱ مطبوعہ مصطفیٰ البالی الحلبی بمصر ۱۳۵۸ھ

(۲) علوم الحدیث المعروف بمقدمۃ ابن صلاح ص ۱۱۵۔

حافظ شمس الدین سخاوی ”الجواهر الدرر فی ترجمۃ شیخ الاسلام ابن حجر“ میں رقمطراز ہیں:

وسئل ابن حجر مما ذكره النسائی فی ”الضعفاء والمتروکین عن أبی حنیفة رضی اللہ عنہ أنه لیس بقوی فی الحدیث وهو کثیر الغلط والخطاء علی قلة روايته، هل هو صحیح؟ وهل وافقه علی هذا احد من ائمة المحدثین ام لا؟ فأجاب: النسائی من ائمة الحدیث والذی قاله إنما هو حسب ما ظهر له وأداه إلیه اجتهاده، و لیس کل أحد یؤخذ بجمیع قوله، وقد وافق النسائی علی مطلق القول فی جماعة من المحدثین، واستوعب الخطیب فی ترجمته من تاریخه أقوا یلهم و فیها ما یقبل وما یرد وقد اعتذر عن الإمام بانه کان یری أنه لا یحدث إلا بما حفظه منذ سمعه إلی أن اداه، فلماذا قلت الروایة عنه وصارت روايته قليلة بالنسبة لذلك، وإلا فهو فی نفس الأمر کثیر الروایة.

وفی الجملة: ترك الخوض فی مثل هذا أولى فإن لإمام وأمثاله من قفزوا القنطرة فما صار یؤثر فی أحد منهم قول أحد بل هم فی الدرجة اللتی رفعهم اللہ تعالیٰ إلیها من كونهم متبوعین یقتدی بهم فلیعتمد هذا واللہ ولی التوفیق (۲)

”شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی سے دریافت کیا گیا کہ امام نسائی نے اپنی کتاب ”الضعفاء والمتروکین“ میں امام اعظم ابوحنیفہ کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ ”إنه لیس بالقوی فی الحدیث وهو کثیر الغلط والخطاء علی قلة روايته“ (کیا یہ درست ہے اور ائمہ محدثین میں کسی نے اس قول میں ان کی موافقت کی ہے؟) تو شیخ اسلام حافظ ابن حجر نے جواب دیا۔ نسائی ائمہ حدیث میں ہیں انھوں نے امام اعظم کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ اپنے علم و اجتهاد کے مطابق کہی ہے۔ اور ہر شخص کی ہر بات لائق قبول نہیں ہوتی، محدثین کی جماعت میں سے کچھ لوگوں نے اس بات میں نسائی کی موافقت کی ہے اور امام خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام اعظم کے تذکرے میں ان لوگوں کے اقوال

(۲) بحوالہ اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمہ رضی اللہ عنہم ص ۱۱۶-۱۱۷، از محقق علامہ محمد عوامد۔

کو جمع کر دیا ہے جن میں لائق قبول اور قابل رد دونوں طرح کے اقوال ہیں۔ امام اعظم کی قلت روایت کے بارے میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ روایت حدیث کے سلسلے میں چونکہ ان کا مسلک یہ تھا کہ اسی حدیث کا نقل کرنا درست ہے جو سننے کے وقت سے بیان کرنے کے وقت تک یاد ہو، باب روایت میں اسی کڑی شرط کی بناء پر ان سے منقول روایتیں کم ہو گئیں ورنہ وہ فی نفسہ کثیر الروایت ہیں۔“

”بہر حال (امام اعظم کے متعلق) اس طرح کی باتوں میں نہ پڑنا ہی بہتر ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ اور ان جیسے ائمہ دین ان لوگوں میں ہی جو اس پل کو پار کر چکے ہیں (یعنی باب جرح میں ہماری بحث و تحقیق سے بالاتر ہیں) لہذا ان میں کسی کی جرح مؤثر نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کو امامت و مقتداہیت کی جو رفعت و بلندی عطا کی وہ اپنے اسی مقام بلند پر فائز ہیں۔ ان ائمہ حدیث کے متعلق اسی تحقیق پر اعتماد کرو اللہ تعالیٰ ہی توفیق کے مالک ہیں۔“

ان اکابر علماء حدیث و فقہ کی مذکورہ بالا تصریحات اور حدیث و فقہ کے اس مسلمہ اصول کے پیش نظر اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی توثیق و تعدیل سے متعلق ائمہ جرح و تعدیل کے انفرادی اقوال پیش کئے جائیں پھر بھی بغرض فائدہ مزید امام اعظم کی توثیق و تعدیل سے متعلق ذیل میں کچھ ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال درج کئے جا رہے ہیں۔

۱- قال محمد بن سعد العوفی سمعت یحییٰ بن معین یقول کان ابو حنیفة ثقة لا یحدث بالحديث إلا بما یحفظه ولا یحدث بما لا یحفظ. (۱)

”محمد بن سعد عوفی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین سے کہتے ہوئے سنا کہ امام ابوحنیفہ ثقہ تھے وہ اسی حدیث کو بیان کرتے تھے جو انہیں محفوظ ہوتی تھی اور جو حدیث یاد نہ ہوتی بیان نہیں کرتے تھے۔“

۲- وقال صالح بن محمد الأسدی الحافظ سمعت یحییٰ بن معین

(۱) تہذیب الکمال از حافظ مزمل/۷/۳۴۰ مطبوعہ موسسۃ الرسالہ ۱۴۱۸ھ۔

یقول کان أبو حنیفة ثقة فی الحدیث. (۱)

”حافظ صالح بن محمد اسدی کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین کو کہتے ہوئے

سنا کہ امام ابوحنیفہ حدیث میں ثقہ تھے۔“

۳- وقال علی بن المدینی أبو حنیفة روى عنه الثوری، وابن المبارک وحماد بن زید وهشیم و وکیع بن الجراح وعباد بن العوام وجعفر بن عون وهو ثقة لا بأس به. (۲)

امام بخاری کے استاذ کبیر علی بن المدینی کا قول ہے کہ امام ابوحنیفہ سے سفیان ثوری عبد اللہ بن مبارک، حماد بن زید، ہشیم، وکیع بن الجراح، عباد بن عوام اور جعفر بن عون روایت کرتے ہیں اور وہ ثقہ تھے ان میں کوئی خرابی نہیں تھی۔

۴- قال محمد بن اسماعیل سمعت شبابة بن سوار کان شعبة حسن الراى فى أبی حنیفة. (۳)

شبابة بن سوار کا بیان ہے کہ امام شعبہ بن الحجاج امام ابوحنیفہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔

۵- قال عبد الله بن أحمد بن إبراهيم الدورقي قال سئل يحيى بن معين وانا اسمع عن ابى حنیفة فقال: ثقة ماسمعت احد أضعف هذا شعبة بن الحجاج یکتب إليه ان یحدث ویامرہ وشعبة شعبة. (۴)

”عبد اللہ دورقی کہتے ہیں یحییٰ بن معین سے امام ابوحنیفہ کے متعلق پوچھا گیا اور میں سن رہا تھا کہ یحییٰ بن معین نے فرمایا وہ ثقہ ہیں میں نے کسی سے ان کی تضعیف نہیں سنی، یہ امام شعبہ ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ کو مکتوب لکھا ہے کہ آپ حدیث روایت کیجئے یعنی

(۱) ایضاً۔

(۲) جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۱۰۸۳، از حافظ ابن عبد البر مطبوعہ دار الجوزیہ طبعہ ۱۴۱۸ھ۔

(۳) الانتقاء فی فضائل الائمة الثلاثة الفقہاء ص ۱۹۶ از حافظ ابن عبد البر مطبوعہ دار البشائر الاسلامیہ بیروت طبعہ الاولى ۱۴۱۷ھ۔

(۴) جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۱۰۸۳۔

امام شعبہ نے انہیں حدیث کی روایت کا حکم دیا اور جرح و تعدیل کے فن میں شعبہ کا جو مقام ہے وہ سب کو معلوم ہے۔“

اس موقع پر بغرض اختصار ائمہ جرح و تعدیل میں سے امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی اور امام شعبہ بن الحجاج کے اقوال پر اکتفاء کیا جا رہا ہے ورنہ ”يقول امام ابن عبد البر: الذين رووا عن أبي حنيفة ووثقوه وأثنوا عليه أكثر من الذين تكلموا فيه“ یعنی امام ابوحنیفہ سے حدیث کی روایت کرنے اور ان کی توثیق و تعریف کرنے والوں کی تعداد ان پر کلام کرنے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔

پھر ان مذکورہ ائمہ کا فن جرح و تعدیل میں جو مقام و مرتبہ ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ ان میں سے صرف ایک کی تعدیل کسی کی عدالت کے ثبوت کیلئے کافی سمجھی جاتی ہے۔

امام ابوحنیفہ اور فن جرح و تعدیل

سراج الامت، سید الفقہاء نہ صرف ایک عادل و ضابط حافظ حدیث تھے بلکہ ائمہ محدثین کی اس صف میں شامل تھے جو علوم حدیث اور رجال حدیث میں مہارت، نیز ذکاوت و فراست و عدالت و ثقاہت میں اس معیار پر تھے جن کے فیصلوں پر راویان حدیث کے مقبول و غیر مقبول ہونے کا مدار ہے۔

چنانچہ الامام الناقد الحافظ ابو عبد اللہ شمس الدین محمد الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ طبقات المحدثین کے فن میں اپنی جامع و نافع ترین کتاب ”تذکرۃ الحفاظ“ کے سرورق پر رقم طراز ہیں:

هذه تذكرة اسماء معدلى حملة العلم النبوى ومن يرجع اجتهادهم فى

التوثيق والتضعيف والتصحيح والتعريف (۱)

”مستقیم السیرت حاملین حدیث اور رجال کی توثیق و تضعیف نیز حدیث کی تصحیح و تضعیف میں جن کے اجتہاد و رائے کی جانب رجوع کیا جاتا ہے کے اسماء کا تذکرہ ہے۔“

(۱) تذکرۃ الحفاظ / ۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بلاتاریخ۔

اور تذکرہ میں امام ذہبی پانچویں طبقہ کے حفاظ حدیث میں امام صاحب کا بھی ذکر ہے (۱) جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام ذہبی نے (جن کے بارے میں حافظ ابن حجر کا فیصلہ ہے کہ نقد رجال میں استقرء تام کے مالک ہیں) کے نزدیک امام اعظم ابوحنیفہ کا شمار ان ائمہ حدیث میں ہے جن کے قول سے جرح و تعدیل کے باب میں سند پکڑی جاتی ہے۔ پھر یہی امام ذہبی اپنے رسالہ ”ذکر من يعتمد قوله فى الجرح والتعديل“ میں لکھتے ہیں۔

فاول من زكى وجرح عند انقراض عصر الصحابة

۱- الشعبى، ۲- وابن سيرين ونحوهما حفظ عنهم توثيق أناس وتضعيف آخرين. سبب قلة الضعفاء فى ذلك الزمان: قلة متبوعهم من الضعفاء إذا كثر المتبوعين صحابة عدول واكثرهم من غير الصحابة بل عامتهم ثقات صادقون يعون ما يرون وهم كبار التابعين... ثم كان فى المائة الثانية فى اوائلها جماعة من الضعفاء من اوساط التابعين وصغارهم... فلما كان عند انقراض امة التابعين فى حدود الخمسين ومائة تكلم طائفة من الجهابذة فى التوثيق والتضعيف، ۳- فقال ابوحنيفة ما رأيت أكذب من جابر الجعفى الخ. (۲)

”عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے خاتمہ کے بعد اولین جرح و تعدیل کرنے والوں میں امام شعبی اور امام ابن سیرین ہیں ان دونوں بزرگوں سے کچھ لوگوں کی توثیق اور کچھ دوسرے لوگوں کی جرح محفوظ ہے۔ اس عہد میں ضعفاء کی کمی کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ کے متبوعین میں حضرات صحابہ ہیں جو سب کے سب عادل ہی ہیں اور غیر صحابہ میں کبار تابعین ہیں جو عام طور پر ثقہ صادق اور اپنی مرویات کو محفوظ رکھنے والے تھے پھر دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اوساط و صغار تابعین میں ضعفاء کی ایک جماعت ہے۔ پھر

(۱) ایضاً / ۱۶۸۔

(۲) ربح رسائل فی علوم الحدیث، ص ۱۷۲-۱۷۵ مطبوعہ دار البشائر الاسلامیہ الطبعة السادسة ۱۴۱۶ھ

بتحقیق علامہ محدث عبدالفتاح ابو غده۔

جب ۱۵۰ھ کے حدود میں اکثر اور عام تابعین ختم ہو گئے تو ناقدرین رجال کی ایک جماعت نے توثیق و تضعیف کے باب میں کلام کیا چنانچہ امام ابوحنیفہ نے جابر جعفی پر جرح کرتے ہوئے فرمایا: ”ما رأیت اکذب من جابر الجعفی“ جابر جعفی سے بڑا جھوٹا میں نے نہیں دیکھا۔“

جابر جعفی کے بارے میں امام صاحب کی اس جرح کی بنیاد پر عام طور پر ائمہ رجال نے یہی فیصلہ صادر کیا ہے کہ جابر جعفی کی روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ چنانچہ امام ترمذی کی کتاب العلل میں امام صاحب کے حوالہ سے جابر جعفی پر جرح نقل کی ہے وہ لکھتے ہیں:

حدثنا محمود بن غیلان، حدثنا ابو یحییٰ الحماني قال سمعت ابا حنیفة یقول: ما رأیت احداً اکذب من جابر الجعفی ولا أفضل من عطاء. (۱)
 ”امام ترمذی ناقل ہیں کہ مجھ سے محمود بن غیلان نے اور انھوں نے اپنے شیخ ابو یحییٰ حمّانی سے نقل کیا کہ میں نے ابوحنیفہ سے کہتے ہوئے سنا کہ جابر جعفی سے بڑا جھوٹا اور عطاء بن ابی رباح سے افضل میں نے نہیں دیکھا۔“

جرح و تعدیل کے باب میں امام صاحب کے اس قول کو امام ترمذی کے علاوہ امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں، حافظ ابن عدی نے ”الکامل فی الضعفاء“ میں اور حافظ ابن عبدالبر نے ”جامع بیان العلم وفضله“ میں نقل کیا ہے۔
 امام بیہقی کتاب القراءت خلف الامام میں لکھتے ہیں۔

”ولو لم یکن فی جرح الجعفی الا قول ابی حنیفة رحمہ اللہ لکفاه بہ شرافانہ رأہ وجرّہ وسمع منه ما یوجب تکذیبہ فاخبر بہ.“ (۲)

”جابر جعفی کی جرح میں اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول ہوتا تو بھی اس کے مجروح ہونے کیلئے یہ کافی تھا کیونکہ امام صاحب نے اسے دیکھا اور اس کا تجربہ کیا تھا اور اس

(۱) جامع ترمذی ۲/۳۳۳ طبع مصر ۱۲۹۲ھ بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث از محقق علامہ عبدالرشید نعمانی ص ۲۲۹،

تہذیب التہذیب ۲/۴۸۔

(۲) ص ۱۰۸-۱۰۹ مطبوعہ دہلی ۱۲۱۶ھ

سے ایسی باتیں سنی تھیں جس سے اس کی تکذیب ضروری تھی لہذا انھوں نے اس کی خبر دی“
 اور امام ابو محمد علی بن احمد المعروف بہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب ”المجلی فی شرح المجلی“ میں لکھتے ہیں۔

جابر الجعفی کذاب وأول من شہد علیہ بالکذب ابو حنیفة (۱)
 جابر جعفی کذاب ہے اور سب سے پہلے جس نے اس کے کاذب ہونے کی شہادت دی وہ امام ابوحنیفہ ہیں۔

ان نقول سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جرح و تعدیل کے باب میں امام بخاری، امام علی بن المدینی استاذ امام بخاری، امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمن بن مہدی، امام شعبہ وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال کی طرح امام ابوحنیفہ کے اقوال سے بھی ائمہ حدیث احتجاج و استدلال کرتے ہیں، کتب رجال مثلاً تہذیب الکمال از امام مزی، تہذیب التہذیب از امام ذہبی، تہذیب التہذیب از حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ میں جرح و تعدیل سے متعلق امام صاحب کے دیگر اقوال بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس مختصر مقالہ میں ان سب اقوال کے نقل کی گنجائش نہیں کسی دوسرے موقع پر انشاء اللہ اس اختصار کی تفصیل بھی پیش کر دی جائے گی۔ یا رزندہ صحبت باقی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلاة والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وأصحابہ واتباعہ أجمعین۔



امام ابوداؤد اور ان کی سنن

امام ابوداؤد تیسری صدی ہجری کے اوائل میں اس سرائے فانی میں وارد ہوئے اور زندگی کی تہتر بہاریں دیکھ کر گرہ اے عالم جاودانی ہو گئے، تاریخ تمدن و ثقافت میں یہ صدی اسلامی علوم و فنون کی جمع و تدوین اور بحث و تحقیق کے لحاظ سے سنہری صدی شمار ہوتی ہے، چنانچہ امام ابوداؤد کی علمی حیات پر سرسری نگاہ ڈالنے ہی سے ان کے شیوخ اور اساتذہ کی فہرست میں امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، اسحاق بن راہویہ، ابوبکر بن ابی شیبہ، عبداللہ بن مسلمہ القعنسی، ابوخیثمہ زہیر بن حرب، سعید بن منصور، ہناد بن سری مسدد بن مسرہد وغیرہ جیسے اکابر ائمہ حدیث، ہم عصر علماء کی جماعت میں امام بخاری، مسلم، ابوحاتم الرازی، ابوزرعہ الرازی جیسے اساطین حدیث و رجال، اور ان کے تلامذہ کی صف میں امام ترمذی، نسائی، ابوعوانہ الاسفرائینی، ابوبشر الدولابی، زکریا الساجی محمد بن نصر المروزی، ابوبکر محمد بن یحییٰ الصولی جیسے نابغہ روزگار محدثین و علماء نظر آتے ہیں جس سے اس عہد کے علمی نشاط و شباب کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نام و نسب

سلیمان ابن الاشعث بن اسحاق بن بشیر، بن شداد، بن عمرو، بن عمران، ابوداؤد

الازدی السجستانی (۱)

(۱) تاریخ بغداد از خطیب بغدادی، ج: ۹، ص: ۵۵ و تہذیب، تاریخ دمشق از ابن عساکر، ج: ۶، ص: ۲۳۶ و فیات الاعیان از ابن خلکان، ج: ۱، ص: ۳۸۲ و تہذیب الکمال از مزنی، ج: ۳، ص: ۳۶۵ و تذکرۃ الحفاظ، ج: ۲، ص: ۵۹۱ و سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۰۵، از الذہبی، والبدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج: ۱۱، ص: ۶۳۔ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ۱۴۱۳ھ-۱۹۹۳ء میں عرب و بن عمران کی بجائے یحییٰ بن عمران ہے جو بلاشبہ طباطبائی غلطی ہے۔

امام ابوداؤد کے والد ”الاشعث“ کے اوپر سلسلہ نسب میں قدرے اختلاف ہے چنانچہ حافظ عبدالرحمن بن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعديل میں نسب نامہ یوں درج کیا ہے۔
سلیمان بن الاشعث بن شداد بن عمرو بن عامر الازدی ابوداؤد السجستانی (۱) جبکہ امام ابوداؤد کے دو اہم تلامذہ ابن داسہ اور ابو عبیدہ الآجزی نے اوپر مذکور سلسلہ نسب کو بیان کیا ہے البتہ انھوں نے صرف ”بشیر“ تک کا ہی ذکر کیا ہے۔ آگے کا اضافہ خطیب بغدادی کا ہے۔ (۲)

ابن داسہ اور آجزی ہی کے بیان پر خطیب بغدادی، مزنی اور ذہبی نے اعتماد کیا ہے۔ حافظ ابوطاہر السلفی بھی اسی کو راجح قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ”هذا القول أمثل والقلب اليه أميل“ یہی قول حق سے قریب تر ہے اور دل کارہجان اسی جانب زیادہ ہے۔ (۳) اسی لیے یہی نسب نامہ درست ہے۔ واللہ اعلم
امام ابوداؤد کی پانچویں پشت اور شجرہ میں مذکور آخری دادا کے بارے میں حافظ ابن عساکر نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہ جنگ صفین میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پرچم تلے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ (۴)

”الازدی“ ازد کی جانب نسبت ہے، جو یمن کا معروف قبیلہ ہے صاحب قاموس لکھتے ہیں ”الأزد ابن الغوث أبو حنیٰ باليمن ومن أولاده الانصار کلہم“ ازاد بن الغوث یمن کے ایک قبیلہ کے باپ ہیں اور سارے انصار مدینہ انھیں کی اولاد ہیں۔ (۵)
امام ابوداؤد کا بھی نسب تعلق اسی یمنی قبیلہ سے ہے۔

”السجستانی“ سجستان (سیستان) کی طرف نسبت ہے۔ ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں

هذه النسبة إلى سجستان وهي البلاد المعروفة ينسب إلى هذه النسبة جماعة

(۱) ج: ۴، ص: ۱۰۴ و ۱۰۳ رقم الترجمة ۲۵۶۔

(۲) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۰۵۔

(۳) تہذیب الاسماء واللغات از نووی، ج: ۲، ص: ۲۲۵۔

(۴) تہذیب تاریخ دمشق از ابن عساکر، ج: ۶، ص: ۲۳۶۔

(۵) القاموس المحیط ص ۳۳۸ مطبوعہ موسسة الرسالہ ۱۴۱۶ھ-۱۹۹۶ء۔

من العلماء منهم الامام أبو داؤد سليمان بن الأشعث السجستاني صاحب كتاب السنن (۱) یہ سجستان کی جانب نسبت ہے جو ایک معروف بلاد ہے۔ علماء کی ایک جماعت اس کی طرف منسوب ہے، جن میں امام ابوداؤد سجستانی ”صاحب سنن“ بھی ہیں۔ حافظ ذہبی اس بلاد معروف کی تفصیل یوں رقم کرتے ہیں:

واما سجستان الإقليم الذی منه الإمام أبو داؤد ، فهو إقليم صغير منفرد، يتاخم بالسند ، غربيه بلد هراة وجنوبيه مفازة بينه وبين إقليم فارس وكرمان، وشرقيه مفازة بريّة بينه وبين مكران التي هي قاعدة السند ... وشماليه أول الهند“ (۲)

سجستان جس سے امام ابوداؤد کا وطن تعلق ہے ایک چھوٹا سا علیحدہ صوبہ ہے جس کی سرحد سندھ سے ملتی ہے اس کی جانب مغرب شہر ہراہ ہے اور جنوبی سمت ایک وسیع بیابان ہے جو سجستان اور فارس و کرمان کے درمیان حائل ہے جانب مشرق بھی بیابان اور خشک زمین ہے جو سجستان اور کرمان (جو سندھ کا ایک بڑا شہر ہے) کے درمیان واقع ہے اور اس کا شمالی حصہ ہندوستان کی سرحد سے ملحق ہے۔

ان واضح تصریحات کے برخلاف ”ابوموسیٰ صاحب زیادات“ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ”محمد بن نصر“ الملقب بہ قل هو اللہ احد خواں سے کہتے ہوئے سنا کہ ”ابو داؤد السجستانی الإمام هو من قرية بالبصرة يقال لها سجستان وليس من سجستان خراسان“ (۳) امام ابوداؤد سجستانی بصرہ کے سجستان نامی ایک قریہ کے ہیں خراسان سے ملحق سجستان کے نہیں ہیں۔

اس قول کو حافظ منذری نے تہذیب سنن ابی داؤد کے مقدمہ میں اور ابن خلکان

(۱) اللباب فی تہذیب الانساب، ج: ۱، ص: ۴۳۱۔

(۲) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۲۰۔

(۳) زیادات ابی موسیٰ علی الانساب المحققہ لابن طاہر، ص: ۱۹۹ بواسطہ حاشیہ الاکمال، ج: ۴، ص: ۵۵۰ لابن ماکولہ۔

نے وفیات الاعیان میں صیغہ تمریض کے ساتھ ذکر کیا ہے اور امام منذری نے ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ ”والأول أكثر و أشهر“

محقق یاقوت حموی نے بھی ابوموسیٰ کی بیان کردہ روایت ذکر کی ہے مگر غلطی سے اس کی نسبت حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی کی جانب کر دی ہے جبکہ اس کے راوی ابوموسیٰ ہیں ابوالفضل نہیں۔ حموی اس روایت کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ محمد بن نصر الحمد کو کا بیان ہے کہ میں نے اہل بصرہ سے سجستان نامی بستی کے بارے میں تحقیق کی تو کسی کو بھی اس قریہ کا علم نہیں تھا۔ پھر تذکروں میں مذکور ہے کہ امام ابوداؤد کے صاحبزادے ابوبکر عبد اللہ نیساپور کے مکتب میں امام اسحاق بن راہویہ کے لڑکوں کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اور تذکرہ نگاریہ بھی لکھتے ہیں کہ ابوبکر نے حدیث پاک کی تحصیل کا آغاز شیخ مشرق محمد بن اسلم الطوسی سے کیا (۱)۔ اس وقت ان کی عمر دس سال سے بھی کم تھی، علاوہ ازیں حفاظ میں سے کسی نے بھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ امام ابوداؤد غیر معروف سجستان کے تھے۔ (۲)

مجمع البلدان میں مذکور یہ قرائن بتا رہے ہیں کہ امام ابوداؤد کا مسقط راس اور آبائی وطن موجودہ افغانستان کا صوبہ سجستان ہی ہے اور زیادات علی الانساب المحققہ میں مذکور روایت بس روایت ہی ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

تاریخ پیدائش اور تعلیم و تحصیل

امام ابوداؤد کے سارے تذکرہ نگار بیک قلم لکھتے ہیں کہ ان کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی خود امام ابوداؤد نے بھی اپنی پیدائش کی یہی تاریخ بتائی ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں ”مولدہ سجستان وله ولسلفه إلى الآن عُقد وأملاك وأوقاف“ (۳) امام ابوداؤد کی جائے پیدائش سجستان ہے ان کی اور ان کے بزرگوں کی جائیدادیں، املاک اور اوقاف

(۱) امام ذہبی لکھتے ہیں: فأول شيخ سمع منه محمد بن أسلم الطوسي أولین شیخ جن سے ابوبکر ابن ابی داؤد نے حدیث کی سماعت کی محمد بن اسلم طوسی ہیں۔

(۲) مجمع البلدان، ج: ۳، ص: ۲۴۔

(۳) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۷۔

وہاں اب تک موجود ہیں۔

امام ابوداؤد کی نشوونما، تربیت و پرورش سے متعلق تفصیلات کے بارے میں ان کے سوانح نویس خاموش ہیں نیز امام صاحب نے طلب و تحصیل کا آغاز کس وقت کیا اس کا ذکر بھی کسی نے نہیں کیا ہے، البتہ خود امام ابوداؤد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ برس کی عمر میں انھوں نے طلب علم کے لیے گھر سے رخت سفر باندھا۔ ظاہر ہے اس رحلت سے پہلے اپنے شہر کے اساتذہ سے ابتدائی ضروری علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کر لی ہوگی چنانچہ امام الحاکم لکھتے ہیں: ”وقد كتب بخراسان قبل خروجه الى العراق في بلدة وهراة“ (۱) عراق کی رحلت سے قبل انھوں نے خراسان، اپنے شہر اور ہراة میں تحصیل علم کیا۔ بعد ازاں مزید علمی لیاقت کے لیے مراکز علمیہ کا سفر کیا۔ آپ کے تلمیذ رشید ابو عبید الآجری ناقل ہیں:

سمعت سليمان بن الأشعث أبا داؤد يقول ولدت سنة اثنتين ومأتين ، وصليت على عفان ببغداد سنة عشرين ، وسمعت ابن عمر الضير مجلسا واحدا، ودخلت البصرة وهم يقولون أمس مات عثمان المؤذن، وتبعته عمر بن حفص بن غياث ولم أسمع منه شيئاً. (۲)

ابو عبید الآجری کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوداؤد سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی اور میں نے ۲۲۰ھ میں عفان بن مسلم کی نماز جنازہ بغداد میں پڑھی اور ابن عمر الضیر سے صرف ایک مجلس میں حدیث کی سماعت کی، اور بصرہ اس وقت پہنچا کہ وہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ گذشتہ کل عثمان بن ابیہثم المؤمن انتقال کر گئے، اور عمر بن حفص بن غیاث کے پیچھے پیچھے ان کے گھر تک گیا مگر ان سے کچھ سننے کا اتفاق نہ ہوا۔

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابو عمر الضیر کی وفات ماہ شعبان ۲۲۰ھ میں ہوئی اور ان سے

(۱) تہذیب الکمال از مزی مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ ۴۱۸ھ-۱۹۹۸ء، ج: ۳، ص: ۶۶۵۔

(۲) سوالات ابو عبید الآجری، ج: ۲، ص: ۲۹۴ و ۲۹۵۔

ایک ماہ قبل یعنی رجب میں عثمان بن ابیہثم فوت ہوئے۔ (۱)

امام ابوداؤد کے اس بیان سے واضح ہے کہ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے گھر سے نکلے اور اس وقت کے عظیم علمی مرکز بغداد پہنچے، یہی ان کا اولین علمی سفر بتایا جاتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ نوعمری ہی سے انھیں تحصیل علم کا شوق تھا اور اسکے لیے وطن اور اقربا سے مفارقت اور اسفار کی صعوبت انکے جذبہ صادق کی راہ میں حائل نہیں ہو سکی۔

تعلیمی اسفار

امام ابوداؤد ان اکابر ائمہ حدیث میں ہیں جنھوں نے حدیث پاک کی تعلیم و تحصیل کے لیے کثرت سے اسفار کیے اور اپنے عہد کے مراکز علمیہ میں پہنچ کر وہاں کے شیوخ و اساتذہ سے احادیث کی سماعت و کتابت کی۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر صراحت کرتے ہیں کہ

أحد أئمة الحديث الرحالين في الآفاق في طلبه ... وسمع الكثير عن مشائخ البلدان في الشام، ومصر، والجزيرة، والعراق، وخراسان وغير ذلك. (۲)

امام ابوداؤد ان ائمہ حدیث میں سے ایک ہیں جنھوں نے حدیث کی طلب میں آفاق کا چکر لگایا ہے، شام، مصر، جزیرہ، عراق، خراسان وغیرہ شہروں کے بہت سارے مشائخ سے احادیث کی سماعت کی۔

حافظ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

”أحد من رحل وطوّف وجمع وصنّف وكتب عن العراقيين والخراسيين والمصريين والجزيريين“ (۳)

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۰۴، امام ذہبی سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۰، ص: ۲۱۰، امام ابوداؤد کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ عثمان المؤمن کی وفات ۱۱ رجب ۲۲۰ھ کو ہوئی۔

ع۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں: ”فأبو داؤد أول ما قدم من البلاد دخل بغداد وهو ابن ثمان عشرة سنة وذلك قبل أن يروى البصرة، ثم ارتحل من بغداد البصرة“ سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۲۱۔

(۲) البداية والنهاية مطبوعه دار احياء التراث العربي ۱۴۱۳ھ-۱۹۳۰ء، ج: ۱۱، ص: ۶۴۔

(۳) تاريخ بغداد، ج: ۹، ص: ۵۵۔

امام ابوداؤد ان محدثین میں سے ایک ہیں جنہوں نے طلب حدیث کے لیے اسفار کیے، مراکز علمیہ کا چکر لگایا، احادیث جمع کیں، کتابیں تصنیف کیں، عراق، شام، مصر اور جزیرہ کے شیوخ سے احادیث نقل کیں۔
امام مڑی نے ان پر شیوخ حجاز وغیرہ کا اضافہ کیا ہے۔
حافظ ابن عساکر یوں تحریر کرتے ہیں:

”وسمع الحدیث بدمشق، ومصر، والبصرة، والكوفة، وبغداد، وخراسان من خلق.“ (۱)

دمشق، مصر، بصرہ، کوفہ، بغداد اور خراسان میں بہت سارے لوگوں سے احادیث کی سماعت کی۔

امام ابوداؤد کے تذکرہ نویسوں کی تصریحات نیز ان کے اساتذہ کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بغداد، بصرہ، کوفہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق، حلب، حمص، ہراة، مرو، بلخ، بغلان، نیشاپور، رے، واسط، جزیرہ، بیروت، حران، رملہ، مصر، طرسوس وغیرہ بلاد اسلامیہ کے شیوخ سے حدیث کی سماعت کی۔

اسفار کی ضروری تفصیلات

امام ابوداؤد نے اپنی رحلتہ علمیہ اور اسفار کی وقتاً فوقتاً جو مختصر روداد اور اپنے شیوخ کے متعلق جو معلومات دی ہیں ان سے اوپر مذکور اجمال کی بعض تفصیلات یوں سامنے آتی ہیں کہ امام ابوداؤد جو ۲۰۲ھ میں موجودہ افغانستان کے ایک صوبہ یا ضلع جغتان میں پیدا ہوئے، طلب علم کے لیے ۲۲۰ھ میں بغداد میں نظر آتے ہیں جہاں عفان بن مسلم کی نماز جنازہ میں حاضری کا شرف انھیں حاصل ہوا، بغداد سے اسی سال بصرہ آگئے جہاں لوگوں سے انھیں معلوم ہوا کہ کل گذشتہ عثمان بن الہیثم المؤمن اللہ کو پیارے ہو گئے، گذشتہ سطور میں یہ بات گذر چکی ہے کہ ”عثمان المؤمن کی وفات ۱۱ رجب ۲۲۰ھ کو ہوئی، بصرہ میں

(۱) تہذیب تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۲۳۶۔

ان کا قیام ۲۲۱ھ تک رہا اور محمد بن بشار المعروف بہ بُندار، ابوموسیٰ الزمن وغیرہ سے وہاں حدیث کی سماعت کی چنانچہ خود امام ابوداؤد کا قول ہے ”کتبت عن بُندار وأبی موسیٰ سنة احدى وعشرين“ (۱) میں نے بندار اور ابوموسیٰ الزمن سے ۲۲۱ھ میں احادیث نقل کیں، اسی سال یہاں سے کوچ کر کے کوفہ پہنچے خود انھیں کا بیان ہے ”دخلت الکوفة سنة ۲۲۱ھ“ (۲) میں ۲۲۱ھ میں کوفہ پہنچا، بظاہر یہیں سے عازم مکہ معظمہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر امام عبداللہ بن مسلمہ القعنسی المتوفی ۲۲۱ھ سے احادیث کی تحصیل کی۔ مکہ معظمہ سے ۲۲۲ھ میں دمشق کے لیے رخت سفر باندھا جہاں ابوالنضر اسحاق بن ابراہیم الدمشقی سے اخذ علم کیا، حافظ الآجری لکھتے ہیں کہ امام ابوداؤد نے ایک دن اسحاق الدمشقی کا ذکر کیا اور فرمایا: ”مارأیت بدمشق مثله کان کثیر البکاء کتبت عنه سنة اثنتين وعشرين“ (۳) میں نے دمشق میں ان جیسا نہیں دیکھا وہ بہت رونے والے تھے میں نے ان سے ۲۲۲ھ میں حدیثیں لکھیں، یہاں سے ۲۲۳ھ میں پھر بصرہ آگئے اور محمد بن کثیر العبدي البصری المتوفی ۲۲۳ھ کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے، اسی موقع پر ان کی ملاقات حفص بن عمر الحوضی سے ہوئی۔ (۴) بصرہ سے جانب حمص متوجہ ہوئے اور یہاں حیوة بن الشرح الحمصی المتوفی ۲۲۳ھ اور حافظ یزید بن عبد ربہ المتوفی ۲۲۴ھ نیز دیگر شیوخ حدیث سے اخذ واستفادہ کیا۔ (۵) حمص کا سفر کئی بار کیا جس کا ذکر امام ابوداؤد نے محمد بن اسماعیل بن عیاش کے تذکرہ میں کیا ہے۔ (۶)

۲۲۷ھ میں وہ بیروت وارد ہوئے اور ابن ابی سمینہ کی رفاقت میں عباس بن الولید بن مزید البیروتی سے حدیث کی نقل و سماع کیا۔ (۷) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اسفار

(۱) سوالات البوعید الآجری، ج: ۲، ص: ۱۳۴۔

(۲) تہذیب الکمال، ج: ۱۳، ص: ۲۶۵۔

(۳) سوالات البوعید الآجری، ج: ۲، ص: ۲۲۵۔

(۴) ایضاً، ج: ۱، ص: ۴۳۲۔

(۵) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۰۴۔

(۶) سوالات آجری، ج: ۲، ص: ۲۳۱۔ (۷) ایضاً، ج: ۲، ص: ۲۵۴، ۲۵۵۔

کے دوران وہ بغداد آتے جاتے رہے چنانچہ مسدود بن مسرہد کے سانحہ ارتحال کے متعلق ان کا یہ بیان ہے کہ مسدود کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی اور میں نے اس حادثہ کی خبر امام احمد بن حنبل کو دی۔ (۱) بغداد ہی کے بعض اسفار میں ان کی ملاقات امام ابو حاتم الرازی سے ہوئی اور ان کی خدمت میں بغرض سلام حاضر ہوئے۔ (۲) ۲۳۰ھ میں وہ بمقام رملہ محمد بن سماعہ الرطلی تھے تحصیل علم کرتے نظر آتے ہیں (۳) اسی سال ان کے خلف صدق ابو بکر عبداللہ بن ابوداؤد کی سحستان میں ولادت ہوئی۔ (۴)

۲۳۵ھ میں ہیشم بن خالد الجہنی سے روایت کی (۵) ہیشم ابن خالد الجہنی کوئی ہیں اس لیے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلاد شام وغیرہ سے لوٹ کر کوہ آئے اور یہیں ان سے سماعت کی۔ واللہ اعلم

برادر کبیر کی رفاقت

ان اسفار میں امام ابوداؤد کے بڑے بھائی محمد بن الاشعث السجستانی ان کے رفیق تھے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں: ”کان أخوه محمد بن الأشعث أسن منه بقليل وكان رفيقا له في الرحلة ... ومات كهلاً قبل أبي داؤد بمدة“ (۶) امام ابی داؤد کے بھائی محمد بن الاشعث ان سے کچھ بڑے تھے اور رحلت علمیہ میں ان کے رفیق سفر تھے، امام ابوداؤد سے بہت پہلے ادھیڑ عمر میں ان کی وفات ہوئی۔

وقفہ وقفہ سے وطن مالوف کی مراجعت

اس موقع پر یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگرچہ اس کی تصریح نہیں ملتی کہ امام ابوداؤد

(۱) ایضاً، ج: ۴، ص: ۵۴۔

(۲) کتاب الجرح والتعديل از عبدالرحمن بن ابی حاتم، ج: ۴، ص: ۱۰۱-۱۰۲۔

(۳) سوالات الآجری، ج: ۲، ص: ۲۹۵۔

(۴) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۲۲۔

(۵) سوالات ابو سعید الاترزی، ج: ۱، ص: ۱۸۵۔

(۶) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۲۱۔

اپنے اس پندرہ سالہ سفر میں کبھی وطن مالوف سجستان بھی گئے، مگر وہاں ان کی جائیداد، املاک اور اوقاف کا ہونا، ان کا شادی شدہ ہونا اور وطن میں بیوی کی موجودگی، نیز ۲۳۰ھ میں صاحبزادے کی پیدائش ایسے قرائن ہیں جن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے اس طویل علمی اسفار کے دوران وقفہ، وقفہ سے وہ سجستان آتے رہے تاکہ املاک و اوقاف کی نگرانی اور خانگی ضروریات کی کفالت فی الجملہ ہوتی رہے۔ البتہ ۲۳۸ھ میں امام ابوداؤد کی سحستان میں موجودگی حافظ ذہبی کی درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتی ہے۔

عبدالله بن سليمان بن الأشعث، الإمام العلامة شيخ بغداد أبو بكر السجستاني صاحب التصانيف ولد بسجستان في سنة ثلاثين ومئتين وسافر به أبوه وهو صبي فكان يقول رأيت جنازة اسحاق بن راهويه، قلت و كانت في سنة ثمان و ثلاثين و مئتين، قال وأول شيخ سمع عنه محمد بن أسلم الطوسي و سُر أبوه لجلالة محمد بن أسلم“ (۱)

الإمام، العلامة، شيخ بغداد عبداللہ بن سليمان بن الأشعث، ابو بکر السجستانی ۲۳۰ھ میں سجستان میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں ان کے والد اپنے ساتھ انھیں سفر میں لے گئے، ابو بکر عبداللہ کہتے تھے کہ میں نے نیسا پور میں اسحاق بن راہویہ کے جنازہ کو دیکھا، امام ذہبی کہتے ہیں کہ امام ابن راہویہ کے جنازہ کی یہ روایت ۲۳۸ھ میں واقع ہوئی اور اولین شیخ جن سے ابو بکر بن ابی داؤد نے سماعت کی شیخ مشرق محمد بن اسلم الطوسی ہیں۔ شیخ طوسی کی علم و فضل میں جلالت شان کی بناء پر (بیٹے کے اس معنوی شرف سے) امام ابوداؤد کو بڑی مسرت ہوئی۔

صاحبزادے ابو بکر کی معیت

اسی طرح امام الحاکم بیان کرتے ہیں:

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۲۲۔

ثم رحل بابنه أبي بكر بقية المشائخ، وجاء إلى نيسابور فسمع ابنه من إسحاق ابن منصور، ثم خرج إلى سجستان وطالع بها اسبابه، وانصرف إلى البصرة واستوطنها“ (۱)

پھر اپنے صاحبزادے ابوبکر کے ساتھ بقیہ مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نيسابور آئے جہاں صاحبزادے ابوبکر نے اسحاق بن منصور الکونج المتوفی ۲۵۱ھ سے درس حدیث لیا۔ پھر ”وطن“ بختان کی مراجعت کی اور وہاں گھر کے اسباب کا معاینہ کیا، پھر بصرہ گئے اور (آخر میں) اسی کو وطن بنا لیا۔

امام حاکم کے اس بیان میں خاصا اجمال ہے پھر بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نيسابور سے (جہاں ۲۳۸ھ میں پہنچے تھے) وطن واپس لوٹے اور گھر کے اسباب وغیرہ کی دیکھ ریکھ کے بعد پھر سماع حدیث کیلئے سفر پر روانہ ہو گئے اس سفر میں ولد رشید ابوبکر عبداللہ السجستانی ساتھ رہے، امام ابوداؤد نے اس دوران جن شیوخ سے حدیث کی سماعت کی ابوبکر بھی ان کے شریک درس رہے، ابن خلکان لکھتے ہیں وشارك اباه فی شیوخہ بمصر والشام ابوبکر اپنے والد کے مصر اور شام کے شیوخ میں ان کے شریک درس رہے۔ (۲) چنانچہ جب امام ابوداؤد مصر میں محدث احمد بن صالح المتوفی ۲۲۸ھ کی خدمت میں پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ شیخ احمد مجلس درس میں کسی امر دنو جوان کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دیتے تو امام ابوداؤد نے بیٹے کو شریک درس کرنے کیلئے ان کے چہرے پر مصنوعی داڑھی لگا دی۔ اس تدبیر سے وہ اپنے والد کے ساتھ شیخ احمد بن صالح کی مجلس میں حاضر ہوتے رہے۔ کچھ دنوں بعد کسی طرح شیخ کو اس کی خبر ہو گئی تو بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا ”أمثلی یعمل معہ ہذا؟“ کیا مجھ جیسے کے ساتھ یہ حیلہ کیا گیا، اس پر امام ابوداؤد نے معذرت کی اور عرض کیا کہ میرے اس نوعمر بیٹے کا بڑوں سے مقابلہ کر کے دیکھ لیں اگر علم و معرفت میں ان سے کمتر ٹھہرے تو پھر اسے سماع حدیث سے ضرور محروم فرمادیں، اس

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۸۔

(۲) وفیات الاعیان، ج: ۱، ص: ۳۸۲۔

پر امام احمد بن صالح مصری نے ان کا امتحان لیا تو وہ سب پر فائق نکلے، پھر بھی اپنے معمول کے مطابق انھیں مجلس درس میں حاضری کی اجازت نہیں دی، اسی بناء پر امام احمد بن صالح مصری کی جملہ مرویات کی بجائے نصف یا نصف سے کچھ زائد کی حافظ ابوبکر عبداللہ السجستانی روایت کرتے ہیں۔ (۱)

اساتذہ کرام

گذشتہ سطور سے معلوم ہو چکا ہے کہ امام ابوداؤد نے ۲۲۰ھ میں بہ عمر اٹھارہ برس تحصیل حدیث کے لیے اسفار کا آغاز کیا جو تقریباً ۲۲۰-۲۴۱ھ تک جاری رہا اس مدت میں انھوں نے سیکڑوں شیوخ سے حدیث کا سماع کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”وشیوخہ فی السنن وغیرہا نحو ثلاثمائة نفس“ (۲) کتاب السنن وغیرہ میں ان کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے ان تین سو میں سے تقریباً چوتھ (۷۴) کا نام بنام ذکر امام مزنی نے تہذیب الکمال میں کیا ہے جن میں کچھ حضرات یہ ہیں:

امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی ابن المدینی، اسحاق بن راہویہ، مسلم بن ابراہیم، عبداللہ بن مسلمہ القعنسی، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابو عمرو الحوضی، عثمان بن ابی شیبہ، ہناد ابن سری، قتیبہ بن سعید، مسدد بن مسرہ، محمد بن بشر المعروف بہ بنزار، ابوالولید الطیالسی، موسیٰ بن اسماعیل المنقری، ابو جعفر النضلی، ابوسلمہ التبوذکی، محمد بن کثیر العبیدی، قطن بن نسیر وغیرہ، اپنے سارے اساتذہ میں سے امام ابوداؤد نے بطور خاص امام احمد بن حنبل سے استفادہ کیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں ”وہو من نجباء أصحاب الإمام أحمد لازم مجلسه مدة“ وہ امام احمد کے برگزیدہ اور بڑے تلامذہ میں تھے ایک طویل مدت تک ان کی مجلس درس میں بیٹھے۔ (۳) امام ابوداؤد اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ امام احمد ہی سے متاثر تھے حتیٰ کہ

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۲۶-۲۲۷ تذکرۃ الحفاظ، ج: ۲، ص: ۷۰۰-۷۰۱۔ حافظ ذہبی نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ”یروئ یاسناد منقطع“

(۲) تہذیب التہذیب، ج: ۴، ص: ۱۵۵۔

(۳) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۵۔

سیرت و عادت اور چال ڈھال میں انھیں کی وضع کی پابندی کرتے تھے۔

کیا امام ابو داؤد کے تمام شیوخ ثقہ ہیں؟

ائمہ حدیث میں سے ایک جماعت کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی ہے کہ یہ ائمہ اخذ حدیث میں اس درجہ محتاط تھے کہ صرف انھیں راویوں سے حدیث لیتے تھے جو ان کے نزدیک ثقہ اور قابل اعتماد ہوتے تھے اس طبقہ کے محدثین میں سے امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن خالد، حریر بن عثمان، سلیمان بن حرب، امام شعبہ، عبدالرحمن بن مہدی، امام مالک، یحییٰ بن سعید القطان کے اسماء کی تصریح حافظ سخاوی نے فتح المغیث میں کی ہے۔ (۱) امام ابو داؤد کا شمار بھی محدثین کے اسی طبقہ میں کیا جاتا ہے چنانچہ حافظ ابن القطان الفاسی اپنی مشہور اور مفید ترین کتاب ”بیان الوهم والایہام الواقعیین فی کتاب الاحکام“ میں لکھتے ہیں ”و أبو داؤد إنما یروی عن ثقة عنده“ (۲) امام ابو داؤد صرف اسی سے روایت کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ثقہ ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی حسین بن علی بن الاسود کے تذکرہ میں صراحت کی ہے کہ ”إنه یعنی أبا داؤد لا یروی الا عن ثقة عنده“ (۳) امام ابو داؤد صرف اسی سے روایت کرتے ہیں جو ان کی رائے میں ثقہ ہوتا ہے۔ نیز اس کی تائید خود امام ابو داؤد کے اس قول سے بھی ہوتی ہے، حافظ آجری کا بیان ہے ”سئل أبو داؤد عن سوار بن سہل فقال : لولم أثق مارویت عنہ“ (۴) امام ابو داؤد سے سوار بن سہل البصری کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا اگر میرے نزدیک قابل اعتماد اور ثقہ نہ ہوتے تو میں ان سے روایت نہ کرتا۔

بائیں ہمہ ان کی تصانیف میں متعدد ایسے شیوخ موجود ہیں جو امام ابو داؤد کی رائے میں ثقہ نہیں ہیں اور خود انھوں نے ان کی تضعیف کی ہے مثلاً امام ابو داؤد شعیب بن ایوب

(۱) ج: ۲، ص: ۲۲، طبع وارانسی ہند۔

(۲) ج: ۳، ص: ۴۶۶، الرقم: ۱۲۲۔

(۳) تہذیب التہذیب، ج: ۲، ص: ۳۱۲۔

(۴) سوالات الآجری، ج: ۲، ص: ۸۰۔

الضریفینی کے بارے میں کہتے ہیں ”انی لأخاف الله عن الروایة عن شعیب بن ایوب“ شعیب بن ایوب سے روایت کرنے میں مجھے اللہ تعالیٰ سے ڈر لگتا ہے۔ (۱) اور امام مزنی لکھتے ہیں ”روی عنہ أبو داؤد حدیثنا واحدا“ (۲) امام ابو داؤد نے ان سے ایک روایت کی ہے۔ اسی طرح ہشام بن عبد الملک الحرانی الحمصی کے متعلق امام ابو داؤد کہتے ہیں ”شیخ ضعیف“ (۳) جب کہ امام مزنی کہتے ہیں ”روی عنہ أبو داؤد“ امام ابو داؤد نے ان سے روایت کی ہے (۴) نیز ابراہیم بن العلاء بن الضحاک الحمصی، امام ابو داؤد کے نزدیک ”لیس بشيء“ ہیں (۵) حالانکہ امام مزنی صراحت کرتے ہیں کہ امام ابو داؤد نے ان سے روایت کی ہے۔ (۶)

ان کے علاوہ اور بھی متعدد راویان حدیث ہیں جو امام ابو داؤد کی رائے میں ضعیف ہیں اور امام مزنی نے تہذیب الکمال میں انھیں امام صاحب کے شیوخ میں شمار کیا ہے؛ لیکن تین سو کی کثیر تعداد میں ان کے گنے چنے چند شیوخ کے ضعیف ہونے سے امام ابو داؤد کی یہ خصوصیت کہ ”لا یروی الا عن ثقة عنده“ متاثر نہیں ہوگی کیونکہ نادر و شاذ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

کتاب ”السنن“ کی تالیف

امام ابو داؤد مصر میں احمد بن صالح وغیرہ شیوخ مصر سے سماع حدیث کے بعد دیگر بلاد اسلامیہ کے محدثین سے اخذ و استفادہ کرتے ہوئے طرسوس وارد ہوئے اور وہیں بیس سال مقیم رہ کر کتاب السنن کی جمع و ترتیب کا عظیم الشان کام انجام دیا۔ امام نووی رقمطراز ہیں:

”ذکر محمد بن صالح الهاشمی قال لنا أبو داؤد: وأقمت بطرسوس عشرين سنة أكتب المسند فکتبت أربعة آلاف حدیث، ثم نظرت فإذا مدار

(۱) سوالات الآجری، ج: ۲، ص: ۲۹۹۔ (۲) تہذیب الکمال الرقم ۲۷۲۔

(۳) سوالات الآجری، ج: ۲، ص: ۲۵۱۔ (۴) تہذیب الکمال الرقم ۱۷۸۔

(۵) سوالات الآجری، ج: ۲، ص: ۲۲۹۔ (۶) تہذیب الکمال رقم الترجمة ۲۱۸۔

أربعة آلاف على أربعة أحاديث لمن وقفه الله تعالى“ (۱)

محمد بن صالح الہاشمی نے ذکر کیا کہ ہم سے امام ابوداؤد نے فرمایا میں طرسوس میں بیس سال مقیم رہا اس مدت میں مسند (یعنی کتاب السنن) کو لکھتا رہا میں نے اس میں چار ہزار حدیثیں درج کیں پھر میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ ان چار ہزار حدیثوں کا مدار چار احادیث پر ہے ایسے شخص کے لیے جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔

امام ابوداؤد کا طرسوس میں یہ قیام ۴۱-۲۴۰ھ کی حدود میں ہوا ہے کیونکہ خود ان کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۲۴۲ھ میں طرسوس میں موجود تھے، حافظ الآجری لکھتے ہیں:

”سمعت أبا داؤد يقول: مات حامد بن يحيى بطرسوس في يوم مطير

ما قدرنا أن نخرج في الجنزة“ (۲)

میں نے امام ابوداؤد سے کہتے ہوئے سنا کہ حامد بن یحییٰ (بن ہانی الہاشمی ابو عبد اللہ ذیل طرسوس) کی وفات تیز بارش کے دن ہوئی جس کی بناء پر ہم ان کے جنازہ میں نہیں جاسکے۔

علمائے رجال بغیر اختلاف کے لکھتے ہیں کہ حامد بن یحییٰ کا انتقال ۲۴۲ھ میں ہوا ہے۔ محمد بن صالح الہاشمی کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ”کتاب السنن“ کی تالیف کا کام ۲۶۰ھ کے لگ بھگ انجام کو پہنچا۔

امام خطیب کی روایت پر ایک نظر

لیکن اس کے برخلاف امام خطیب بغدادی لکھتے ہیں: ”و يقال إنه صنفه قديما وعرضه على أحمد بن حنبل فاستجاده و استحسناه“ (۳) اور کہا گیا ہے کہ امام ابوداؤد نے کتاب السنن ابتدائی زمانہ میں تصنیف کر لی تھی اور اسے امام احمد المتوفی ۲۴۱ھ (۱) تہذیب الاسماء واللغات، ج: ۲، ص: ۲۲۶، حافظ سلفی نے بھی اپنے مقدمہ معالم السنن للخطابی میں اپنی سند سے محمد بن صالح الہاشمی کی یہ روایت درج کی ہے۔

(۲) سوالات الآجری، ج: ۲، ص: ۲۵۵۔ (۳) تاریخ بغداد، ج: ۹، ص: ۵۶۔

کی خدمت میں پیش کیا تو امام احمد نے کتاب کی خوبی کو سراہا اور اس کی تحسین فرمائی۔

خطیب بغدادی کی اس معلق، بصیغہ تمریض روایت کو انھیں کے حوالہ سے حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں، امام مزنی نے تہذیب الکمال میں، امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے نیز حافظ سلفی نے امام خطابی کی شرح معالم السنن کے مقدمہ میں بایں الفاظ اس روایت کا ذکر کیا ہے ”حين عرض كتاب أبي داؤد على أحمد بن حنبل وراه، استحسناه وارتضاه، وحسبه ذلك فخرا“ (۱) جس وقت امام ابوداؤد کی کتاب امام احمد بن حنبل کو پیش کی گئی اور امام صاحب نے اس کو ملاحظہ کیا تو اس کی تحسین کی اور پسندیدگی کا اظہار کیا، امام ابوداؤد کے فخر کے لیے یہ بات کافی ہے۔

مگر اس روایت کی صحت پر اعتماد درج ذیل وجوہ سے مشکل ہے:

(الف) یہ روایت بے سند، بصیغہ تضعیف ذکر کی گئی ہے۔

(ب) امام ابوداؤد کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی اور تحصیل علم کے لیے انھوں نے ۲۲۰ھ میں گھر سے قدم باہر نکالا اور علمی اسفار کا آغاز کیا امام احمد بن حنبل کی وفات ۲۴۱ھ کے وقت امام ابوداؤد کی عمر ۳۹ سال کی تھی اور بروایت ابن صالح الہاشمی خود امام صاحب نے یہ صراحت کی ہے کہ کتاب ”السنن“ کی تدوین و تالیف میں ۲۰ سال صرف ہوئے، لہذا امام احمد کی خدمت میں کتاب مذکور پیش کرنے کی یہ روایت اگر صحیح مان لی جائے تو لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ امام ابوداؤد نے ۱۹ برس کی عمر میں کتاب کی تصنیف کا آغاز کر دیا تھا جب کہ ان کی رحلت علمیہ اور شیوخ سے سماع حدیث کا یہ دوسرا سال ہی ہے، تعلیم و تحصیل کے ابتدائی مرحلہ میں اس طرح کے کام کا تصور بعید از عقل و قیاس ہے۔

(ج) امام ابوداؤد کے نامور تلمیذ، کتاب ”السنن“ کے راوی ابو بکر ابن داسد کا بیان ہے کہ میں نے امام صاحب سے فرماتے ہوئے سنا کہ ”میں نے (شیوخ حدیث سے)

(۱) معالم السنن، ج: ۴، ص: ۳۵۸ طبع مصر و مختصر سنن ابی داؤد و لمندری مع معالم السنن و تہذیب لابن القیم، ج: ۸، ص: ۱۴۲۔

آنحضرت کی پانچ لاکھ حدیثیں نقل کیں، کتاب ”السنن“ اسی عظیم ذخیرہ سے منتخب احادیث پر مشتمل ہے جن کی تعداد چار ہزار آٹھ سو ہے نیز اس منتخب مجموعہ میں صحیح، مشابہ صحیح اور صحیح سے فریب حدیثیں ذکر کی ہیں“ (۱)

ظاہر ہے کہ پانچ لاکھ احادیث کا یہ عظیم ذخیرہ تحصیل و تعلیم کے ابتدائی مرحلہ میں محفوظ نہیں کیا جاسکتا بلکہ بلاد اسلامیہ میں پھیلے شیوخ اور مشرق و مغرب کے مراکز علمیہ سے ایک زمانہ تک اخذ و استفادہ کے بعد ہی اس پر دسترس حاصل ہو سکتی ہے۔ پھر احادیث کے اس بحرِ خازن سے مقصد کے مطابق موتیوں کا انتخاب و استخراج، ان کے رجال کی تحقیق اور صحیح و لائق استدلال احادیث کی ضعیف و ناقابل استدلال روایتوں سے تمیز، پھر ان سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط وغیرہ ایسے امور ہیں جو انتہائی بحر، طویل بحث و نظر اور ژرف نگاہی کو چاہتے ہیں جن کا تصور ایک ایسے طالب علم سے جو ابھی اخذ و طلب کے ابتدائی مرحلہ میں ہونہایت بعید ہے۔

بصرہ کی سکونت

حدیث پاک کی تحصیل کے لیے ۲۲۰ھ میں امام ابو داؤد گھر سے نکلے، مراکز علمیہ اور شیوخ حدیث کی مجالس درس میں حاضری کی غرض سے تقریباً بیس بائیس سال تک بلاد اسلامیہ میں چکر کاٹتے رہے، ان علمی اسفار میں ان کا مرکز نقل بغداد تھا جہاں گھوم پھر کر پہنچ جاتے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں: ”وقدم بغداد غیر مرة“ بغداد بار بار گئے، اس دوران اگرچہ کبھی کبھی وطن مالوف بھستان کی مراجعت کا بھی اتفاق ہوا، ورنہ لیلائے مطلوب کی طلب و جستجو میں ان کی زندگی کے اکثر ایام دیا ر غربت ہی میں بسر ہوئے۔ طرسوس کے بیس (۱) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۰۹-۲۱۰، تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۳، الرقم ۲۲۷۶، تاریخ بغداد، ج: ۹، ص: ۵۷۔

عصر حاضر کے نامور عالم اور مشہور محقق علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ نے بھی ”رسالة الإمام ابی داؤد السجستانی إلى أهل مكة فی وصف سننہ“ کی تحقیق و تعلیق کے مقدمہ میں اس روایت کے داخلی و خارجی وجوہ ضعف پر قریب قریب یہی تنبیہ کی ہے۔ دیکھئے رسالہ مذکور کا مقدمہ، ص: ۱۲-۱۳۔

سالہ قیام اور کتاب ”السنن“ کی تکمیل کے بعد گھوم پھر کر آخری بار وہ پھر بغداد پہنچے، مگر اب امام ابو داؤد اخذ و استفادہ کی منزل سے گزر کر مشینیت و امامت کے درجہ پر فائز ہو چکے تھے اور ان کی عظمت و مقبولیت کا آفتاب نصف النہار کی بلندیوں کو چھو رہا تھا، تشنگان علوم حدیث جوق در جوق ان کی خدمت میں آتے اور ان کے چشمہ فیاض سے خاطر خواہ سیراب ہوتے تھے، ان کی مرجعیت اور ان کے گرد شاہقین علوم حدیث کے ازدحام کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ وقت کے بھائی اور صاحب اقتدار ولی عہد ان سے درخواست کرتا ہے کہ آپ مستقل طور پر بصرہ میں سکونت فرمائیں تاکہ آپ کے وجود باوجود کی برکت اور آپ کی مجلس درس میں طلبہ کی کثرت سے بصرہ دوبارہ آباد ہو جائے اور اس کی اجڑی ہوئی رونق پھر لوٹ آئے۔ امام خطابی اپنی سند سے لکھتے ہیں:

فقد روی خادمہ أبو بکر بن جابر قال : كنت معہ ببغداد فصلینا المغرب اذ قرع الباب ففتحته فاذا خادم یقول : هذا الامیر أبو أحمد الموفق یستاذن، فدخلت إلی أبی داؤد فاخبرته بمكانه فأذن له، فدخل وقعد ثم أقبل علیہ أبو داؤد وقال: ما جاء بالأمر فی مثل هذا الوقت؟ قال : خلال ثلاث، فقال ماہی؟

قال : تنتقل البصرة فتتخذها وطناً لیرحل إلیک طلبۃ العلم من أقطار الأرض فتعمر بک، فإنها قد خربت وانقطع عنها الناس لما جرى علیہا من محنة الزنج۔

۱۔ علی بن عبد الرحیم المعروف بصاحب الزنج کا فتنہ ۲۵۲ھ میں رونما ہوا اور ۲۵۵ھ میں اس نے بصرہ پر اپنا ظالمانہ تسلط قائم کر لیا تقریباً ۱۲ ہزار بصریوں کو قتل کیا، بیشار لوگ جان بچانے کے لیے آبادیوں سے بھاگ کر جنگلوں میں روپوش ہو گئے، جان و مال کے علاوہ عزت و آبرو بھی اس کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی حتیٰ کہ سادات کی عزت مآب خواتین کو ٹولڈیاں بنا کر برسر عام نیلام کیا، ان مظالم اور تباہ کاریوں کی وجہ سے بصرہ جو اسلامی علوم و ثقافت کا ایک اہم مرکز تھا بالکل ویران ہو گیا بصرہ کی عظیم جامع مسجد جو ہاں کی علمی سرگرمیوں کا مرکز تھی سناں ہو گئی۔ عراق اور اس کے شہروں کی اس زبوں حالی سے متاثر ہو کر بالآخر خلیفہ وقت معتد کا بھائی ابو احمد الموفق اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے خود میدان میں اتر اور شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ زنگی مقابلہ میں ٹھہرنہ سکے اور ۲۷۰ھ میں خود صاحب الزنج یعنی علی بن عبد الرحیم کو قتل کر کے اللہ کی مخلوق کو اس کے ظلم و تشدد سے ہمیشہ کے لیے نجات دیدی اور بصرہ وغیرہ اسلامی شہروں میں پھر سے امن و امان کی فضا بحال کر دی، ”محنة الزنج“ کے الفاظ سے اسی فتنہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

فقال هذه واحدة، هات الثانية .

قال: وتروى لأولادى كتاب السنن ، فقال : نعم ، هات الثالثة .

قال و تفرد لهم مجلسا للرواية، فإن أولاد الخلفاء لا يقعدون مع العامة.

فقال : اما هذه فلا سبيل إليها لأن الناس شريفهم و وضعهم فى

العلم سواء .

قال ابن جابر فكانوا يحضرون بعد ذلك ويقعدون فى كم حيرى و

يضرب بينهم و بين الناس ستر فيسمعون مع العامة. (۱)

امام ابوداؤد کے خادم ابوبکر بن جابر کا بیان ہے کہ میں امام صاحب کے ساتھ بغداد

میں تھا نماز مغرب سے فراغت کے بعد دروازہ پر دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا تو ایک

خادم نے کہا امیر ابوجامد الموفق حاضری کی اجازت چاہتے ہیں، میں نے امام صاحب کو

اسکی اطلاع دی، امام صاحب نے انھیں تشریف لانے کی اجازت دی۔ چنانچہ وہ اندر آ کر

بیٹھے تو امام صاحب ان کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اس وقت امیر نے کیوں تشریف

لانے کی زحمت کی؟ تو امیر الموفق نے کہا تین باتوں کے تحت حاضری ہوئی ہے۔ امام

صاحب نے فرمایا وہ کیا ہیں؟ (۱) امیر نے کہا آپ بصرہ تشریف لے چلیں اور اسے وطن

بنالیں تاکہ اطراف عالم سے طلبہ کوچ کر کے آپ کی خدمت میں آئیں اور بصرہ آپ کے

وجود سے آباد ہو جائے کیونکہ وہ زنگیوں کے فساد سے ویران ہو گیا ہے، امام صاحب نے

فرمایا یہ پہلی بات ہوئی، دوسری پیش کیجئے۔ (۲) امیر نے کہا میری اولاد کو کتاب السنن پڑھا

دیجئے، امام صاحب نے فرمایا ٹھیک ہے، تیسری بات بیان فرمائیں، (۳) امیر الموفق

بولے ان کی تعلیم کے لیے الگ مجلس درس کا اہتمام کریں کیونکہ خلفاء کی اولاد عام لوگوں

کے ساتھ نہیں بیٹھتی، امام صاحب نے اس تیسری بات پر فرمایا کہ اس کے قبول کیے جانے

کی کوئی صورت نہیں ہے اس لیے کہ تعلیم کے معاملہ میں شریف و غیر شریف سب برابر

ہیں، ابوبکر ابن جابر کا بیان ہے کہ امیر الموفق کے لڑکے پڑھنے کے لیے آتے (اور حریری

(۱) معالم السنن، ج: ۱، ص: ۱۲۰، مختصر تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۲۳۷، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۶

چادر میں بیٹھتے البتہ) ان کے اور عام لوگوں کے درمیان ایک پردہ ڈال دیا جاتا اور سب کے ساتھ ہی حدیث پاک کی سماعت کرتے۔

امیر ابوجامد الموفق کی یہی خواہش بصرہ میں امام ابوداؤد کی مستقل سکونت کا سبب بنی

اور وہ ۲۷۱ھ میں بغداد سے منتقل ہو کر بصرہ آ گئے۔ سنن ابوداؤد کے معروف راوی ابن

داسہ بصری کے ایک بیان سے (جسے حافظ ابوطاہر السلفی نے معالم السنن شرح سنن

ابوداؤد کے اپنے مقدمہ میں خود اپنی سند سے روایت کیا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ میں

امام ابوداؤد کا قیام قدیمی شہر ”أبلہ“ میں تھا۔ (۱)

تاریخ وفات اور مقام تدفین

بصرہ کو وطن اور اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنا لینے کے بعد انھوں نے کہیں اور کا قصد

نہیں کیا اور زندگی کے باقی ماندہ ایام یہیں گزار کر ۱۶ شوال ۲۷۵ھ بروز جمعہ اس دنیائے

بے ثبات سے دار جاودانی کو رحلت کر گئے، ابن المنادی کا بیان ہے ”ودخلها (یعنی

بغداد) أبو داؤد السجستانی مرارا ثم خرج منها آخر مراته فى أول سنة إحدى

وسبعين إلى البصرة فنزلها ومات بها فى سنة ۲۷۵ھ“ (۲) امام ابوداؤد بختانی بارہا

بغداد آئے وہاں سے آخری بار ۲۷۱ھ میں نکلے اور بصرہ جا کر مستقل طور پر آباد ہو گئے اور

وہیں ۲۷۵ھ میں وفات پائی۔

وفیات الاعیان میں جمعہ کی اور سیر الاعلام، تذکرۃ الحفاظ، تہذیب الاسماء واللغات

وغیرہ میں تاریخ اور مہینہ کی تصریح موجود ہے۔ (۳)

(۱) تفصیل و تحقیق کے لیے امام سلفی کا مقدمہ معالم السنن مطبوعہ مختصر سنن ابی داؤد للمندری ومعالم السنن

للخطابی و تہذیب لابن القیم، ج: ۸، ص: ۱۵۲-۱۵۳ ملاحظہ کیجئے اور ”الأبلہ“ سے متعلق تفصیلات کے لیے

”یا قوت حموی“ کی معجم البلدان، ج: ۱، ص: ۱۷۱ دیکھئے۔

(۲) تاریخ بغداد، ج: ۹، ص: ۵۸-۵۹۔

(۳) وفیات الاعیان، ج: ۱، ص: ۳۸۳ مطبوعہ بیروت ۱۴۱۷ھ، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۲۱، تذکرۃ الحفاظ،

ج: ۲، ص: ۵۹۳ تہذیب الاسماء واللغات، ج: ۲، ص: ۲۲۷۔

وفات سے پہلے یہ وصیت کی تھی کہ ”أن يغسله الحسن بن المثنى فإن اتفق، وإلا نظرُوا في كتاب سليمان بن حرب عن حماد بن زيد في الغسل، فعملوا به“ (۱) اگر ممکن ہو تو میری میت کو غسل ”حسن بن ثنی“ دیں، ورنہ سلیمان بن حرب کی کتاب میں غسل سے متعلق جو احادیث بروایت حماد بن زید ہیں دیکھ لی جائیں چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا۔ نماز جنازہ عباس بن الواحد الباشمی کی امامت میں ادا کی گئی۔ (۲) اور امیر المؤمنین فی الحدیث سفیان ثوری کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ (۳)

تلامذہ

امام ابوداؤد مقبولیت و مرجعیت کے جس بلند و بالا مقام پر فائز تھے اور ان کے حلقہٴ درس میں طلبہٴ علوم کا جس کثرت سے ورود ہوا کرتا تھا اس کا بڑی حد تک اندازہ اوپر مذکور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ زنگیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد بصرہ کی تعمیر نو اور اس کی گزشتہ علمی رونق کی بازیابی کے لیے حکومت وقت کے اہم ترین رکن نے انھیں بصرہ میں قیام پذیر ہونے کی دعوت دی، لہذا بلا تردد کہا جاسکتا ہے کہ امام ابوداؤد کے شاگردوں اور ان سے مستفیدین کی تعداد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہوگی جنھیں شمار میں لانا مشکل ہے، اس کثیر تعداد میں سے تقریباً سینتالیس کے ناموں کا ذکر امام مزنی نے تہذیب الکمال میں کیا ہے۔ (۴) جن میں کچھ ائمہ مشاہیر یہ ہیں:

(۱) تہذیب التہذیب، ج: ۴، ص: ۱۵۶۔

۲۔ حسن بن ثنی بن معاذ ابو محمد العمری المتوفی ۲۹۴ھ اکابر فضلاء محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ ورع و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں مشہور زمانہ تھے۔ ابتداء میں حدیث کی روایت سے بچتے تھے بعد میں منامی تنبیہ پر روایت کرنے لگے تھے امام طبرانی کے شیوخ میں تھے۔ سیر اعلام النبلاء ج: ۱۳، ص: ۵۲۶-۵۲۷ = عباس الباشمی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

(۲) تاریخ بغداد، ج: ۹، ص: ۵۹ مقدمہ معالم السنن از حافظ سلّفی، معالم السنن، ج: ۸، ص: ۱۵۷، تحقیق احمد محمد شاکر و محمد حامد الفقی دار المعرفۃ بیروت۔

(۳) البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۶۵۔

(۴) تہذیب الکمال، ج: ۳۔

امام ترمذی، امام نسائی، امام ابو عوانہ اسفرائینی، امام ابن ابی الدنیا، امام ابو بشر محمد بن احمد دولابی، امام محمد بن نصر مروزی، امام زکریا ساجی آپ کے خلف الصدق امام ابو بکر عبداللہ سجستانی، عبدالرحمن بن خلاد رام ہرمزی، ابو بکر محمد بن یحییٰ صولی وغیرہ، علوم حدیث کی وہ مقتدر اور عظیم المرتبت شخصیات ہیں جن کے نام و کام سے علم حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی ایک حد تک واقفیت رکھتا ہے۔

اور خاص وہ تلامذہ جنھوں نے امام صاحب سے کتاب السنن کی سماعت و روایت کی ان میں معروف یہ ہیں: ابوالحسن علی بن الحسن بن العبد الانصاری، المتوفی ۳۲۸ھ، ابواسامہ محمد بن عبدالملک بن یزید الرواس، ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد المعروف بہ ابن الاعرابی المتوفی ۳۴۰ھ، ابوعلی محمد بن احمد اللؤلؤی المتوفی ۳۳۰ھ، ابو بکر محمد بن بکر بن داسہ التمار المتوفی ۳۴۵ھ، ابوسالم محمد بن سعید الجلودی، ابو عمر واحد بن علی بن حسن البصری، تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی ان ساتوں اصحاب کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں ”فہؤلاء السبعة رووا عنه سننہ“ ان ساتوں نے امام ابوداؤد سے ان کی سنن روایت کی ہے۔ (۱)

اور سیر اعلام النبلاء میں ابوالطیب احمد بن ابراہیم بن عبدالرحمن الاشنانی کے بارے میں راوی السنن ہونے کی تصریح کی ہے نیز ابو عیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید الرملی کے متعلق لکھا ہے کہ یہ امام ابوداؤد کے وِزاق تھے یعنی امام صاحب کی خدمت میں یہی سنن کی قرأت کیا کرتے تھے، اس لیے یہ بھی سنن کے راوی ہوئے اور حافظ ابن حجر نے ان نوؤں اصحاب کا نام شمار کرنے کے بعد لکھا ہے ”وہؤلاء رواة السنن عنہ“ (۲) ان کے علاوہ محمد بن احمد بن یعقوب المتوفی البصری کتاب ”الرد علی اہل القدر“ کے راوی ہیں اور ابو بکر احمد بن سلیمان التجاد المتوفی ۳۲۸ھ کتاب النسخ و المنسوخ کی روایت کرتے ہیں، حافظ ابن کثیر ان کے بارے میں لکھتے ہیں ”ہو آخر من روی عنہ فی الدنیا“ یعنی امام ابوداؤد سے براہ راست روایت کرنے والے یہ دنیا میں آخری راوی تھے۔ (۳) نیز ابو عبید

(۱) ج: ۴، ص: ۲۹۱-۲۹۲۔ (۲) تہذیب التہذیب، ج: ۴، ص: ۱۵۴۔

(۳) البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۶۵۔

محمد بن علی بن عثمان الآجرمی إجاباته عن سوالات أبي عبید الآجرمی اور تسمية الإخوة الذين روى عنهم الحديث کے راوی ہیں۔ اور اسماعیل بن محمد الصفار "مسند مالک" کے راوی ہیں۔

امام ابوداؤد کے یہ تیرہ وہ مخصوص تلامذہ ہیں جنہوں نے ان سے کتاب السنن یا ان کی دیگر تصانیف روایت کی ہیں ان کے علاوہ بھی نامور تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے جن کا اس موقع پر ذکر موجب طوالت ہوگا، تفصیل کے طالب تہذیب التہذیب، سیر اعلام النبلاء، تذکرہ الحفاظ اور بطور خاص تہذیب الکمال کی مراجعت کریں۔

ایک عظیم شرف

امام ابوداؤد کے شرف و مجد کے لیے یہی کیا کم ہے کہ ان کے گلستان علم کی خوشہ چیں حفاظ حدیث اور اکابر محدثین کی ایک بڑی جماعت ہے جس میں اصول ستہ کے دو مصنف یعنی امام ابو عیسیٰ الترمذی اور امام ابو عبد الرحمن النسائی بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ انہیں ایک ایسا عظیم شرف اور اعزاز حاصل ہے جس میں اصحاب ستہ میں سے کوئی اور ان کا شریک و سہیم

۱۔ امام ترمذی نے اپنی سنن کی کتاب الدعوات کے آخری باب میں ایک حدیث امام ابوداؤد سے بایں سند درج کی ہے: حدثنا ابو داؤد سليمان بن الأشعث السجزي حدثنا قطن البصري عن انس الخ اسی طرح "باب ماجاء فی الصائم یذرع العقی" میں بواسطہ امام ابوداؤد: امام احمد سے عبد اللہ بن زید کی توثیق نقل کی ہے۔

@ امام نسائی نے اپنی سنن (مجتبئی) میں متعدد روایتیں حدیث ابوداؤد کے الفاظ سے بیان کی ہیں اور ظاہر یہی ہے کہ نسائی کے شیخ امام ابوداؤد البجستانی ہی ہیں چنانچہ حافظ مزنی لکھتے ہیں "وروی النسائی فی السنن عن أبي داؤد، عن سليمان بن حرب، و عبد الله بن محمد النفيلي، و عبد العزيز بن يحيى الحراني، و علي ابن المديني، و عمرو بن عون الواسطي، و مسلم بن إبراهيم، و أبي الوليد الطيالسي، و روى (ای النسائی) فی کتاب "يوم وليلة" عن أبي داؤد عن محمد بن كثير العبدی والظاهر أن أبا داؤد فی هذا كله هو السجستاني فانه معروف بالرواية عن هؤلاء وقد شاركه ابو داؤد سليمان بن سيف الحراني فی بعضهم، و روى (ای النسائی) عنه فی کتاب الكنى و سماه ولم يكنه و ذكر الحافظ أبو القاسم فی "المشايخ النبيل" أن النسائی أيضا روى عنه" (تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۴، رقم الترجمہ: ۲۳۷)

حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے بھی امام مزنی کی بیان کردہ اس تفصیل کو سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۰۷، اور تہذیب التہذیب، ج: ۴، ص: ۱۵۴ میں نقل کیا ہے۔

نہیں ہے۔ وہ یہ کہ ائمہ اربعہ کے چوتھے امام، آپ کے استاذ کبیر، امام السنہ احمد بن حنبل بھی آپ سے حدیث پاک کی نقل و سماعت کرنے والوں کی صف میں شامل ہیں۔ خود امام ابوداؤد کو اپنے اس شرف پر ناز تھا اور تحدیث نعمت کے طور سے بیان کیا کرتے تھے۔

چنانچہ حافظ مزنی بواسطہ ابوبکر الخلال لکھتے ہیں: "وسمع أحمد بن حنبل منه حديثاً واحداً كان أبو داؤد يذكره (۱) امام احمد بن حنبل نے ابوداؤد سے ایک حدیث سنی تھی جس کا ذکر امام ابوداؤد (تحدیث نعمت کے طور پر) کیا کرتے تھے، امام خطیب بغدادی نے اس حدیث واحد کو اپنی سند سے بطریق امام ابوداؤد ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

عن ابى العُشراء عن أبيه أن النبى صلى الله عليه وسلم سئل عن العتيرة فحسنها" (۲) امام ابوداؤد نے کہا میں نے یہ حدیث امام احمد بن حنبل سے بیان کی تو اسے پسند کیا اور فرمایا کہ یہ ایک غریب و نادر حدیث ہے پھر مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ ذرا بیٹھو اور خود گھر کے اندر سے دوات، قلم اور کاغذ لے کر آئے اور کہا کہ یہ حدیث مجھے لکھا دو (ان کے حکم کے مطابق اس حدیث کا میں نے انہیں املا کر دیا) پھر ایک دوسرے دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اتفاق سے ابو جعفر ابن ابی سمینہ بھی آگئے تو امام احمد بن حنبل نے ان سے کہا ابوداؤد کے پاس ایک غریب حدیث ہے تم اسے لکھ لو چنانچہ ابو جعفر نے مجھ سے اس حدیث کو املا کرانے کے لیے کہا تو میں نے انہیں بھی لکھوا دی۔

ضروری تنبیہ

یہی اوپر مذکور وہ حدیث عمیرہ ہے جس کی روایت امام احمد بن حنبل نے امام ابوداؤد سجستانی سے کی ہے جب کہ علامہ محمود السبکی نے اپنی مشہور و مفید کتاب "المُنهل العذب المورود" شرح سنن ابی داؤد کے مقدمہ میں اس کا مصداق حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً

(۱) تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۴۔

۲ امام ذہبی ابوالعشراء کی اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: "هذا حديث منكر تُكَلِّم في ابن قيس من اجله" سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۱۔

(۲) تاریخ بغداد، ج: ۹، ص: ۵۷-۵۸ و تہذیب تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۲۳۶۔

مروی حدیث ”لا فرع ولا عتيرة الخ“ کو بتایا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث سے متعلق خطیب بغدادی کے کلام سے ان کی نظر چوک گئی ورنہ اس حدیث کا صحیح مصداق سمجھنے میں ان سے یہ غلطی نہ ہوتی۔ چنانچہ محدث کبیر علامہ محمد یوسف بنوری ”بذل الجہود“ کے اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”هذا هو حدیث العتيرة الذی رواه عنه أحمد لاما فهمه محمود السبکی فی المنهل العذب المورود، ولعله لم یقف علی کلام الخطیب فقال وهو حدیث ”لا فرع ولا عتيرة“ مارواه احمد والبخاری ومسلم، فتنبه“۔

علمی مقام و مرتبہ

امام ابوداؤد ان کا بر محمد شین کی صف میں شامل ہیں جنہوں نے علوم حدیث کی تحصیل میں پوری جانفشانی اور خصوصی توجہ کی اور اس مبارک فن میں درجہ کمال پر فائز ہوئے۔ یہ ایک مسلم اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ علوم و فنون کے اخذ و تحصیل نیز فہم و ادراک میں کسی بھی فن کے علماء ایک درجہ کے نہیں ہوتے بلکہ ان میں فرق مراتب ہے، اسی طرح علمائے حدیث کے بھی مختلف درجات ہیں، جنہیں عام طور پر تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ علوم حدیث کے تین مرحلے ہیں:

اخذ حدیث کے تین مرحلے

۱- حفظ و جمع اور روایت کا مرحلہ ہے، بہت سے محدثین اسی درجہ پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں اس سے آگے بڑھنے کی ان میں طلب و ہمت نہیں ہوتی یا اس کے مواقع حاصل نہیں ہوتے ہیں پھر ان میں بھی روایات کی قلت و کثرت کے لحاظ سے متعدد درجات ہوتے ہیں۔

۲- جمع و حفظ کے ساتھ صحیح و ضعیف، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور غیر ثابت روایات کی معرفت اور ان میں فرق و امتیاز کی صلاحیت پیدا کرنا اس درجہ پر پہنچنے کے لیے بہت سارے علوم سے واقفیت درکار ہوتی ہے بالخصوص جرح و تعدیل، اتصال و

انقطاع وغیرہ سے متعلق اصول و احکام کی وافر معلومات ضروری ہوتی ہے اس لیے پہلے درجہ کے بالمقابل اس درجہ کے حاملین کی تعداد کم ہے۔ اس درجہ پر فائز محدثین، صحیح و ضعیف قابل حجت اور ناقابل حجت روایات کی شناخت کر لیتے ہیں مگر ان سے صحیح طور پر شرعی احکام و مسائل کا استخراج ان کے بس میں نہیں ہوتا۔

۳- اس مرحلہ میں ایک محدث پہلے اور دوسرے درجے سے گزر کر احادیث رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے احکام و مسائل کے استنباط و استخراج کی قوت و صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تاکہ ان احکام پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کے لیے عمل کی راہ ہموار اور آسان کر دے اس درجہ کی تحصیل میں علم و عمل اور تجربات کے وسیع تر میدان سے گزرنا پڑتا ہے اور اسے عبور کرنے کے لیے قدم قدم پر ژرف نگاہی اور روشن ضمیری کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے اس درجہ پر فائز دوسرے درجہ کے حاملین سے بھی کم ہوتے ہیں۔

وہ محدثین عظام جو ان تینوں درجات کے حامل ہیں درحقیقت یہی وہ فقہائے محدثین اور ائمہ دین ہیں جنہوں نے خدائے حکیم و قدیر کی حکمت بالغہ و تدبیر نافذہ کے تحت اللہ رب العزت کے پسندیدہ دین کی حفاظت و صیانت کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اور انہیں کی مساعی جلیلہ کا یہ ثمرہ ہے کہ اسلام اپنی اصل اور کامل شکل میں آج بھی انسانیت کی صحیح رہنمائی کر رہا ہے۔

اور بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ امام ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی محدثین عظام کے اسی آخری طبقہ کے ایک فرد کامل ہیں۔ وہ حافظ حدیث بھی ہیں، ناقد حدیث بھی اور فقہ حدیث کے زبردست عالم بھی ہیں جس پر ان کی کتاب ”السنن“ شاہد عدل اور روشن دلیل ہے۔

اگر امام یحییٰ بن معین نے اپنے دست خاص سے دس لاکھ حدیثیں لکھیں، امام احمد ابن حنبل نے سات لاکھ سے زائد احادیث سے انتخاب کر کے اپنی مسند تیار کی، امام ابوزرعہ رازی کو چھ لاکھ احادیث محفوظ تھیں، امام بخاری نے اپنی ”الجامع الصحیح“ کی

۷ امام احمد اور حافظ ابوبکر محمد بن عمر الرازی سے منقول ہے کہ امام ابوزرعہ کو سات لاکھ احادیث یاد تھیں۔

احادیث کی تخریج چھ لاکھ حدیثوں سے کی ہے، اور امام مسلم نے اپنی صحیح کی تخریج تین لاکھ حدیثوں سے کی ہے، تو امام ابو داؤد نے بھی پانچ لاکھ حدیثوں سے انتخاب کر کے اپنی سنن کی تالیف کی ہے امام ابو داؤد کے تلمیذ رشید اور کتاب السنن کے راوی ابو بکر ابن داسہ کا بیان ہے: ”سمعت أبا داؤد يقول كتبت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم خمس مائة ألف حديث انتخبت منها ما ضمنته هذا الكتاب. يعني السنن جمعت فيه أربعة آلاف وثمان مائة حديث وذكرت الصحيح وما يشبهه ويقاربه“ (۱)

میں نے امام ابو داؤد کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھیں اور انہی پانچ لاکھوں سے ان احادیث کا انتخاب کیا ہے جو کتاب السنن میں ہیں۔ میں نے اس میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں جمع کی ہیں اور اس میں صحیح، مشابہ صحیح اور قریب صحیح احادیث ذکر کی ہیں۔

تاریخ رجال میں مہارت

دیگر فقہائے محدثین کی طرح امام ابو داؤد کو بھی صحیح و ضعیف احادیث کی معرفت اور ان میں فرق و امتیاز کی شدید ضرورت تھی تاکہ وہ لائق احتجاج روایتوں سے مسائل فقہ کا استنباط و استخراج کر سکیں جو ان کی کتاب السنن کا موضوع اور مقصود اصلی ہے چنانچہ وہ اپنے ”رسالہ“ میں جو اہل مکہ کو تحریر کیا تھا سنن میں موجود احادیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

”وليس في كتاب السنن الذي صنفته عن رجل متروك الحديث شيء، وإذا كان فيه حديث منكر بينت انه منكر وليس على نحوه في الباب غيره“ (۲)

میر کی تصنیف کردہ کتاب السنن میں کوئی روایت متروک الحدیث سے مروی

(۱) تاریخ بغداد، ج: ۹، ص: ۵۷، تہذیب تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۲۲۷، تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۴، رقم الترمذیہ ۶۲۷۷۔

(۲) رسالۃ الامام ابی داؤد السجستانی الی اہل مکة فی وصف سننہ، ص: ۳۳، مطبوعہ ۱۴۱۶ھ بہ تحقیق الشیخ عبدالفتاح ابو غندہ۔

نہیں ہے اور جب اس میں کوئی منکر حدیث ہوتی ہے تو میں اس کی نکارت کو واضح کر دیتا ہوں، (اس نوع کی روایت اسی صورت میں لائی گئی ہے کہ) اس باب میں اس کے علاوہ کوئی اور حدیث نہیں تھی۔ چند سطروں کے بعد مزید لکھتے ہیں:

وما كان في كتابي من حديث فيه وهن شديد فقد بينته ومنه ما لا يصح سنده، ومالم اذكر فيه شيئاً فهو صالح وبعضها اصح من بعض النخ“ (۱)

میری اس کتاب کی کسی حدیث میں اگر ضعف شدید اور زیادہ کمزوری ہے تو میں نے اسے بیان کر دیا ہے اور اس میں بعض وہ روایتیں ہیں جن کی سند صحیح نہیں ہے (بلکہ درجہ حسن کی ہے یا اس میں لائق برداشت ضعف ہے) اور وہ احادیث جن پر میں نے کوئی کلام نہیں کیا ہے صالح ہیں اور ان میں بعض احادیث بعض کے مقابلے میں راجح ہیں۔

کتاب السنن کی احادیث کا یہ انتخاب و انتقاء، ان کے مراتب کی تحدید و تعیین، منکر، معلول اور ضعیف ترین روایتوں کی نشاندہی وغیرہ ایسے امور ہیں جو بتا رہے ہیں کہ امام ابو داؤد صرف حافظ حدیث اور اس کے راوی ہی نہیں بلکہ بلند پایہ ناقد حدیث بھی تھے اور راویان حدیث کے حسب حال ان کے درجات مقرر کرنے پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ سب تاریخ رجال اور فن جرح و تعدیل پر مکمل عبور کے بغیر ممکن نہیں۔

علاوہ ازیں ”سوالات ابو عبیدہ الآجری“ (جو علم جرح و تعدیل کا ضخیم و معتمد مجموعہ ہے) جس کے جمع و ترتیب کی سعادت اگرچہ حافظ ابو عبیدہ محمد بن علی بن عثمان الآجری کے حصہ میں آئی مگر اصالتاً یہ امام ابو داؤد ہی کی کتاب مانی جاتی ہے کیونکہ اس میں مندرج تمام معلومات انھیں کے خزانہ علمی سے ماخوذ و مستفاد ہیں۔

امام ابو داؤد کے افادات و معلومات کے اس مجموعہ کی اہمیت اور فن جرح و تعدیل میں ان کے مقبول و معتمد ہونے کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ہر دور کے علمائے

(۱) رسالۃ الامام ابی داؤد، ص: ۳۷۔

رجال و اکابر محدثین، مثلاً حافظ عسکری متوفی ۳۸۲ھ، امام خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ، حافظ ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ، حافظ جمال الدین المزنی متوفی ۴۲۷ھ، حافظ شمس الدین الذہبی متوفی ۴۸۸ھ، حافظ ابن حجر ۸۵۲ھ، حافظ محمد بن عبدالرحمن السخاوی متوفی ۹۰۲ھ وغیرہ اپنی تصانیف میں اس کے اقتباسات کثرت سے نقل کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ فن اسماء الرجال میں امام ابوداؤد کی عبقریت و امامت ہر دور کے محدثین بالخصوص علمائے جرح و تعدیل کے نزدیک مسلم رہی ہے۔ اور اس فن میں ان کا شمار کبار ائمہ حدیث کے طبقہ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ امام ابن حبان البستی ائمہ جرح و تعدیل کے طبقات کا تذکرہ کرتے ہوئے امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی ابن المدینی وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ثم اخذ عن هؤلاء مسلك الانتقاد في الاخبار وانتقاد الرجال في الآثار جماعة منهم محمد بن يحيى الذهلي النيسابوري، وعبدالله بن عبدالرحمن الدارمي، وابوزرعة عبيد الله بن عبدالكريم بن يزيد الرازي، ومحمد بن اسماعيل الجعفي البخاري، ومسلم بن الحجاج النيسابوري، وابوداؤد بن الاشعث السجستاني في جماعة من اقرانهم الخ (۱)

پھر ان ائمہ سے حدیث اور رجال حدیث پر نقد کا طریقہ ایک جماعت نے سیکھا ان میں امام ذہلی، امام دارمی، امام ابوزرعہ رازی، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد سجستانی اور ان کے ہم طبقہ محدثین عظام ہیں۔

اسی طرح امام ذہبی نے بھی اپنے رسالہ ”ذکر من يعتمد قوله في الجرح والتعديل“ میں انھیں امام بخاری، امام ذہلی، امام ابوزرعہ رازی، امام ابو حاتم رازی، ابن واریہ، الجوزجانی، امام مسلم، امام الحارثی، ابن ابی خثیمہ وغیرہ اساطین فن رجال کے ساتھ پانچویں طبقہ میں شمار کیا ہے۔ (۲)

(۱) الجرح و التعديل، ج: ۱، ص: ۵۷-۵۸۔

(۲) اربع رسائل في علوم الحديث تحقيق شيخ عبدالفتاح ابو عده، ص: ۱۹۲-۱۹۳۔

فقہ میں تبحر

گزشتہ سطور میں یہ بات گزر چکی ہے کہ امام ابوداؤد کا شمار علماء حدیث کے اس طبقہ میں ہے جنہیں فقہائے محدثین سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس طبقہ کے محدثین عظام علم حدیث میں کامل مہارت اور رسوخ تامہ کے ساتھ فقہ حدیث میں بھی تبحر کے درجہ پر فائز تھے۔ چنانچہ محقق جلیل علامہ محمد زاہد الکوثری متوفی ۱۳۷۱ھ حافظ ابوبکر الحازمی متوفی ۵۸۴ھ کے انتہائی وقیع اور کثیر الفوائد رسالہ ”شروط الائمہ“ کی تعلق میں لکھتے ہیں:

وأبوداؤد تفقه على فقهاء العراق وعظم مقداره في الفقه وهما (اعنى البخارى وأباداؤد) أفقه الجماعة“ (۱)

امام ابوداؤد نے فقہاء عراق سے فقہ حاصل کی تھی اور اس فن میں بڑی قدر و منزلت کے حامل تھے، اور یہ دونوں بزرگوار یعنی امام بخاری اور امام ابوداؤد تفقہ میں اصحاب ستہ (یعنی امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ) میں سب پر فائق تھے۔

امام ذہبی نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

قلت : كان أبوداؤد مع إمامته في الحديث وفنونه من كبار الفقهاء فكتابه يدل على ذلك وهو من نجباء اصحاب الإمام احمد لازم مجلسه مدةً وسأله عن دقائق المسائل في الفروع والاصول“ (۲)

میں کہتا ہوں (یعنی حافظ ذہبی) کہ امام ابوداؤد حدیث اور فنون حدیث میں امامت کے ساتھ اکابر فقہاء میں تھے جس پر ان کی کتاب السنن شاہد عدل ہے وہ امام احمد ابن حنبل کے برگزیدہ اور منتخب شاگردوں میں تھے ایک

(۱) ثلاث رسائل في علم مصطلح الحديث، ص: ۱۷۱، مطبوعہ دار البیت الاسلامیہ، بیروت ۱۴۱۷ھ

(۲) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۵۔

زمانہ تک ان کی مجلس درس میں بیٹھے اور ان سے اصول و فروع سے متعلق دقیق مسائل دریافت کیے۔ (ان مسائل کا مجموعہ مسائل امام احمد بروایت امام ابو داؤد کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔)

امام ذہبی کی یہ تصریح کہ امام ابو داؤد فقہائے کبار میں تھے بتا رہی ہے کہ وہ فقہ کا اعلیٰ ترین ذوق رکھتے تھے کیونکہ اس ذوق فراواں کے بغیر فقہاء کبار کے درجہ تک نہیں پہنچا جاسکتا ہے۔ امام ابو داؤد کے اسی فقہی ذوق کی کار فرمائی ہے کہ انھوں نے اپنے پیش رو محدثین (امام بخاری و مسلم وغیرہ) کے طریق عمل کی بجائے اپنی کتاب میں صرف احادیث احکام کی تخریج کی اور اس میں فقہی احادیث کا ایسا عظیم القدر ذخیرہ جمع کر دیا کہ کتب سنن میں اسے ”ام الاحکام“ کی نہایت وقیع و بالآخر حیثیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ شیخ الاسلام، حافظ العصر ابن حجر العسقلانی ”تلخیص الخیر“ میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ”کیف یقال ذلك فی حدیث فی سنن ابی داؤد التی ہی ام الاحکام“ (۱)

امام ابی داؤد کے فقہ میں اسی غیر معمولی تبحر اور مرتبہ بلند کی بنا پر شیخ ابواسحاق شیرازی نے انھیں طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے جب کہ اصحاب ستہ میں سے کسی اور بزرگ کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکا۔

مسلك و مذہب

ائمہ حدیث بالخصوص اصحاب ستہ یعنی امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے خود اپنے فقہی مسلک و مذہب کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی ہے۔ بعد کے علماء نے اپنے تتبع اور بحث و نظر کے تحت انھیں مجتہد یا ائمہ اربعہ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ میں سے کسی کا تتبع اور مقلد کہا ہے۔ پھر بحث و تحقیق اور فکر و نظر میں اختلاف کا ہونا بالکل ظاہر ہے اس لیے اس سے ماخوذ نتائج کا باہم مختلف ہونا ناگزیر ہے چنانچہ یہی اختلاف امام ابو داؤد کے مسلک کی تعیین میں

(۱) ج: ۲، ص: ۵۰۶، رقم الحدیث ۵۳۳ ناشر مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز ۱۴۱۷ھ۔

بھی نمایاں طور پر نظر آ رہا ہے۔

عصر حاضر کے بلند پایہ ناقد و محقق مولانا عبدالرشید نعمانی نے ”سنن ابن ماجہ“ کے اپنے مقدمہ میں اصول ستہ کے مصنفین کے مسلک پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے، اس مفصل و مبسوط بحث میں امام ابو داؤد کے مسلک سے متعلق جو اقوال ہیں وہ محقق نعمانی ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہیں:

(۱) فقال الإمام العلامة، الحافظ محمد أنور الكشميري في فيض الباري (ج ۱ ص ۵۸ طبع مصر): ”والنسائي و أبو داؤد حنبلان صرح به الحافظ ابن تيمية“ وقال رحمه الله في ”عرف الشذى“: ”وأما أبو داؤد والنسائي فالمشهور أنهما شافعيان ولكن الحق أنهما حنبلان. وقد شحنت كتب الحنابلة بروايات ابى داؤد عن احمد والله اعلم“ ۱ھ۔

(۲) واما السيد صديق حسن خان ذكر في كتابه ”أبجد العلوم“ (ص ۸۱۰ طبع الهند) البخارى، و أباداؤد، والنسائي في الشوافع اهـ
(۳) وقال الشاه ولي الله المحدث دهلوى في ”الانصاف في بيان سبب الاختلاف“ (ص ۷۹-۸۰ طبع دہلی بالہند): ”وإمام أبو داؤد والترمذی فہما مجتہدان منتسبان الی احمد واسحق“ اهـ

(۴) وقال العلامة ابن القيم في ”إعلام الموقعين“ في الوجه الرابع والاربعين من وجوه رد التقليد (ج ۱ ص ۲۳۶ طبع الهند): ”البخارى، ومسلم، وأبو داؤد والأثرم وهذه الطبقة من اصحاب احمد أتبع له من المقلدين المحض المنتسبين اليه“ اهـ

(۵) وكذلك ذكر هؤلاء الثلاثة ابن ابى يعلى في طبقات الحنابلة، واما تاج الدين السبكي فلم يذكر في طبقات الشافعية الا البخارى وأبا داؤد والنسائي، وأما الحنفية والمالكية فلم يذكرهما أحدًا منهم في طبقاتهم. (۱)

(۱) مائس الیہ الحاج لسنن ابی داؤد ص: ۲۵-۲۶ طبع دیوبند مع سنن ابن ماجہ۔

”امام، علامہ، حافظ محمد انور شاہ کشمیری نے اپنی املائی کتاب فیض الباری میں کہا کہ امام نسائی اور امام ابوداؤد حنبلی المسکک ہیں، حافظ ابن تیمیہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

محدث کشمیری اپنی دوسری املائی تصنیف العرف الشذی میں کہتے ہیں: امام ابوداؤد اور امام نسائی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ دونوں بزرگوار شافعی المذہب ہیں لیکن سچی و صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں حنبلی ہیں۔ حنبلیوں کی کتابیں، امام احمد بن حنبل کے اقوال سے جو امام ابوداؤد کی روایت سے ہیں بھری ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم

اور مولانا سید صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی نے ”ابجد العلوم“ میں امام بخاری، امام ابوداؤد اور امام نسائی کو شوافع میں ذکر کیا ہے۔

مسند ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ”الانصاف فی بیان سبب الاختلاف“ میں لکھا ہے کہ امام ابوداؤد اور امام ترمذی دونوں مجتہد ہیں اور علی الترتیب امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ سے منتسب ہیں۔

علامہ ابن القیم الموقعین میں لکھتے ہیں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام الاثرم اور امام احمد بن حنبل کے تلامذہ کا یہ طبقہ ان کی اتباع زیادہ کرتا ہے بہ نسبت ان خالص مقلدین کے جو ان کی جانب منسوب ہیں۔

اسی طرح ان تینوں ائمہ یعنی امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد کو ابن ابی یعلیٰ نے حنابلہ کے طبقات میں ذکر کیا، جبکہ علامہ تاج الدین سبکی نے امام بخاری، امام ابوداؤد اور امام نسائی کو طبقات شافعیہ میں شمار کیا ہے البتہ احناف اور مالکیہ ان میں سے کسی کو اپنے طبقات میں ذکر نہیں کرتے۔

ان اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ محدث کشمیری، حافظ ابن القیم اور ابن ابی یعلیٰ یہ تینوں حضرات امام ابوداؤد کو حنبلی المسکک کہتے ہیں، جب کہ مولانا نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی اور علامہ تاج الدین سبکی نے انہیں شوافع میں شمار کیا ہے، یہی رائے برکت العصر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ کی بھی ہے۔ چنانچہ لامع الدراری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ”فإن أبا داؤد عندی حنبلی قطعاً، متشدد فی مسلك الحنابلة

كالطحاوی فی الحنفیة“ (۱)

”امام ابوداؤد میرے نزدیک قطعی طور پر حنبلی ہیں حنابلہ کے مسلک میں متشدد ہیں جیسے امام طحاوی مسلک حنفیہ میں متشدد ہیں“ جب کہ علامہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی اور امام تاج الدین سبکی امام ابوداؤد کو شوافع میں شمار کرتے ہیں اور مسند ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی نظر میں امام ابوداؤد مجتہد منتسب ہیں۔

ان مختلف اقوال کو نقل کرنے کے بعد محقق نعمانی نے ان پر درج ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

”فانظر الی هذا التجاذب الذی وقع بین هؤلاء الأعلام فتارة يعدون أحدهم شافعیاً وتارة حنبلیاً وأخرى مجتهداً وهذا كله عندی تخرص وتكلم من غیر برهان، فلو كان أحد من هؤلاء شافعیاً او حنبلیاً لأطبق العلماء علی نقله ولما اختلفوا هذا الاختلاف، كما أطبقوا علی كون الطحاوی حنفیاً والبيهقی شافعیاً وعیاض مالکیاً وابن الجوزی حنبلیاً، سوی الإمام أبی داؤد فإنه تفقه علی الإمام أحمد ومسائله عن احمد بن حنبل معروف مطبوع و ذکره الشیرازی فی طبقات الفقهاء من اصحابه“

ان علماء کبار کے مابین پیش آمدہ کشمکش کو دیکھو، کبھی تو ان مذکورہ ائمہ حدیث میں سے کسی کو شافعی بتاتے ہیں اور کبھی حنبلی اور کبھی مجتہد کہتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب اٹکل اور بے دلیل باتیں ہیں۔ اصول ستہ (یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ) کے مصنفین میں اگر کوئی شافعی یا حنبلی ہوتا تو اس اختلاف شدید کی بجائے سارے لوگ اس کے نقل پر متفق ہوتے جس طرح امام طحاوی کے حنفی، امام بیہقی کے شافعی، قاضی عیاض کے مالکی اور امام ابن الجوزی کے حنبلی ہونے کے قول پر سب کا اتفاق و اجماع ہے۔ ہاں امام ابوداؤد کے حنبلی ہونے کی

بات اس سے الگ ہے کیونکہ انھوں نے امام احمد سے فقہ کی تحصیل کی ہے اور اس باب میں امام احمد سے ان کے سوالات معروف ہیں اور کتابی شکل میں طبع ہو چکے ہیں، نیز ابواسحاق شیرازی نے انھیں طبقات الفقہاء میں امام احمد بن حنبل کے اصحاب و تلامذہ میں ذکر کیا ہے۔
اس تبصرہ کے بعد لکھتے ہیں:

ولعل الصواب في هذا الباب ما نقله الشيخ طاهر الجزائري في "توجيه النظر إلى أصول الاثر" عن بعض الفضلاء ونصه:
وقد سئل بعض البارعين في علم الأثر عن مذاهب المحدثين مراداً بذلك المعنى المشهور عند الجمهور، فاجاب عما سئل عنه بجواب يوضح الحال وإن كان فيه نوع إجمال، وقد أحببنا إيراد مع اختصار.
قال: "أما البخاري و أبو داؤد فإمامان في الفقه و كانا من أهل الاجتهاد"^(۱)

@ جواب کا بقیہ حصہ یہ ہے۔ واما مسلم، والترمذی، والنسائی وابن ماجہ و ابن خزيمة، وابو یعلیٰ، والبخاری و ابو داؤد و ابن ماجہ و ابن خزيمة، و ابو یعلیٰ، و البزار و نحوهم فهم على مذهب أهل الحديث ليسوا مقلدين لواحد بعينه من العلماء ولا هم من الأئمة المجتهدين على الإطلاق بل يميلون الى قول أئمة الحديث كالشافعي واحمد، واسحاق وابي عبيد وأمثالهم وهم إلى مذاهب أهل الحجاز اميل منهم الى مذاهب اهل العراق، واما أبو داؤد الطيالسي فأقدم من هؤلاء كلهم من طبقة يحيى بن سعيد القطان، ويزيد بن هارون الواسطي، و عبدالرحمن بن مهدي، وأمثال هؤلاء من طبقة شيوخ الإمام أحمد، و هؤلاء كلهم لا يألون جهداً في اتباع السنة، غير أن منهم من يميل إلى مذهب العراقيين كوكيع و يحيى بن سعيد، و منهم من يميل إلى مذهب المدنيين كعبد الرحمن بن مهدي.

و أما الدار قطنی فإنه كان يميل إلى مذهب الشافعي إلا أنه له اجتهاد و كان من أئمة السنة و الحديث ولم يكن حاله كحال احد من كبار المحدثين ممن جاء على اثره فالتزم التقليد في عامة الاقوال إلا في قليل منها مما يُعدُّ و يُحصر، فإن الدارقطني اقوى في الاجتهاد منه و كان افقه و اعلم منه (ج ۱ ص ۲۳۸ طبع بيروت ۱۴۱۶ھ بہ تحقیق شیخ عبدالفتاح ابو غده)

(۱) مائس الیہ الحاجیہ ص: ۲۶-۲۷ طبع دیوبند۔

شاید کہ اس باب میں وہ بات درست ہو جسے شیخ طاہر الجزائری نے "توجیہ النظر الی اصول الاثر" میں بعض فضلاء سے نقل کی ہے شیخ جزائری کے الفاظ یہ ہیں:
اصول حدیث میں بعض ماہرین سے محدثین کے مذاہب فقہیہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے اس سوال کا جو جواب دیا وہ صورت حال کو خوب واضح کرتا ہے، اگرچہ اس میں قدرے اجمال ہے۔ مجھے یہ بات پسند آئی کہ اس جواب کو کچھ اختصار کے ساتھ پیش کر دوں۔ انھوں نے کہا کہ "امام بخاری اور امام ابو داؤد فقہ میں امام ہیں اور دونوں بزرگوار اہل اجتہاد میں سے ہیں"

علامہ طاہر الجزائری کا اس جواب کے متعلق "یوضح الحال" (جس نے واقعی صورت حال سے پردہ اٹھا دیا) کا توصیفی جملہ نیز مسئلہ زیر بحث میں بطور خاص اسے نقل کرنا بتا رہا ہے کہ امام ابن تیمیہ کی یہ تحقیق ان کے نزدیک اہمیت رکھتی ہے، واللہ اعلم۔
لیکن محقق نعمانی اس تحقیق کے اُس جزء سے جو امام بخاری اور امام ابو داؤد کے بارے میں ہے متفق نہیں ہیں چنانچہ توجیہ النظر سے مکمل جواب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"وعندی أن البخاری و أبا داؤد ایضاً کبقیة المذکورین لیسوا مقلدین لواحد بعینه ولا من أئمة المجتهدين على الإطلاق بل يميلان إلى أقوال أئمتهم، ولو كانا مجتهدين لنقل أقوالهما مع سائر الأئمة من أهل الاجتهاد والفقه، ولكن نرى أن سائر الكتب التي دُون فيها أقوال المجتهدين خالية عن ذكر مذاهبهما... وإن كان لا ينكر أن أبا داؤد أفقه الستة ولذا ذكره الشيرازي في طبقات الفقهاء دون غيره" (۱)

میرے نزدیک امام بخاری اور امام ابو داؤد بھی بقیہ مذکورین یعنی امام مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابو یعلیٰ، بزار وغیرہ کی طرح کسی متعین

محقق عبدالفتاح ابو غده نے بعض البارعین کی تعین امام ابن تیمیہ سے کی ہے۔ چنانچہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں: هو الشيخ الامام ابن تیمیہ کما فی مجموع الفتاوى ج: ۲۰، ص: ۳۹-۴۰

(۱) مائس الیہ الحاجیہ ص: ۲۶-۲۷ طبع دیوبند۔

امام کے مقلد نہیں ہیں اور نہ ہی مجتہد مطلق ہیں بلکہ اپنے اپنے ائمہ کے اقوال کی جانب میلان رکھتے ہیں، اگر یہ دونوں حضرات مجتہد ہوتے تو دیگر فقہائے مجتہدین کے ساتھ ان کے اقوال بھی نقل کیے جاتے؛ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ساری کتابیں جن میں ائمہ مجتہدین کے اقوال جمع کیے گئے ہیں ان دونوں بزرگوں کے اقوال سے خالی ہیں۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ائمہ ستہ میں فقہت میں بڑھے ہوئے ہیں اسی بناء پر شیرازی نے ان کے علاوہ کسی کا ذکر ”طبقات الفقہاء“ میں نہیں کیا ہے۔

امام ابوداؤد کے مسلک کے سلسلے میں بظاہر اقرب الی الصواب یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بھی دیگر فقہائے محدثین کی طرح عام مسائل و احکام میں حدیث ہی پر عمل کرتے ہیں اور اس عمل بالحدیث میں وہ بسا اوقات اپنے اہم ترین و عزیز ترین استاذ احمد بن حنبل کی (جن سے وہ سجد متاثر ہیں اور جن کی سیرت و عادت اور وضع زندگی کو اپنے لیے نمونہ سمجھتے تھے) مخالفت کی بھی چنداں پرواہ نہیں کرتے البتہ جن احکام میں ان کے سامنے حدیث نہیں ہوتی ان میں وہ امام احمد کے اقوال کو اختیار کرتے ہیں، اس اعتبار سے انھیں حنبلی المسلک بجا طور پر کہا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

زہد و تقویٰ

امام ابوداؤد کے تذکرہ نویس ان کے علمی فضل و کمال کے ساتھ ان کی دنیا سے بے نیازی، ورع و پرہیزگاری اور خشیت الہی کا ذکر بھی خصوصیت سے کرتے ہیں اور یہ بات گزر چکی ہے کہ امام جہتانی اپنے شیخ اجل امام احمد بن حنبل سے غایت درجہ متاثر تھے حتیٰ کہ عادت و سیرت، اطوار و کردار اور طرز حیات میں انہی کی موافقت و مماثلت اختیار کرتے تھے۔ امام احمد کی حیات طیبہ کے ساتھ اس موافقت سے ان کی طہارت نفس اور پاکیزگی باطن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہ سب حدیث پاک کے ساتھ مخلصانہ اشتغال کی اولین برکت ہے جس سے عام طور پر ائمہ حدیث و فقہ ہم کنار ہوتے ہیں، چنانچہ امام جہتانی

کی بے نفسی اور غیر ضروری چیزوں سے احتراز کا عالم یہ تھا کہ ایک آستین وسیع اور دوسری تنگ بنواتے تھے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا: وسیع آستین تو کتاب رکھنے کے لیے ہے اور دوسری کو وسیع بنانے کی کوئی حاجت نہیں۔ (۱)

حکمت و معرفت

بندۂ مؤمن جب سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق زہد و ورع اور صلاح و تقویٰ کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیتا ہے تو بارگاہ رب العزت سے بطور انعام و اکرام اس کے دل پر علم و حکمت کا فیضان ہوتا ہے۔ امام ابوداؤد بھی انہیں خوش بخت بندگان خدا میں شامل ہیں جو حکمت و معرفت کی دولت لازوال سے بہرہ ور تھے، حدیث پاک اور اس سے متعلق علوم و فنون کی تعلیم و تحصیل اور پھر ان کی تبلیغ و اشاعت میں غیر معمولی انہماک کی بناء پر اگرچہ انہیں اس علم و وہی کے اظہار و بیان کا موقع نہیں مل سکا پھر بھی خزانہ دل میں محفوظ علم و حکمت کے کچھ جواہر پارے ان کی زبان پر آ کر عالم آشکارا ہو ہی گئے جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱- کان یقول: ”الشہوۃ الخفیۃ حب الریاسۃ“ (۲) چھپی شہوت ریاست اور بڑائی کی خواہش ہے۔

۲- قال: ”من اقتصر علی لباس دون و مطعم دون فقد اراح جسدہ“ (۳) فرمایا جس نے معمولی اور کم تر لباس اور طعام پر اکتفاء کیا اس نے اپنے بدن کو راحت و آرام پہنچایا۔

۳- ان کے بیٹے ابوبکر عبداللہ الجہتانی ناقل ہیں کہ میں نے والد ماجد سے فرماتے ہوئے سنا کہ ”خیر الکلام ما دخل الأذن بغیر إذن“ (۴) بہترین بات وہ

(۱) تہذیب تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۲۳۸۔

(۲) تہذیب تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۲۳۸۔

(۳) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۷۔

ہے جو بغیر اجازت کے کان میں داخل ہو جائے۔ (یعنی اسکے سننے کے لیے متکلم کی یا شریعت کی اجازت درکار نہ ہو)

۴- ایک مرتبہ کسی شیخ کی مجلس میں بیٹھے لکھ رہے تھے کہ ایک شخص ان کی دوات کے قریب آ کر کہنے لگا کہ میں اس دوات سے روشنائی لینا چاہتا ہوں تو اس کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا: ”أما علمت أن من شرع في مال أخيه بالاستئذان فقد أوجب بالحشمة الحرمان“ (۱) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو شخص اپنے بھائی کے مال کو استعمال کرنے کی اجازت لینا شروع کر دیتا ہے وہ وقار اور پسندیدہ سیرت و خصلت سے محرومی کو لازم کر لیتا ہے۔

۵- آپ کے مشہور تلمیذ اور طویل مجلس نشین حافظ ابو عبیدہ آل اجری کا بیان ہے کہ میں نے امام ابو داؤد سے دریافت کیا: ”سمعت من يوسف الصفا؟ قال: لا، قلت سمعت من ابن الاصفهاني؟ قال: لا، قلت سمعت من عمرو بن حماد بن طلحة؟ قال: لا، ولا سمعت من مَحْوَل بن ابراهيم، ثم قال هؤلاء كانوا بعد العشرين والحديث رزق ولم اسمع منهم“ (۲) کیا آپ نے یوسف الصفا سے حدیث کی سماعت کی ہے؟ فرمایا نہیں، میں نے مزید دریافت کیا کہ کیا جناب نے ابن الاصفہانی سے حدیث سنی ہے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ نے عمرو بن حماد بن طلحہ سے سنا ہے؟ فرمایا نہیں، اور میں نے محوّل بن ابراہیم سے بھی نہیں سنا ہے پھر ارشاد فرمایا: یہ سب شیوخ حدیث ۲۲۰ھ کے بعد کے ہیں (جو میرا عہد طالب علمی ہے) حدیث پاک اللہ کا رزق ہے (ان بزرگوں کا زمانہ پانے کے باوجود) میں ان سے حدیث نہ سن سکا، مطلب یہ ہے کہ جس طرح روزی اسی کو ملتی ہے جسے مالک کائنات عطا فرمائے انسان کے علم و ہنر کا اس میں کوئی دخل نہیں، اسی طرح سماعت حدیث بھی اسی سے سننا نصیب ہوگی جس سے سننے کی توفیق الہی میسر آجائے۔

(۱) وفيات الاعيان، ج: ۱، ص: ۳۸۳۔

(۲) سوالات الآجری، ج: ۲، ص: ۲۹۵۔

علمی نوادرات

(۱) آپ کے نامور شاگرد اور کتاب السنن کے راوی ابو بکر ابن داسہ کا بیان ہے کہ میں نے امام ابو داؤد کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ..... کی پانچ لاکھ حدیثوں کو تحریراً ضبط کیا ہے کتاب السنن کی چار ہزار آٹھ سو احادیث انھیں کا انتخاب ہیں جس میں صحیح، مشابہ صحیح اور مقارب صحیح روایتیں ہیں اور ایک انسان کے دین کی استواری کے واسطے ان میں سے چار حدیثیں کافی ہیں: (۱) إنما الأعمال بالنیات۔ اعمال کا اعتبار نیّتوں کے مطابق ہوتا ہے۔ (۲) من حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه۔ مرد مسلم کے اسلام کی خوبی سے ہے اس کا بیکار چیزوں کا ترک کر دینا۔ (۳) لا يكون المؤمن مؤمناً حتى يرضى لأخيه ما يرضاه لنفسه۔ ایک مؤمن اس وقت تک کامل مؤمن نہیں جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (۴) الحلال بين، والحرام بين، وبين ذلك أمور مشتبهاة، الحديث۔ (۱) حلال ظاہر ہے، حرام ظاہر ہے اور حلال و حرام کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں۔

امام ابو داؤد کے اس وقیح علمی قول کی توجیہ کرتے ہوئے زبدۃ المحدثین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رقمطراز ہیں:

”راقم الحروف می گوید معنی کفایت آنست کہ بعد از معرفت قواعد کلیہ شریعت و مشہورات آل، در جزیات و وقائع حاجت بہ مجتہدے و مرشدے باقی نمی ماند زیرا کہ در صحیح عبادات حدیث اول کفایت می کند، و در محافظات اوقات

حدیث پاک کے باقی الفاظ یہ ہیں لا یعلمہن کثیر من الناس فمن اتقى الشبهات فقد استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام كالراعى يرعى حول الحمى يوشك ان يرتع فيه ان شبهات کو اکثر لوگ نہیں جانتے تو جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور آبرو کو نقص و عیب سے محفوظ و بری کر لیا اور جو شبہات میں پڑے گا وہ (بالآخر) حرام میں پڑے گا اس چرواہے کی طرح جو ممنوع چراگاہ کے اردگرد مویشیوں کو چراتا ہے تو عنقریب وہ اس ممنوعہ چراگاہ میں چرالے گا۔

(۱) تاریخ بغداد، ج: ۹، ص: ۵۷، تہذیب تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۲۳۷، البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۶۴۔

عمر عزیز حدیث دوم، و درمرامات حقوق ہمسایہ واقارب و دیگر اہل تعارف و معاملہ حدیث سوم، و در دفع شک و تردد کہ بسبب اختلاف علماء یا اختلاف اولدہ رومی دہ حدیث چہارم، پس ایں ہر چہار حدیث نزد مرد عاقل حکم پیرو استاد ہر دو دارند واللہ اعلم۔^(۱)

راقم حروف کہتا ہے کہ ان کے کافی ہونے کے معنی یہ ہے کہ شریعت کے قواعد کلیہ اور مشہور امور کو معلوم کر لینے کے بعد پیش آمدہ جزئی مسائل میں مجتہد و مرشد کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ عبادات کی درستگی کے لیے پہلی حدیث اور عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت کے لیے دوسری حدیث اور ہمسایہ واقارب اور دیگر اہل تعارف و معاملہ کے حقوق کی رعایت کے لیے تیسری حدیث اور اس شک و تردد کے ازالہ کے لیے جو علماء کے اختلاف یا دلائل کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں چوتھی حدیث کافی ہے۔ لہذا یہ چاروں حدیثیں مرد عاقل کے لیے مرشد اور استاذ دونوں کے حکم میں ہیں۔ واللہ اعلم

(۲) حافظ الآجری کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوداؤد کو کہتے ہوئے سنا کہ ”اللیث بن سعد روى عن الزهري، وروى عن خمسة عن الزهري، حدث عن خالد بن يزيد، عن سعيد بن ابى هلال، عن يزيد بن الهاد، عن ابراهيم بن سعد، عن صالح بن كيسان، عن الزهري“ (۲)

لیث بن سعد مصری الامام ابن شہاب زہری سے بلا واسطہ روایت کرتے ہیں اور درج بالا پانچ واسطوں سے بھی روایت کرتے ہیں۔

(۳) امام ابوداؤد کا بیان ہے ”شَبَّرْتُ قَتَاءَ بِمِصْرَ ثَلَاثَةَ عَشْرَ شَبْرًا، وَرَأَيْتُ اثْرَجَةَ عَلِيَّ بَعِيرٍ قَطَعَتْ قَطْعَتَيْنِ وَعَمِلَتْ مِثْلَ عَدْلَيْنِ“ (۳) میں نے مصر میں ایک

(۱) بستان الحدیث مترجم، ص: ۲۸۶ طبع سعید کینی کراچی، پاکستان۔

(۲) سوالات الآجری، ج: ۲، ص: ۱۶۷-۱۶۸ و تہذیب التہذیب، ج: ۸، ص: ۴۰۴-۴۰۵، رقم الترجمة ۵۹۱۰، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۷، چار واسطوں کا ذکر ہے سعید بن ابی ہلال کے بعد یزید بن الہاد کا نام نہیں ہے۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ، ج: ۲، ص: ۵۹۲۔

ککڑی کی پیمائش کی تو وہ تیرہ بالشت کی تھی اور اونٹ پر لدا ایک لیمو دیکھا جس کے دو ٹکڑے کر کے گون کی طرح دونوں جانب لٹکا دیئے گئے تھے۔

(۴) امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ ”حارثة بن النعمان، و عبد الله بن عباس، و ابو سفیان بن حرب، و جابر بن عبد الله و حسان بن ثابت، و کعب بن مالک، و ابن ام مکتوم، و عتبان بن مالک، و ابو قحافة، و العباس بن عبد المطلب هؤلاء ذهب ابصارهم“ (۱) یعنی مذکورہ بالا حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نابینا ہو گئے تھے۔

امام ابوداؤد دائمہ حدیث اور اکابر علماء کی نظر میں

ارباب علم و فضل کی نظر میں امام ابوداؤد کا مقام و مرتبہ کیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ العارفین سہل بن عبد اللہ التستری المتوفی ۲۸۳ھ (معروف بہ الزاہد الحدیث) ایک دن امام ابوداؤد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری ایک حاجت آپ سے وابستہ ہے، امام جتانی نے کہا ارشاد فرمائیں وہ کیا حاجت ہے؟ شیخ تستری بولے اس شرط پر بیان کروں گا کہ آپ وعدہ فرمائیں کہ اگر اسے پورا کرنے کی قدرت ہوگی تو آپ اس سے دریغ نہیں فرمائیں گے، امام ابوداؤد نے وعدہ کر لیا کہ حتی الامکان اسے پورا کروں گا، تو شیخ تستری نے عرض کیا ”اخرج الیّ لسانک الذی حدثت به احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی اقبلہ“ اپنی پاکیزہ زبان جس سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کرتے ہیں میری جانب نکال لے تاکہ اس کا بوسہ لوں۔ ”فاخرج الیہ لسانہ فقبلہ“ حسب وعدہ امام ابوداؤد نے زبان باہر نکال دی اور شیخ تستری نے اسے چوم لیا۔ (۲)

(۱) سوالات الآجری، ج: ۱، ص: ۱۹۸

(۲) وفیات الاعیان، ج: ۱، ص: ۳۸۳ رقم الترجمة ۲۷۲ و تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۵ رقم الترجمة ۲۷۶

و سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۳ و ص: ۳۳۱ مختصراً۔

شیخ تستری جیسے زاہد و عابد (جو دنیا اور اہل دنیا کی سرگرمیوں سے الگ تھلگ زاویہٴ شمول میں بیٹھے یادِ الہی میں مستغرق رہا کرتے تھے) کا امام ابو داؤد کے ساتھ حسن عقیدت اور والہانہ محبت کا یہ معاملہ ارباب فضل و کمال کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت کا پتہ دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابو داؤد کے کمالات و فضائل کے اعتراف و اظہار میں ہر دور کے صاحب نظر علماء ربط اللسان رہے ہیں اس موقع پر بنظر اختصار اکابر علماء کے دس فرمودات و اقوال نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) امام ابراہیم بن اسحاق الحر بن المتوفی ۲۸۵ھ فرماتے ہیں:

”ألین لأبی داؤد الحدیث كما ألین لداؤد علیه السلام الحدید“ (۱)
ابو داؤد سجستانی کے لیے حدیث نرم کر دی گئی جس طرح داؤد نبی علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا گیا تھا، یعنی یہی بات محمد بن اسحاق الصاعانی المتوفی ۲۷۰ھ نے بھی فرمائی ہے۔

(۲) حافظ موسیٰ بن ہارون المتوفی ۲۹۴ھ کا قول ہے:

”خلق أبو داؤد فی الدنیا للحدیث وفی الآخرة للجنة ما رأیت افضل منه“ (۲)
امام ابو داؤد دنیا میں خدمت حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے واسطے پیدا کیے گئے ہیں میں نے ان سے افضل و برتر کسی کو نہیں دیکھا۔

(۳) ابو بکر الخلال المتوفی ۳۱۱ھ نے ان الفاظ میں مدح سرائی کی ہے:

”أبو داؤد الإمام المقدم فی زمانه رجل لم یسبق الی معرفته بتخریج العلوم وبصره بمواضعه احد فی زمانه رجل ورع مقدم“ (۳)

امام ابو داؤد سجستانی اپنے عہد میں پیشوا اور ایک ایسے مرد کمال تھے کہ احادیث احکام کی تخریج کی معرفت اور مواقع احکام کی بصیرت میں ان کے

(۱) تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۴، رقم الترمذی ۲۷۶۶، ج: ۶، ص: ۲۷۷

(۲) تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۴، رقم الترمذی ۲۷۶۶، ج: ۶، ص: ۲۷۷

(۳) ایضاً

زمانہ میں کوئی عالم ان پر سبقت نہ لے جاسکا نیز وہ ایک مرد پارسا اور برتر شخصیت کے مالک تھے۔

(۴) مسند بغداد امام محمد بن مخلد المتوفی ۳۳۱ھ ان الفاظ میں امام ابو داؤد کی جلالت شان کا اعتراف کرتے ہیں:

”کان ابو داؤد یفی بمذاکرۃ مائة الف حدیث ... اقرّ له اهل زمانه بالحفظ“ (۱)

وہ دورانِ مذاکرہ ایک لاکھ حدیثیں پیش کر دیتے تھے ان کے معاصرین نے ان کے حفظ و اتقان کی شہادت دی ہے۔

(۵) محدث احمد بن محمد بن یاسین الہروی المتوفی ۳۳۲ھ امام سجستانی کے مناقب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”کان أبو داؤد أحد حفاظ الإسلام لحدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم وعلمه وعلله فی اعلا درجة النسك والعفاف والصلاح والورع من فرسان الحدیث“ (۲)

امام ابو داؤد رسول خدا..... کی احادیث، نیز علم حدیث، علل حدیث کے حفاظ میں سے ایک تھے، عبادت الہی، پارسائی و پاکدامنی اور صلاح و پرہیزگاری میں بلند درجہ پر فائز، میدان حدیث کے شہسواروں میں تھے۔

(۶) امام ابو حاتم ابن حبان المتوفی ۳۵۴ھ یوں مدح سرائی:

”کان أبو داؤد أحد ائمة الدنیا فقهاً وعلماً و حفظاً ونسكاً و ورعاً و اتقاناً جمع و صنف و ذب عن السنن“ (۳)

فقہ، حدیث، قوت حافظہ، عبادت گزاری، زہد و پارسائی اور حافظہ کی چنگلی

(۱) تہذیب تاریخ دمشق، ج: ۲، ص: ۲۷۷، تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۴، رقم الترمذی ۲۷۶۶

(۲) تہذیب تاریخ دمشق، ج: ۲، ص: ۲۷۷، تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۴، رقم الترمذی ۲۷۶۶

(۳) تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۵، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۱۴

کے اعتبار سے امام ابو داؤد دنیا کے اماموں میں سے ایک تھے، انھوں نے حدیث رسول اللہ..... کی جمع و تالیف اور حمایت سنت کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔

(۷) حافظ ابو عبد اللہ بن مندہ المتونی ۳۹۶ھ نے ان کی عظمت شان کا اظہار اس طرح کیا ہے:

”الذین أخرجوا و ميزوا الثابت من المعلول والخطاء من الصواب

اربعة: البخاری، ومسلم و بعدهما ابو داؤد والنسائی“ (۱)

بطور خاص جن ائمہ حدیث نے احادیث کی تخریج کی اور ثابت و صحیح کو ضعیف و کمزور سے اور غلط کو درست سے الگ کیا، چار ہیں: امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد اور امام ابو عبد الرحمن النسائی۔

(۸) امام ابو عبد اللہ الحاکم النیساپوری المتونی ۴۰۵ھ کہتے ہیں:

”أبو داؤد إمام أهل الحديث في عصره بلا مدافعة“ (۲)

امام ابو داؤد بغیر کسی اختلاف کے اپنے عہد میں علمائے حدیث کے امام تھے۔

(۹) امام ابن الجوزی المتونی ۵۹۷ھ کا بیان ہے:

”كان عالما عارفا بعلل الحديث ذا عفاف وورع وكان يشبه باحمد بن

حنبل“

امام ابو داؤد عالم، حدیث کی علتوں کے پہچاننے والے، پاکبازی و پرہیزگاری سے متصف تھے اور حسن سیرت میں امام احمد بن حنبل سے مشابہ تھے۔

(۱۰) امام النووی المتونی ۶۷۶ھ رقمطراز ہیں:

(۱) ایضاً

(۲) ایضاً

”اتفق العلماء على الثناء على أبي داؤد و وصفه بالحفظ التام والعلم الوافر والإتقان والورع والدين والفهم الثاقب في الحديث وغيره“ (۱)

امام ابو داؤد کی ستائش اور ان کی بھرپور قوت حافظہ، علم کی کثرت، ضبط کی پختگی، پارسائی اور دینداری اور حدیث وغیرہ علوم میں فہم رسا پر علماء کا اتفاق ہے۔

امام ابو داؤد کی تصنیفی خدمات

(۱) رسالة الى اهل مكة في وصف سننه : علماء مکہ نے ایک تحریر کے ذریعہ امام ابو داؤد سے ان کی کتاب السنن کی احادیث کے مرتبہ صحت وغیرہ سے متعلق امور کی وضاحت چاہی تھی اسی کے جواب میں انھوں نے یہ رسالہ قلمبند کیا تھا، یہ رسالہ پہلی بار مطبع الانوار قاہرہ سے ۱۳۶۹ھ میں محقق جلیل علامہ محمد زاہد الکوثری کے مقدمہ اور تعلق و تحقیق کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ اور معروف محقق علامہ عبدالفتاح ابوعدہ کی تحقیقات و تعلیقات سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

(۲) مسائل الإمام أحمد رواية أبي داؤد : علامہ رشید رضا کے مقدمہ اور استاذ محمد بہجت البیطار کی تصحیح سے مطبع المنار مصر سے پہلی بار ۱۳۵۳ھ میں یہ رسالہ شائع ہوا تھا بعد میں اسی نسخہ کی فوٹو کاپی سے بیروت سے اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہوئے۔

(۳) سوالات الآجرى : یہ کتاب علم حدیث کے اہم ترین فن معرفۃ الرجال (جرح و تعدیل) کے موضوع پر ہے اس کتاب کا ایک ناقص نسخہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے ڈاکٹر محمد علی قاسم العمری کی تحقیق و تعلق کے ساتھ ۱۴۰۳ھ میں طبع ہوا تھا پھر دوسرانی الجملہ مکمل نسخہ ۱۴۱۸ھ میں ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی کے مقدمہ اور تعلق کے ساتھ مکتبہ دارالاستقامہ مکہ مکرمہ نے شائع کیا ہے جو اصل کتاب کے جزء ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ پر مشتمل ہے۔ جزء اول مفقود ہے، اس لیے شامل کتاب نہیں ہو سکا۔

(۴) تسمية الإخوة الذين روى عنهم الحديث : موضوع نام سے ظاہر

ہے حال ہی میں یہ رسالہ ڈاکٹر باسم فیصل الجوابرہ کی تحقیق سے شائع ہو گیا ہے۔

(۵) أسئلة لأحمد بن حنبل عن الرواة الثقات والضعفاء: چند سال پہلے یہ رسالہ بھی ڈاکٹر زیاد محمد منصور کی تحقیق سے شائع ہو گیا ہے۔

(۶) المراسيل: امام ابوداؤد کی یہ معروف تصنیف ۱۳۱۰ھ میں مصر سے طبع ہوئی تھی بعد میں بیروت سے دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اور تیسرا ایڈیشن شیخ شعیب الارناؤط کی تحقیق سے شائع ہوا ہے یہ نسخہ سابقہ نسخوں کے لحاظ سے زیادہ مفید و مکمل ہے۔

(۷) الناسخ والمنسوخ: امام ابوداؤد سے اس کتاب کی روایت ابو بکر احمد النجاد کرتے ہیں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اس کی صراحت کی ہے۔ (۱)
(۸) کتاب الزهد: ضیاء الحسن السنانی کی تحقیق کے ساتھ الدار السلفیہ بمبئی سے چند سال قبل شائع ہو گئی ہے۔

(۹) کتاب الرد علی اهل القدر: حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ امام ابوداؤد سے اس کی روایت ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن یعقوب التوتی کرتے ہیں (۲)

(۱۰) کتاب البعث والنشور: الزرکلی نے الاعلام میں اور بروکلیمان نے تاریخ الادب العربی میں اس کا تذکرہ کیا، امام ابوداؤد کے خلف الصدق ابو بکر عبد اللہ الجستانی کی بھی ایک تصنیف اسی نام سے ہے۔ (۳)

(۱۱) المسائل التي حلف عليها الإمام أحمد بن حنبل: اس کتاب کا سوورق پر مشتمل مخطوطہ الظاہریہ میں ہے۔

(۱۲) دلائل النبوة

(۱۳) کتاب الدعاء

(۱) ج: ۴، ص: ۱۵۴، رقم الترمذیہ ۲۶۲۸

(۲) الاعلام، ج: ۳، ص: ۱۲۲، تاریخ الادب العربی، ج: ۳، ص: ۱۸۹

(۳) تاریخ التراث العربی، ج: ۱، ص: ۲۳۸

(۱۴) کتاب ابتداء الوحي

(۱۵) کتاب أخبار الخوارج

(۱۶) التفرد فی السنن

(۱۷) فضائل الأنصار

(۱۸) مسند مالك نمبر شمارہ ۱۲ سے ۱۸ تک سات تصانیف کا ذکر حافظ ابن حجر نے

تہذیب کے مقدمہ میں کیا ہے۔

(۱۹) أصحاب الشعبي: اس کتاب کا ذکر سوالات الآجری میں آیا ہے۔

(۲۰) کتاب السنن: امام ابوداؤد کے تصنیفی کاموں میں یہ کتاب شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ امام جستانی کی یہی وہ عظیم تصنیف ہے جس نے ان کے شرف و مجد کو ثریا کی رفعت و بلندی عطا کی اور ان کے نام و کام کو ذکر و دوا کی دولت بکراں سے ہم آغوش کر دیا جو اپنے زمانہ تالیف سے آج تک محدثین و فقہاء کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔
”ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء“



اجودھیا کے مشاہیر علماء و مشائخ

اجودھیا شہر فیض آباد سے جنوب مشرق میں ۶ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قدیم قصبہ ہے جس کی کل آبادی اس وقت ۳۵ ہزار کے قریب ہے جن میں مسلمان صرف ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں۔ اس قدیم آبادی میں $\frac{۳}{۴}$ ہزار نئے پرانے مندر ہیں اور تقریباً ایک صد سے زائد قدیم مسجدیں ہیں۔ کسی زمانہ میں یہاں بدھوں اور جینیوں کی عبادت گاہیں بھی تھیں مگر اب ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں ہے۔ سرکاری اندراج کے مطابق ۲۷ قبرستان ہیں جن میں سے صرف ۶ قبرستانوں میں بروقت مُردے دفن کرنے کی اجازت ہے۔

مسجدیں بالعموم خستہ حالت میں ہیں جن کی مرمت و تعمیر کی اجازت نہیں ہے جبکہ مندروں کی مرمت و تعمیر پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں ہے۔ اسی جانب دارانہ پالیسی کی وجہ سے مسجدوں کی تعداد گھٹ کر سورہ گئی ہے ورنہ زبانی روایات کے مطابق یہاں ہزاروں چھوٹی بڑی مسجدیں تھیں۔

اجودھیا کی روایتی خصوصیت

مشہور روایت کے مطابق یہ شہر ابوالانسان حضرت آدم علیہ السلام کے صلی صاحبزادے حضرت ”شیت“ علیہ السلام کا مدفن اور ”رام جی“ کا جنم استھان ہے اسی بناء پر مسلمان اور ہندو دونوں اس سرزمین کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کے ساتھ جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت شیت کا مزار آج بھی متعین و معلوم طور پر اجودھیا میں موجود ہے اور بلا اختلاف ہندو و مسلمان دونوں اسے متبرک و مقدس سمجھتے ہیں۔

اجودھیا اپنی اسی روایتی خصوصیت کی بناء پر ہمیشہ سے مشائخ و صوفیاء اور سادھوؤں و سنتوں کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی یہاں سیکڑوں مشائخ و اولیاء کے مزارات اور ان کی

خانقاہوں کے آثار موجود ہیں اور زبان حال سے اپنی عظمت رفتہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ نوابان اودھ کی عملداری اور انگریزوں کے جابرانہ تسلط نے اجودھیا کی اس مرکزیت کو باقی نہیں چھوڑا اول الذکر نے اپنے مخصوص مذہبی عقائد و نظریات اور انگریزوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی غرض سے یہاں کی اسلامی روایات کو اپنی شاطرانہ چالوں سے پامال کر دیا۔ آزادی کے بعد بنائے وطن کے ایک مخصوص طبقہ نے حکومت کی غیر منصفانہ خاموشی اور درپردہ تعاون سے رہی کسر بھی پوری کر دی اور آج صورت حال یہ ہے کہ اس سرزمین پر مسلمانوں کے وجود کو ننگ و عار سمجھا جا رہا ہے اور اسلامی عبادت گاہوں (مساجد) کو مندروں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ جس طرح یہ سرزمین ہندوؤں کے نزدیک رام جنم بھومی ہونے کی وجہ سے پوتر ہے اسی طرح مسلمانوں کے نزدیک بھی حضرت شیت علیہ السلام کے مدفن اور سیکڑوں اولیاء کی خواب گاہ ہونے کی بناء پر مقدس و متبرک ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہائے وطن جن روایات کے سہارے اجودھیا کو رام جی کی جنم بھومی کہتے ہیں ان سے کہیں زیادہ اور مضبوط تاریخی روایات سے اس سرزمین میں حضرت شیت علیہ السلام کا مزار ہونا ثابت ہے دور جدید کی تحقیق کے اعتبار سے اگر یہ روایتیں محل نظر ہیں تو جنم استھان کی روایت اس سے بھی زیادہ کمزور اور عقل و تحقیق سے بعید ہے۔

اس مختصر مقالہ میں ان روایتوں کی تنقیح و تحقیق کی گنجائش نہیں انشاء اللہ کسی اور موقع پر اس اجمال کی تفصیل پیش کی جائے گی اس مختصر تمہید کے بعد چند مشائخ کے حالات ملاحظہ فرمائیں جن سے کچھ نہ کچھ حقیقت حال ضرور منکشف ہوگی۔

(۱) قاضی قدوة الدین

قاضی قدوة الدین بن میرک شاہ بن ابوالعلی اسرائیلی اودھی متقدمین علمائے ہند میں صاحب کمال بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ علوم و فنون میں مکمل دستگاہ رکھنے کے ساتھ شیخ عثمان ہرونی (مرشد شیخ معین الدین سجزی و جمیری متوفی) سے سلوک و طریقت کی

تخصیص کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد یہاں تشریف لائے اور سکونت کے لئے اجودھیا (اودھ) کو منتخب کیا۔

قاضی صاحب نہایت جری اور حق گو تھے امر بالمعروف و نہی عند المنکر میں امراء و حکام کی بھی مطلق پروا نہیں کرتے تھے ۶۰۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۱)

بابری مسجد کے سامنے پورب جانب پختہ چبوترہ پر آپ کی قبر آج بھی موجود ہے۔ اور عوام میں ”قاضی قدوہ کا مزار“ کے نام سے مشہور ہے اس قبر کے ارد گرد بالخصوص جنوب کی سمت بہت سی قبریں تھی مگر اب انھیں برابر کر کے کھیت بنا لیا گیا ہے۔

قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ اعز الدین اس دیار کے قاضی مقرر ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں بڑی برکت عطا کی اور ان کا سلسلہ اس علاقے میں خوب پھیلا۔ بقول شیخ جیبہ الدین اشرف لکھنوی مولف بحر ذخا اس خاندان کے لوگوں نے اجودھیا کے اطراف و جوانب میں تقریباً پچاس گاؤں بسائے۔ چنانچہ سورا پور ضلع فیض آباد، لکھنؤ، نواب گنج ضلع بارہ بنکی وغیرہ میں اس سلسلہ کے لوگ اب بھی موجود ہیں جو اپنے آپ کو انھیں قاضی قدوہ الدین کی جانب منسوب کرتے ہوئے قدوائی کہتے اور لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر ڈیر مولف شہر اولیاء اپنی کتاب کے صفحہ ۲۵۹ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

”معتبر کتب تاریخ میں کسی قاضی قدوہ نامی شخص کا شہر اودھ (اجودھیا) میں

بطور حاکم یا قاضی شہر آنا ثابت نہیں ہے۔“

ڈاکٹر صاحب موصوف اگر تھوڑی سی زحمت گوارا فرما کر بحر ذخا یا نزہۃ الخواطر کو دیکھ لیتے تو اس غلط حاشیہ آرائی سے بچ جاتے۔

(۲) شیخ الاسلام فرید الدین اودھی

شیخ الاسلام فرید الدین اودھی، نحو، لغت، ادب، تفسیر وغیرہ علوم میں امتیازی شان

کے مالک تھے۔ مولانا عبدالحی حسنی ان کے متعلق لکھتے ہیں ”لم یکن مثله فی زمانہ“ احکام فرعیہ میں امام شافعی کے پیرو تھے۔ اجودھیا میں شیخ الاسلام کے باوقار منصب پر فائز تھے اور کار منصبی کے ساتھ طلبہ کو درس بھی دیتے تھے۔ علامہ شمس الدین بن یحییٰ اوشیح علاء الدین نیلی جیسے اساطین فن آپ کے خوان علم کے ریزہ چیں تھے۔ افسوس کی اس یگانہ دہر کے تفصیلی حالات و سن وفات دستیاب نہیں البتہ مولانا شمس الدین اودھی اور مولانا نیلی کا ان سے تلمذ یقینی طور پر بتاتا ہے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل کے بزرگ ہیں۔ (۱)

(۳) شیخ بدر الدین واعظ

شیخ بدر الدین حنفی اودھی صلاح و تقویٰ سے متصف عہد علانی کے زبردست واعظ و مذکر تھے، مستقل قیام اجودھیا ہی میں تھا مگر وعظ و تذکیر کی غرض سے گاہے بہ گاہے دارالحکومت دہلی تشریف لے جاتے اور وہاں مہینوں قیام کر کے خلق خدا کو اپنے مواعظ و نصائح سے مستفید کرتے تھے مورخ برنی اپنی تاریخ میں شیخ کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

”شیخ بدر الدین زہد و تقویٰ میں بلند مرتبہ کے حامل تھے گفتگو میں تصنع و تکلف سے پرہیز کرتے تھے، راست گوئی عادت ثانیہ تھی۔ ان کی مجلس وعظ میں ہر طبقے کے لوگ حاضر ہوتے تھے وعظ کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ سامعین روتے روتے نڈھال ہو جاتے تھے۔“ (۲)

مزید تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں ہاں علاء الدین خلجی کے عہد سلطنت کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی کے ابتدائی عہد کے بزرگ ہیں۔ کیونکہ شاہ علاء الدین خلجی ۶۹۲ھ میں تخت نشین ہوا ہے اور بیس سال حکومت کر کے ۷۱۶ھ میں وفات پا گیا۔

(۴) قاضی محی الدین کاشانی

قاضی محی الدین اجودھیا کے ایک ذی اثر خاندان کے فرد فرید تھے سلسلہ نسب یوں

بیان کیا جاتا ہے، قاضی محی الدین کاشانی، بن قاضی جلال الدین، بن قاضی قطب الدین، از اولاد زید بن اسود بن سید ابراہیم، بن سید محمد، بن سید قاسم، بن ابراہیم طباطبایہ بن اسمعیل، بن ابراہیم، بن عمر بن حسن حسنی بن حضرت حسن بن علی بن ابی طالب (۱)۔

قاضی کاشانی حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں زہد و تقویٰ اور علمی تبحر میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ ابتداء میں حکومت سے متعلق رہے لیکن جس وقت شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سرکاری وثیقہ کو پارہ پارہ کر کے فضا میں بکھیر دیا۔ اور ریاست و امارت کے بجائے فقر و مسکنت کی زندگی اختیار کر لی۔ بالآخر سلطان المشائخ نے قاضی صاحب کے عمدہ احوال کو دیکھ کر اپنے دست خاص سے خلافت نامہ لکھ کر عنایت فرمایا۔ خلافت نامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

می باید کہ تارک دنیا باشی۔ بسوئے دنیا و ارباب دنیا مائل نہ شوی و دیہ قبول نہ کنی وصلہ بادشاہان مگیری و اگر مسافران بتو رسند و بر تو چیزے نباشد ایں حال را غنیمتی و نعمتی شمیری از نعمتہائے الہی فان فعلت و ما امرتک و وطنی بک ان تفعل کذالک فانک خلیفتی وان لن تفعل فاللہ خلیفتی علی المسلمین (۲)۔

تارک دنیا رہنا، دنیا اور دنیا والوں کی طرف مت جھکنا، بادشاہوں کی جاگیر اور انعام قبول نہ کرنا اگر مسافر تمہارے مہمان ہوں اور تمہارے پاس کچھ بھی نہ ہو تو اس حالت کو غنیمت سمجھنا اور اسے اللہ کی نعمت باور کرنا۔ اگر تم میرے حکم کے مطابق عمل پیرا رہے اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہی کرو گے تو تم میرے خلیفہ ہو اگر بالفرض تم نے ان باتوں پر عمل نہیں کیا تو پھر مسلمانوں پر میرا قائم مقام اللہ تعالیٰ ہے۔

قاضی صاحب حسب ہدایت شیخ پوری استقامت کے ساتھ دنیا و اہل دنیا سے کنارہ

(۱) دہلی کے ۲۲ خواجہ ص ۱۸۰۔

(۲) سیر الاولیاء ص ۲۹۵۔

کش ہو کر یاد الہی اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ کچھ دنوں کے بعد تنگ دستی اور فقر وفاقہ اس انتہا کو پہنچ گئی کہ ان کے گھر والے بلبلا اٹھے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر قاضی صاحب کے ایک شناسا نے اس کا تذکرہ سلطان علاء الدین خلجی سے کر دیا۔ سلطان نے اجمودھیہ کا منصب قضا (جو ان کا موروثی منصب تھا اور اپنے علم و فضل کی بناء پر یہ اس کے اہل بھی تھے) کا پروانہ ان کے نام بھیج دیا۔ قاضی صاحب حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض رسا ہوئے کہ یہ عہدہ قضا بغیر کسی طلب کے مرے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اس بارے میں حضرت کا منشا کیا ہے؟ یہ سن کر سلطان المشائخ نے ناخوش ہو کر فرمایا پہلے تمہارے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا ہوگا جب ہی تو ایسا ہوا ہے۔ اور خلافت نامہ ان سے واپس لے لیا۔ تقریباً ایک سال تک شیخ ان سے کبیدہ خاطر رہے بالآخر امیر خرد کی سفارش پر راضی ہوئے اور تجدید بیعت کر کے خلافت نامہ واپس فرما دیا۔ سلطان المشائخ کی حیات ہی میں قاضی صاحب ۱۹۷۱ھ میں وفات پا گئے۔ (۱)

(۵) شیخ تقی الدین علم بخش

شیخ تقی الدین علم بخش اودھی اپنے عہد کے علمائے کبار و مشائخ عظام میں سے تھے آپ شیخ داؤد المہی متوفی ۶۸۰ھ خلیفہ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کے برادر زادہ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ماموں تھے۔ (۲)

گم گشتہ حالات اجمودھیہ میں مولوی عبدالکریم اودھی متوفی ۱۳۰۷ھ نے شیخ تقی الدین کو بھی شیخ فرید الدین مسعود کا خلیفہ بتایا ہے مگر یہ بات تشہہ تحقیق ہے اس لئے لائق اعتماد نہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی آپ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

(۱) قاضی کے حالات کیلئے سیر الاولیاء از میر خسرو، اخبار الاخیار از شیخ عبدالحق دہلوی، خزینۃ الاصفیاء غلام سرور لاہوری، تذکرہ علمائے ہند مولوی رحمان علی، ذمہ الخواطر ج ۲، اور تاریخ مشائخ چشت پرود فیس خلق نظامی دیکھی جائیں۔

(۲) منبع الانساب از مولوی معین بن شہاب جھوسوی۔

بغایت متقی بود کار او آں بود کہ کتاب اورادے داشت آنرا می گرفت و در آخر شب از خانہ بیرون می آمد تمام روز در جائے مشغول می بود چوں پارہ از شب می گذشت بخانہ می آمد۔

بڑے متقی تھے ان کا معمول تھا کہ اپنی وظائف کی کتاب لے کر رات کو پچھلے پہر آبادی سے باہر نکل جاتے اور پورے دن وہیں یاد الہی میں مشغول رہتے اور کچھ رات گئے وہاں سے گھر واپس آتے۔ (۱)

آپ کے چچا شیخ داؤد پالہی کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ نماز فجر کے بعد جنگل میں چلے جاتے اور وہیں دن بھر عبادت حق میں مستغرق رہتے۔ (۲) ممکن ہے شیخ تقی الدین نے اپنے عم محترم سے یہ طریقہ اخذ کیا ہو۔

جس خوش قسمت کو آپ کے آگے زانوائے ادب تہہ کرنے کی توفیق مل جاتی وہ ان کی انفاس قدسیہ کی برکت سے علم کی دولت سے مالا مال ہو جاتا تھا اس لئے لوگ آپ کو علم بخش کہا کرتے تھے۔ مولوی عبدالکریم اودھی اپنے والد مولوی عبدالرؤف کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ والد ماجد کہا کرتے تھے کہ میرے بچپن کے وقت تک طلبہ اور شائقین علم پنجشنبہ کو آپ کے مزار پر حاضر ہو کر ترقی علم و افزائش حفظ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ (۳)

ماہ رجب ۲۶ھ میں آپ نے دار دنیا کو الوداع کہا۔ (۴)

مزار اجودھیا میں ایٹو اتالاب (جو اس وقت ستیہ ساگر کے نام سے مشہور ہو گیا ہے) کے اوپر ہے۔ (۵)

لطائف اشرفی کی اس نشاندہی کی بنیاد پر آپ اس وقت مزار تک پہنچنا چاہیں تو کبھی بھی نہیں پہنچ سکتے کیونکہ یہ بیان اب سے تقریباً چھ سو سال پہلے کا ہے اگرچہ ایٹو اتالاب نام کی تبدیلی کے ساتھ سہی اب بھی موجود ہے مگر اس کے حدود اور بچہ یکسر بدل چکے

(۱) اخبار الاخیار ۱۷۱۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۱۳۔

(۳) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۵۔

(۴) ایضاً۔

(۵) لطائف اشرفی ملفوظات وکتوبات مخدوم اشرف سمنانی کچھ چھوی۔

ہیں اور ایک ایٹو اتالاب کی کیا تخصیص ہے اب تو پورے اجودھیا کے آسمان وزمین کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اس لئے اس نابغہ عصر اور مرد کامل کے مزار تک پہنچنے کے لئے درج ذیل تفصیلات پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

محلہ نوگزی (اس محلہ میں وہ قدیم قبرستان ہے جو نبی نوح سے موسوم ہے اور اس قبرستان میں وہ مشہور و معروف قبر ہے جو نوگزی کہی جاتی ہے مگر پیمائش میں چودہ گز سے زیادہ لمبی ہے اسی قبر کے نام پر یہ محلہ نوگزی کہلاتا ہے) سے جانب مشرق تقریباً ۳۲،۳۰ میٹر کے فاصلے پر ”کیوڑا مسجد“ ہے، مسجد کی پشت سے ایک راستہ اتر کو جاتا ہے اس راستہ کو تھوڑی دور طے کرنے کے بعد ایک سڑک ملے گی۔ اس سڑک سے پورب جانب ۲۲،۲۰ میٹر چلنے پر ”چھوٹی کنیا“۔ نامی ایک مندر ملے گا۔ یہ مندر ایک وسیع احاطہ کے اندر ہے۔ احاطہ میں داخلہ ایک بلند پھاٹک سے ہوتا ہے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی پھاٹک سے متصل داہنے ہاتھ ایک چبوترے پر آپ کو ایک قبر نظر آئے گی۔ یہی حضرت شیخ تقی الدین علم بخش اودھی کی آرام گاہ ہے۔ مندر کا یہ احاطہ آج سے ایک صدی قبل مسلمانوں کا قبرستان تھا جس میں بے شمار قبریں تھیں مگر اب شیخ تقی الدین کے علاوہ کسی قبر کا نام و نشان باقی نہیں ہے۔ ”مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے“۔

قبر اگرچہ کافی بوسیدہ ہو گئی ہے مگر مندر کے پجاری اس پر سفیدی کراتے رہتے ہیں اور قبر کے ارد گرد حصے کو ستھرا رکھتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مندر کے پیراگیوں کے دل میں اس کی عزت و حرمت باقی ہے۔ اگر کوئی بھولے بھٹکے برائے فاتحہ درگاہ علم بخش کی تلاش میں ادھر آ جاتا ہے تو پجاری اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور اسے مزار تک پہنچا دیتے ہیں۔ (۱)

(۶) شیخ شمس الدین اودھی

شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں علمی تبحر، زہد

(۱) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۵۔

وتقویٰ اور درس وافادہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سید محمد علوی (میر خرد) لکھتے ہیں۔

کار علم و تبحر خدمت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بجائے کشید کہ استادان شہر بخدمت
ایں بزرگ بزائوے ادب بنشستند و تلمذ کردند... بیشتر علمائے شہر منسوب بہ
شاگردی ایں بزرگ اندوسند علم ہائے ظاہری و تحقیق دینی نسبت بدان
بزرگ کنند و فخر و مباہات بجلس رفیع آں بزرگ دانند، کسے کہ بہ شاگردی
ایں بزرگ منسوب است میاں علماء بغایت معظم و مجبل و مکرم است۔ (۱)

مولانا کا علمی تفوق اس درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ دہلی کے اساتذہ ان کے
سامنے زائوے ادب چھاتے ہیں دہلی کے اکثر علماء ان کے شاگرد ہیں اور
علوم و فنون و تحقیقات دینیہ میں مولانا ہی سے استناد کرتے ہیں۔ اور آپ کی
علمی مجلس کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ جسے بھی آپ کی شاگردی کا
شرف حاصل ہو جاتا ہے وہ علماء میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھا
جاتا ہے۔

آپ کے خواجہ تاش اور تلمیذ رشید شیخ نصیر الدین چراغ دہلی متوفی (۵۷۷ھ) نے
آپ کی علمی سرگرمیوں کی مدح سرائی ان الفاظ میں کی ہے۔

سألت العلم من احياءك حقا فقال العلم شمس الدين يحيى (۲)
میں نے علم سے پوچھا کہ واقعتاً (اس زمانہ میں) تجھے کسی نے زندگی عطا کی
تو علم نے جواب دیا شمس الدین یحییٰ نے۔

مولانا آزاد بلگرامی اپنے مختاط انداز میں یوں رقمطراز ہیں۔

ثم اقام مولانا شمس الدين في ظل شيخه بدھلی فانار سوادها الاعظم
بالتدريس ومن على العالم الدراسة بالتأسيس وانتهت اليه رياسة التدريس بدار
الخلافة. (۳)

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۲۶۔ (۲) سبتہ المرحان آزاد بلگرامی ص ۲۹۔

(۳) سبتہ المرحان آزاد بلگرامی ص ۲۹۔

بعد ازاں اپنے شیخ (نظام الدین اولیاء) کے زیر سایہ دہلی میں مقیم ہو گئے
اور درس و تدریس کے ذریعہ دہلی میں ایک بہت بڑی جماعت کو علم کی روشنی
سے منور کر دیا اور تدریسی مسئلہ میں استحکام پیدا کر کے اس پر احسان فرمایا
دارالخلافت دہلی میں تدریس کی ریاست آپ پر ختم ہو گئی۔

شیخ شمس الدین اودھی نے علوم و فنون کی تحصیل شیخ الاسلام فرید الدین شافعی اودھی
اور شیخ ظہیر الدین بھکری وغیرہ اساتذہ سے اودھ اور دہلی میں کی تھی۔ تکمیل درس کے بعد
سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں رہ کر سلوک و معرفت کی منزلیں
طے کیں اور خلافت سے مشرف ہوئے۔ سلطان المشائخ نے جو خلافت نامہ عطا فرمایا تھا
اس پر کتابت کی تاریخ ۲۰/رمزی الحجہ ۷۲۳ھ درج ہے۔ (۱) سلطان المشائخ خلافت نامہ میں
لکھتے ہیں۔

ثم ان الولد الاعز التقى والعالم المرضى المتوجه الى رب العالمين
شمس الملة والدين محمد بن يحيى افاض الله الواحد انواره على اهل
التقوى واليقين. لما صح مقصده الينا ولبس خرقة الارادة واستوفى حظه من
صحبتنا اجزت له اذا استقام على اتباع سيد الكائنات واستغرق الاوقات
بالطاعات ودافت القلب عن هواجس النفس والخطرات واعرض عن الدنيا
واسبابها ولم يركن الى ابنائها واربابها وانقطع الى الله بالكلية واشرفت في
قلبه الانوار القدسية واسرار الملكوتية وانفتح باب الفهم لتعريفات الالهية ان
يلبس الخرقة المرديدن ويرشداهم الى مقامات الموقنين الخ (۲)

صاحب تقویٰ، پسندیدہ عالم، پروردگار عالم کی جانب متوجہ رہنے والا عزیز
فرزند شمس الدین محمد بن یحییٰ نے (اللہ تعالیٰ اس کے انوار سے اہل یقین
اور اصحاب تقویٰ کو مستنیر کرے) جب اپنی نیت ہماری جانب درست کر لی

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۳۱۔

(۲) سیر الاولیاء ص ۲۳۰۔

اور ارادت کا خرقہ پہن لیا اور ہماری صحبت سے پوری طرح مستفید ہو گیا (اور میں نے یہ محسوس کیا کہ) وہ سید کائنات کی پیروی میں ثابت قدم ہے اور اپنے اوقات یاد الہی میں مصروف رکھتا ہے۔ اور نفسانی توہمات سے اپنے قلب کو محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا اور اسباب دنیا سے رخ موڑ لیا ہے اور ارباب دنیا کی جانب مائل نہیں ہوتا اور پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہے اور اس کے قلب میں عالم قدس کے انوار درخشاں اور عالم ملکوت کے اسرار چمک رہے ہیں اور معرفت الہیہ کا باب اس پر کھل گیا ہے تو میں نے اسے اجازت و خلافت دے دی کہ وہ مریدین کو بیعت و ارادت کا خرقہ پہنائے اور انہیں اہل یقین کی راہ دکھائے۔

سلطان المشائخ نے آپ کے لئے جن و قیام احوال کا ذکر کیا ہے ان سے طریقت و معرفت میں آپ کی علوشان کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کے مزاج میں بڑی سادگی تھی۔ تکلفات اور رسم و رواج کے بالکل پابند نہیں تھے۔ حتیٰ کہ نکاح بھی نہیں کیا تھا اور پوری زندگی تجرد میں بسر کر دی۔ امراء و اغنیاء کے دربار میں حاضری گوارا نہ تھی اور نہ اپنے پاس ان کی آمد و رفت پسند تھی۔ تصوف کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود سجادہ مشیخت پر بیٹھنے سے گریز کرتے تھے اس لئے جلد کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر خلافت نامہ پر حضرت سلطان المشائخ کے دستخط نہ ہوتے تو میں اسے ہرگز اپنے پاس محفوظ نہ رکھتا۔ فتوح نامی ایک خادم تھا وہی آپ کے خانگی معاملات کا منتظم تھا۔ آپ کے کھانے پینے کے انتظام کے علاوہ واردین و صادرین کی تواضع و خاطر داری اسی کے سپرد تھی۔ خود ہر کام سے فارغ البال رہ کر درس و افادہ، تصنیف و تالیف اور ذکر و مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ (۱)

سلطان محمد بن تغلق جس زمانہ میں علماء و مشائخ کو دہلی سے دعوت و تبلیغ کے نام پر ملک کے دور افتادہ خطوں میں بھیج رہا تھا اس موقع پر اس نے شیخ اودھی کو بھی طلب کیا اور کہا

کہ آپ جیسے عالم و فاضل کا یہاں کیا کام آپ کو تو شہر جا کر اشاعت دین کی سعی کرنی چاہئے۔ اور چند لوگوں کو متعین کر دیا کہ وہ شیخ کو جلد از جلد کشمیر روانہ کر دیں۔ حکم سلطانی کے بموجب سامان سفر درست کرنے کے لئے شیخ گھر واپس آئے۔ اس وقت وہاں جو ارادت مند حاضر تھے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ”انہا چچی گویند من بندگی شیخ را خواب دیدہ ام کی مرطلبد من بخدمت خواجہ بروم ایثاں مرا کجا می فرستادند“ یہ لوگ کیا بکواس کرتے ہیں میں نے خواب دیکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ مجھے بلا رہے ہیں میں تو اپنے شیخ کے پاس جا رہا ہوں یہ لوگ مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ دوسرے دن شیخ کے سینہ میں ایک پھوڑا نکل آیا اور اسی عارضہ میں جان جان آفریں کے حوالہ کر دی اور اپنے شیخ سلطان المشائخ کے حظیرہ میں اندرونی گنبد کے سامنے مدفون ہوئے۔ (۱) مولوی رحمن علی نے سن وفات ۷۴۷ھ لکھی ہے۔

شیخ اودھی کثیر التصانیف عالم تھے چنانچہ ان کے قریب ہم عصر میر خرد لکھتے ہیں ”چندیں تصانیف در علوم دینی از خدمت آں بزرگ در عالم یادگار ماندہ است“ (۲) مولانا بلگرامی لکھتے ہیں ”مولانا تصانیف دارادامادریں عصر کم یافت می شود“۔ (۳) مولانا صاحب تصانیف ہیں مگر اس وقت ان کی کتابیں کم یافت ہیں۔

گردش لیل و نہار نے اس فاضل اجل کی علمی یادگاروں کو اس طرح گم کر دیا ہے کہ آج ”شمس العوارف“ اور ”شرح مشارق الانوار“ کے علاوہ دیگر کتابوں کے نام کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے۔ آپ کا تذکرہ سیرالاولیاء، اخبار الاخیار، سبحة المرجان، آثار الکرام، خزینۃ الاصفیاء، حدائق حنفیہ، تذکرہ علمائے ہند، زہد الخواطر ج ۲ وغیرہ میں موجود ہے۔

(۷) شیخ جلال الدین اودھی

شیخ جلال الدین اودھی نحو، فقہ اور اصول فقہ کے زبردست عالم اور زہد و تقویٰ سے

(۱) ایضاً ص ۲۲۸۔ (۲) سیرالاولیاء ص ۲۲۶۔

(۳) آثار الکرام ص ۱۸۳۔

متصف بزرگ تھے۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ حسب تصریح میر خرد علمائے اودھ میں سب سے پہلے آپ ہی حضرت سلطان المشائخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے تھے۔ اسی بناء پر تمام علمائے اودھ آپ کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میر خرد یہ دلچسپ واقعہ بھی لکھتے ہیں کہ ”یاران اودھ“ جو سب کے سب عالم و فاضل تھے اور ان میں سے اکثر ایک عرصہ تک علمی اشتغال میں اپنی عمر بسر کر چکے تھے۔ مگر سلطان المشائخ سے بیعت ہو جانے کے بعد آگے علمی مشاغل جاری نہ رہ سکے۔ اس لئے سب نے متفق ہو کر شیخ جلال الدین کو تیار کیا کہ سلطان المشائخ سے ہم سب کی طرف سے یہ درخواست کریں کہ ہمیں تھوڑی دیر کے لئے علمی گفتگو اور بحث و تکرار کی اجازت ہو جائے۔ چنانچہ شیخ جلال الدین کی قیادت میں یہ سب لوگ سلطان المشائخ کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ جلال نے حسب قرار مدعا پیش خدمت کیا، شیخ نے سن کر فرمایا ”من چہ کم مرا از ایشان مطلوبے دیگر است و ایشان ہچوں پیاز پوست در پوست اند“ میں کیا کروں میرا مقصد تو انہیں مغز بنانا ہے مگر یہ لوگ پیاز کی طرح چھلکے ہی چھلکے ہیں۔ سلطان المشائخ کے اس جواب کا اثر یہ ہوا کہ شیخ جلال الدین نے دنیا کے تمام بکھیروں سے یک سو ہو کر ترک و تری کی زندگی اختیار کر لی اور بقیہ زندگی عزلت میں گزار دی۔ میر خرد آخر میں لکھتے ہیں کہ چند روز بیمار رہ کر یہ فرشتہ صفت بزرگ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ میر صاحب نے تاریخ وفات کی تصریح نہیں کی ہے چونکہ خود میر خرد کی وفات ۷۰ھ میں ہوئی ہے اس لئے لازمی طور پر شیخ جلال الدین کی رحلت اس سے پہلے ہوئی ہے۔ (۱)

(۸) مولانا قوام الدین اودھی

مولانا قوام الدین معروف بہ یکدانہ شیخ شمس الدین بن یحییٰ کے تلمیذ اور سلطان المشائخ کے مرید تھے سلطان المشائخ انہیں ”مرد صالح“ کہا کرتے تھے۔ خادم و نوکر کے قطعاً محتاج نہیں تھے۔ اپنا سارا کام خود اپنے ہاتھوں کر لیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات ذکر

(۱) سیر الاولیاء ص ۳۰۵-۳۰۶ و زہد الخواطر ج ۳ ص ۲۳۔

و مراقبہ میں مشغول رہتے، مجاہدہ و ریاضت کا عالم یہ تھا کہ کھانے میں آس (پچھ) پر اکتفا کرتے تھے۔ تفصیلی حالات دستیاب نہیں سیر الاولیاء میں بس یہی چند سطر ہیں۔

(۹) مولانا جمال الدین اودھی

شیخ جمال الدین اودھی سلطان المشائخ کے مرید اور بقیہ عالم تھے۔ میر خرد اپنے والد اور چچا کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا جمال الدین اودھی جس زمانہ میں مرید ہو کر خانقاہ میں مقیم ہوئے اسی زمانہ میں ایک خراسانی عالم (جو کثرت مباحثہ کی وجہ سے مولانا بجاٹ کے نام سے مشہور تھے) خانقاہ میں آئے اور وہاں موجود علماء مولانا و جیہہ الدین پانکی وغیرہ کی موجودگی میں ”بزدوی“ کے کسی مسئلہ پر بحث شروع کر دی۔ بعض علماء کو ساکت بھی کر دیا جس کی بناء پر دوسرے علماء کو ان سے گفتگو کی ہمت نہ ہوئی۔ محفل کا یہ رنگ دیکھ کر مولانا جمال الدین سامنے آئے اور مولانا بجاٹ سے بحث شروع کر دی اور بالآخر انہیں لاجواب کر دیا۔ مولانا جمال الدین کی اس کامیابی پر خانقاہ کے علماء بہت خوش ہوئے انہیں مبارک باد اور دعائیں دیں کہ آج آپ نے مولانا بجاٹ کے سر سے ہمہ دانی کا غرور دور کر دیا۔ اس مجلس میں سلطان المشائخ کے خادم خاص خواجہ اقبال بھی تھے انھوں نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر حضرت سلطان المشائخ کے سے عرض کیا کہ جمال الدین عالم و فاضل ہیں، شیخ نے فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ انھوں نے سارا واقعہ سنا دیا۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ نوجوان کو بلاؤ، چنانچہ شیخ جمال الدین احباب کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے۔ شیخ نے انہیں دیکھ کر فرمایا ”رحمت بر آمدن تو کہ علم خود را نہ فروختی“ تمہارے آنے پر خدا کی رحمت ہو کہ تم نے اپنے علم کو دنیا کے بدلے فروخت نہیں کیا۔

سلطان المشائخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو جانے کے بعد علمی مشغلہ قائم نہیں رہا اور اب سارا وقت یاد الہی میں گزرنے لگا تھا، سماع سے بھی خاص شغف رکھتے تھے۔ (۱)

تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی صاحب گم گشتہ نے لکھا ہے کہ آپ کا مزار اجداد کا ہے۔

(۱) سیر الاولیاء ص ۳۱۹۔

محلہ قضیہ میں قاضی لطف اللہ کی مسجد کے سامنے ہے۔ گری ہوئی عمارتوں اور بنیادوں کے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ وسیع خانقاہ رہی ہوگی۔ (۱) اب یہ آثار بھی مٹ گئے اور ان کی جگہ دوسرے مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔ ”بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے“

(۱۰) علامہ کمال الدین اودھی

علامہ کمال الدین حامد بن عبدالرحمن بن محمد حنفی اودھی شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بھانجے اور اہم خلفاء میں تھے آپ کی ولادت ونشوونما اجدودھیہ میں ہوئی یہیں کے علماء سے اکتساب علم کیا بعد ازاں دہلی جا کر اپنے ماموں چراغ دہلی سے بیعت ہوئے اور سلوک کے مراحل طے کر کے درجہ تکمیل وارثاد پر فائز ہوئے۔

علامہ کمال الدین تمام علوم وفنون میں مہارت کا درجہ رکھتے تھے۔ بالخصوص فقہ، اصول فقہ، حدیث اور تفسیر میں تو یگانہ عصر تھے اور علمی حلقوں میں علامہ کے لقب سے مشہور تھے۔ شجرۃ الانوار میں ہے۔

تا ابتدائے جوانی از فنون علمی بہرہ یاب گشتہ و علم را مرور ایام تمام و کمال ساختہ پیچ علمے از و باقی نماندہ بود کہ دردے کمالے بہم نرسانیدہ۔ و در علم تفسیر و فقہ و حدیث حظے وافر داشت۔ در میان علماء مفسران و فقہاء و محدثان وغیرہ کہ در اں زماں علم علمی افروشتہ بودند بعلامہ شہرت یافتہ۔ (۲)

نوعمری ہی میں علمی فنون سے بہرہ یاب ہو گئے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ علمی ترقی کرتے رہے اور کوئی فن ایسا باقی نہیں بچا تھا جس میں انھوں نے کمال حاصل نہ کیا ہو بالخصوص تفسیر، فقہ اور حدیث میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس عہد کے سربراہ اور مفسرین، فقہاء اور محدثین میں علامہ کے لقب سے مشہور تھے۔

(۱) گم گشتہ حالات اجدودھیہ ص ۴۷۔

(۲) شجرۃ الانوار بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۰۹۔

اپنے شیخ حضرت چراغ دہلی کی تجویز کے مطابق علامہ کمال نے اپنی علمی سرگرمیوں اور دعوت و ارشاد کا مرکز گجرات کو بنایا اور طویل عرصہ تک وہاں مقیم رہ کر علم و دین کی روشنی پھیلاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دیار میں انہیں بڑی مقبولیت عطا کی ہر خاص و عام انہیں عظمت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتا۔ ۷۲۵ھ کے حدود میں بھد فیروز شاہ پھر دہلی واپس آ گئے تھے۔ تکملہ سیرالاولیاء میں ہے کہ جس وقت علامہ کمال الدین گجرات سے دہلی آئے تو ان کے ساتھ تیس اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے تھے۔ چراغ دہلی نے اس مال و اسباب کو دیکھ کر فرمایا۔ اس قدر دنیا اپنے ساتھ کیوں لائے ہو۔ علامہ نے عرض کیا کہ راستے میں اطلاع مل گئی تھی کہ سلطان المشائخ کی رحلت ہو گئی ہے اور ان کی جگہ آپ سجادہ مشیخت پر رونق افروز ہیں اس لئے خیال ہوا کہ اگر خالی ہاتھ جاؤں گا تو لوگ بدگمانیوں میں مبتلا ہوں گے (ورنہ مجھے اس مال و اسباب کی کوئی ضرورت نہیں) اب میں اس سارے مال کو علماء و صوفیاء پر تقسیم کر دوں گا۔ چنانچہ سارا اثاثہ اللہ کے نام پر بانٹ دیا۔ (۱) دہلی ہی میں ۷۵۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

علامہ کمال اگرچہ خود تو دہلی آ گئے تھے مگر اپنی اولاد کو گجرات ہی میں مقیم رہنے کی ہدایت کر آئے تھے تاکہ رشد و ہدایت کا جو سلسلہ انھوں نے قائم کیا تھا وہ چلتا رہے۔ چنانچہ ان کی اولاد میں برابر ایسے فرد کامل پیدا ہوتے رہے جنھوں نے علامہ کی مسند دعوت و ارشاد کو سونپی نہ ہونے دیا۔ علامہ کے بعد ان کے فرزند ارجمند شیخ سراج الدین نے سجادہ مشیخت کو زینت بخشی یہ بڑے صاحب کمال بزرگ تھے۔ فیروز شاہ بہمنی ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا اسی بناء پر اس نے انہیں دکن آنے کی دعوت دی مگر شیخ سراج نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ”حق تعالیٰ مراد گجرات ہرچہ ضرورت است عطا می فرماید“ اللہ تعالیٰ کی عطا سے یہاں ساری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں (پھر دکن آنے کی کیا ضرورت ہے)“ ۸۱۷ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

اس کے بعد شیخ سراج کے صاحبزادے شیخ علم الحق مسند ارشاد پر بیٹھے۔ ان کی

(۱) تکملہ سیرالاولیاء ص ۱۵۔

نیک نفسی اور اللہیت کا اندازہ صاحب شجرۃ الانوار کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ جو بھی کافر، فاسق اور منکر خدمت میں حاضر ہوتا اور کچھ دیر بیٹھ کر آپ کی باتوں کو سنتا وہ اسی مجلس میں تائب ہو کر آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو جاتا تھا۔ (۱)

شیخ علم الحق کے بعد ان کے بیٹے شیخ راجن شجادہ نشین ہوئے۔ پھر علی الترتیب شیخ جمال الدین عرف جن، شیخ حسن محمد اور شیخ یحییٰ مدنی نے مسند ارشاد کو رونق بخشی۔ تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں علامہ کمال کی خانقاہ کے صاحب سجادہ شیخ محمود تھے جو علامہ ہی کی اولاد میں سے تھے۔ (۲)

علامہ کمال الدین اودھی کے حالات کے لئے شجرۃ الانوار، خزینۃ الاصفیاء، تذکرہ علمائے ہند، حدائق حنفیہ، نزہۃ الخواطر ج ۲، مزارات اولیائے دہلی، تاریخ مشائخ چشت وغیرہ دیکھی جائیں۔

(۱۱) شیخ نصیر الدین اودھی (چراغ دہلی)

شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبداللطیف معروف بہ چراغ دہلی کا مولد و منشا اور آبائی وطن اجودھیا ہی ہے آپ زبردست عالم و فاضل ہونے کے ساتھ اپنے دور کے سرتاج اولیاء تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے۔

شیخ نصیر الدین محمود، بن یحییٰ، بن عبداللطیف، بن یوسف، بن عبدالرشید، بن سلیمان، بن احمد، بن یوسف، بن محمد، بن شہاب الدین، بن سلطان، بن اسحاق، بن مسعود، بن عبداللہ، بن واعظ اصغر، بن واعظ اکبر، بن اسحاق، بن شیخ ابراہیم، بن ادہم بلخی، بن سلیمان بن ناصر، بن حضرت عبداللہ بن عمر فاروق رضی اللہ عنہم۔ (۳)

(۱) شجرۃ الانوار ص ۲۶ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۰۔

(۲) تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۰۔

(۳) دہلی کے ۲۲ خواجہ ص ۴۷۔

مگر شیخ ابراہیم ادہم بلخی کے بارے میں ابن اثیر، امام بخاری، ابن حجر عسقلانی، سید مرتضیٰ بگرامی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ یہ عمری نہیں تھے بلکہ تمیمی اور بقول بعض عجلی تھے (تفصیل کے لئے اکامل لابن اثیر جلد ۶، تہذیب التہذیب، اتحاف السعادات المتقین شرح احیاء العلوم دیکھی جائیں) اس لئے اس شجرہ نسب پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت شیخ نصیر الدین کے دادا شیخ عبداللطیف نے اپنے آبائی وطن یزد سے ہجرت کر کے لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی پھر آپ کے والد شیخ یحییٰ نے لاہور کی وطنیت ترک کر کے اجودھیا کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اجودھیا ہی میں شیخ نصیر الدین کی ولادت ہوئی ابھی عمر کی صرف نو بہاریں دیکھ پائے تھے کہ والد ماجد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ اس لئے والدہ ماجدہ کی زیر نگرانی تعلیم و تحصیل کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتداء سے لے کر ہدایہ تک کی کتابیں مولانا عبدالکریم شیروانی سے پڑھیں۔ اس کے بعد مولانا افتخار الدین محمد گیلانی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ ان ہر دو اساتذہ کے علاوہ شیخ فخر الدین ہانسوی، قاضی محی الدین کاشانی اور شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی سے بھی آپ کو شرف تلمذ حاصل ہے، ۲۵ برس کی عمر میں علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔

تعلیمی مشغلہ سے فراغت کے بعد عبادت و ریاضت کا داعیہ پیدا ہوا۔ اس لئے مکان ہی میں عزلت نشین ہو کر ذکر و اوراد میں مشغول رہنے لگے۔ پھر چالیس سال کی عمر میں اجودھیا سے رخت سفر باندھا اور دہلی جا کر حضرت سلطان المشائخ کے حلقہ بگوش ہو گئے بالآخر حضرت سلطان المشائخ نے اپنی خلافت سے سرفراز فرما کر چراغ دہلی کے لقب سے امتیاز بخشا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ایک دن شیخ نصیر الدین نے امیر خرد کے ذریعہ حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ بندہ اودھ (اجودھیا) میں رہتا ہے لیکن وہاں لوگوں کے ازدحام اور کثرت آمد و رفت کی وجہ سے ذکر و مراقبہ میں خلل پڑتا ہے اگر اجازت ہو تو کسی جنگل میں تمہارہ کریاد حق میں مشغول رہوں، سلطان المشائخ نے امیر خرد سے فرمایا کہ نصیر الدین سے کہہ دو ”ترادرمیان خلق می باید بود و جھائے

خلق می باید کشید و مکافات بہ بذل و عطامی باید کرد۔^(۱) تمہیں خلق خدا کے درمیان رہنا اور ان کے جو رستم سہنا چاہئے اور ان کی زیادتیوں کا بدلہ داد و دہش سے دینا چاہئے۔

پیر و مرشد کے اس فرمان پر شیخ نصیر الدین آخردم تک عمل پیرا رہے اور ہر ظلم و ستم و جور و جفا کا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا۔ سلطان محمد بن تغلق نے انہیں طرح طرح سے پریشان کیا اور اذیتیں دیں جس کی کچھ تفصیل سیرالاولیاء میں دیکھی جاسکتی ہے لیکن دہلی کا یہ روشن چراغ ظلم و جبر کے تیز و تند طوفانوں کی زد میں بیٹھ کر اپنی ضیاء پائینوں سے ظلمت کدہ ہند کو منور کرتا رہا اور پیر و مرشد نے آپ سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں اپنا خون جگر دے کر انہیں پورا کر دکھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ فقر و صبر اور تسلیم و رضا کے پیکر اور مہر و محبت کے مجسمہ تھے سخت سے سخت ناگوار اور اذیت ناک برتاؤ کو نہ صرف مسکراتے ہوئے برداشت کر لیتے تھے بلکہ اس کے عوض ایثار و مروت اور حسن سلوک کا معاملہ فرماتے تھے۔ آپ کی بلندی اخلاق کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جو آپ کے مجموعہ ملفوظات خیرالجالس کے تکرار میں ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ، ایک دن بعد نماز ظہر حجرہ میں تنہا بیٹھے تھے موقع پاکر ”تراب“ نامی ایک قلندر اندر گھس گیا اور نہایت بیدردی کے ساتھ چاقو سے آپ پر وار کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے جسم میں بارہ زخم لگائے مگر آپ نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ جسم سے خون نکل کر نالی کے راستہ باہر بہنے لگا جسے دیکھ کر مریدین گھبرائے اور اندر جا کر دیکھا تو ان کی نگاہوں کے سامنے یہ منظر تھا کہ یہ بیباک قلندر شیخ کو چاقو سے مار رہا ہے اور شیخ ساکت اور خاموش بیٹھے ہیں۔ مریدین نے اسے پکڑ کر سزا دینی چاہی لیکن شیخ نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی قلندر کو اپنے پاس ہی روک لیا۔ اور اپنے مرید خاص مولانا عبدالمقندر تھامسری، شیخ صدر الدین طیب اور خادم خاص و بھانجہ شیخ زین الدین علی کو اپنے پاس بلا کر قسم لی کہ قلندر کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائیں گے پھر قلندر کو بیس تیکہ

(اس عہد کا سکہ) یہ کہہ کر عطا فرمایا کہ شاید چاقو مارنے میں ہاتھ کو تکلیف پہنچی ہو۔ (۱) تسلیم و رضا اور مہر و وفا کا یہ تاجدار ۱۸ رمضان المبارک ۷۵۷ھ / ۱۳۵۹ء کو پوند خاک ہو گیا (۲)

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لعین تو نے یہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے حضرت سلطان المشائخ کے دامن سے وابستگی کے بعد اگرچہ اجودھیہ سے بود و باش کا تعلق نہیں رہا تھا پھر بھی اس سرزمین سے کسی نہ کسی حد تک رابطہ قائم رہا اور گاہے بہ گاہے اعضاء و اقربا سے ملاقات کے لئے یہاں آتے رہتے تھے۔ غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں۔

صاحب اخبارالاولیاء فرماتے ہیں کہ شیخ نصیر الدین رادر خطہ اودھ خواہرے بود ازوے کلاں و عقیقہ زماں اونیز دو پسر داشت یک مولانا زین الدین علی دوم کمال الدین حامد شیخ نصیر الدین گاہ گاہ از حضرت شیخ اجازت گرفتہ برائے زیارت ہمیشہ مکرمہ در اودھ تشریف بردے وبعد حصول ملاقات وے باز آمدے۔ (۳)

اخبارالاولیاء کے مؤلف لکھتے ہیں کہ شیخ نصیر الدین کی عفت مآب بڑی بہن اجودھیہ میں رہتی تھیں ان کے دو صاحبزادے مولانا زین الدین علی اور مولانا کمال الدین حامد تھے (مولانا کمال الدین کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے) شیخ نصیر الدین ہمیشہ کی ملاقات کی غرض سے باجارت حضرت سلطان المشائخ اجودھیہ تشریف لاتے اور ملاقات کے بعد پھر دہلی واپس چلے جاتے تھے۔

اجودھیہ ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر فاصلے پر جانب مغرب و شمال شیخ نصیر الدین کی ایک ہمیشہ کا مزار ہے جسے عوام عقیدت و احترام میں ”بڑی بوا“ کا مقبرہ کہتے ہیں۔ (۴)

(۱) تکرار خیرالجالس ص ۳۱۴، ۳۱۵۔ (۲) اخبارالاولیاء۔

(۳) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۵۴۔ (۴) گم گشتہ حالات اجودھیہ ص ۴۔

لیکن یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ یہ انہیں خواہر کلاں عقیقہ زماں کا مزار ہے یا کسی دوسری بہن کا البتہ بڑی بوا کے عرفی نام سے ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ یہ انہیں ہمیشہ کلاں کا مزار ہے جن کی ملاقات کے لئے شیخ دہلی کی طویل مسافت طے کر کے اجودھیا آتے تھے۔ اسی مقبرہ کے قریب اجودھیا اور فیض آباد کے مسلمانوں نے بڑی بوا کے نام سے ایک یتیم خانہ جاری کیا ہے جس میں یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کا مفت انتظام ہے۔

کوشلیا گھاٹ اور محلہ مدار کے درمیان جو آبادی ہے وہ آج سے پچاس سال پہلے تک محلہ چراغ دہلی سے موسوم تھی مگر آج کل اسے عالم گنج کٹرہ کہتے ہیں، اسی محلہ میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا آبائی مکان تھا جسے بعد میں آپ نے شیخ فتح اللہ اودھی کو دے دیا تھا۔ شیخ فتح اللہ اسی مکان میں رہتے تھے اور اسی کے متصل ان کا مزار بھی ہے (۱) تفصیل آگے آرہی ہے۔ شیخ کے تفصیلی تذکرہ کے لئے سیر الاولیاء، اخبار الاخبار، خزینۃ الاصفیاء وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔

(۱۲) شیخ علاء الدین نیلی صاحب ”مامقیمان“

شیخ علاء الدین نیلی اودھی اپنے وقت کے زبردست عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ تھے، شیخ الاسلام فرید الدین اودھی شافعی کے تلمیذ اور شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی کے رفیق درس تھے، تفسیر کشاف کی تعلیم کے وقت قرأت یہی کرتے تھے۔ شیخ شمس الدین اور دیگر رفقاء درس سامع ہوتے تھے۔

کشاف اور مفتاح العلوم سکا کی کے غوامض کی توضیح و تشریح میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی تقریر انتہائی دل نشیں اور موثر ہوتی تھی بڑے بڑے علماء و فضلاء آپ کی تقریر کے دلدادہ تھے۔ (۲)

تخصیص علوم سے فراغت کے بعد سلطان المشائخ کے حلقہ ارادت میں شامل

(۱) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۳۱۔

(۲) سیر الاولیاء ص ۲۵۔

ہو گئے تھے۔ اور شیخ کے اہم خلفاء میں شمار ہوتے تھے۔ سلطان المشائخ کی خصوصی مجلسوں میں تصوف کے اسرار و رموز پر بحکم شیخ آپ کی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ ہر جمعہ کو آپ کا عمومی وعظ ہوا کرتا تھا جس کی اثر انگیزی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور بعض تو بے ہوش تک ہو جاتے تھے۔ ابن بطوطہ اپنا چشم دید واقعہ لکھتا ہے کہ میں ایک مرتبہ ان کی مجلس وعظ میں حاضر تھا۔ قاری نے قرآن مجید کی آیت ”یا ایہا الناس اتقوا ربکم ان زلزلة الساعة شیء عظیم“ کی تلاوت کی۔ بعد میں مولانا نیلی نے اسی آیت کو پڑھا جسے سن کر مسجد کے گوشہ سے ایک شخص کی چیخ بلند ہوئی۔ مولانا نے پھر اسی آیت کی تلاوت کی اس شخص نے دوبارہ چیخ ماری اور اسی کے ساتھ جاں بحق ہو گیا۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ میں اس مرد حق آگاہ کی تجہیز و تکفین اور جنازے میں شریک رہا۔ (۱)

مولانا نیلی کے مزاج میں بے پناہ تواضع تھی۔ تصوف کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے اور سلطان المشائخ کے اہم ترین خلفاء میں شمار ہونے کے باوجود نہ صوفیانہ خرقہ زیب تن کیا اور نہ مدت العمر کسی کو مرید بنایا۔ کہتے تھے کہ اگر حضرت شیخ حیات سے ہوتے تو اس خلافت نامہ کو حضرت کی خدمت میں پیش کر کے مؤدبانہ عرض کرتا کہ حضرت نے اگرچہ ازراہ بندہ نوازی اس عاجز کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا ہے مگر بندہ اپنے اندر اس بار امانت کے اٹھانے کی طاقت نہیں پاتا۔ (۲)

آخر میں سلطان المشائخ کے ملفوظات ”نوائد الفواد مرتبہ حسن سجری“ کا ایک نسخہ دستِ خاص سے لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا اور اکثر اوقات اسی کے مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے پاس ہر علم و فن کی مستند و معتبر کتابیں موجود ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ صرف ”نوائد الفواد“ ہی کا مطالعہ کرتے ہیں؟ فرمایا سلوک اور دیگر فنون کی کتابوں سے دنیا بھری ہے لیکن سلطان المشائخ کے ملفوظات روح افزا جن سے مری

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۲۔

(۲) سیر الاولیاء ص ۲۷۔

نجات وابستہ ہے کہاں ملیں گے۔

مراسم تو بایں صبا کجا است کہ نیست کجا است زلف تو مشک خطا کجا است کہ نیست (۱)
بالآخر اپنے عہد کا یہ مرد کامل اور عالم بے بدل حیات مستعار کے دن پورے کر کے
۶۲ھ میں رہ گئے عالم جاودانی ہوا۔ (۲) اور سلطان المشائخ کے مقبرہ کے احاطہ میں
اپنے خواجہ تاش، رفیق درس اور ہم وطن شیخ شمس الدین بن یحییٰ اودھی کے جوار میں ابدی
نیند سو رہا ہے (۳)

”گم گشتہ حالات اجدوہیا“ اور ”شہر اولیاء“ کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ آپ کا
مزار اجدوہیا کے مشہور قبرستان ”خرمکہ“ میں ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس مقبرہ میں شیخ علاء
الدین حسینی، ان کے صاحبزادے شیخ ماہ رو اور ان کی اولاد امجاد کی قبریں ہیں۔ نام کی
یکسانیت سے یہ اشتباہ ہوا ہے۔

سر دست مولانا نیلی کی صرف ایک تصنیف ”مقیمیاں“ کا پتہ چل سکا ہے۔
مقیمیاں فارسی زبان کی مشہور ترجیع بند مثنوی ہے اور ایک عرصہ تک مدارس کے نصاب
درس میں شامل رہی ہے اور اب بھی بعض مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ آپ کے
حالات سیر الاولیاء، اخبار الاخبار، خزینۃ الاصفیاء، بحرذخارفی، نزہۃ الخواطر ج ۲، تاریخ
مشائخ چشت وغیرہ میں مذکور ہیں۔

(۱۳) شیخ شمس الدین اودھی

شیخ شمس الدین فریادرس بن نظام الدین اودھی مشہور مشائخ ہند میں ہیں علوم دینیہ
کی تحصیل مولانا رفیع الدین اودھی سے کی اور طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے۔
تعلیم سے فراغت کے بعد انہیں سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ بعد میں شیخ اشرف سمنانی

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۷۸۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۶۱۔

(۳) سیر الاولیاء ص ۲۷۸۔

کچھ چھوی کی جانب رجوع کیا اور انہیں سے خلافت پائی۔ آپ مخدوم سید اشرف
کچھ چھوی کے خلفائے کبار میں شمار ہوتے ہیں۔ لطائف اشرفی میں ہے کہ شیخ سمنانی
فرماتے تھے ”اشرف شمس و شمس اشرف است“ یعنی دونوں حقیقتاً ایک جان اور ظاہر اُردو
قالب ہیں۔ اس سے شیخ شمس الدین کے درجہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لطائف اشرفی
میں یہ تفصیل بھی مذکور ہے کہ جب مخدوم سمنانی پہلی مرتبہ کچھوچھو تشریف لائے تو اپنے
احباب و اصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ ”اجودھیہا سے دوست کی خوشبو آرہی ہے“ کچھ
عرصہ کے بعد آپ اجدوہیا کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر حسب عادت ایک مسجد
میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کی آمد کی خبر پرا کر شہر کے علماء و اکابر خدمت میں حاضر ہوئے،
ان حاضرین میں شمس الدین نامی ایک نوجوان بھی تھا جو علوم دینیہ کی تکمیل کر چکا تھا۔ اور
اب کسی شیخ کامل کی اسے ضرورت تھی مخدوم سمنانی نے اس نوجوان کو دیکھتے ہی فرمایا شمس
الدین میں تمہاری تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ (۱)

الحاصل انہیں بیعت کر کے اور ادو وظائف کی تلقین کی اور خلوت میں بیٹھنے کا حکم دیا
شیخ شمس الدین نے مرشد کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور شیخ
کی توجہ خاص کی بدولت سلوک کے مراحل بہت جلد طے کر لئے، تکمیل کے بعد شیخ نے اپنی
خلافت سے نوازا۔ اس عرصہ میں شیخ سمنانی اجدوہیا ہی میں مقیم رہے۔ شیخ شمس الدین کو
درجہ کمال تک پہنچانے کے بعد یہاں سے روانہ ہوئے اور سدھور، لکھنؤ، جاس ہوتے
ہوئے کچھوچھو واپس آ گئے۔

شیخ سمنانی کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد اجدوہیا کے منصب دار ”سیف اللہ خاں“
اپنے ندیموں کے ساتھ کچھوچھو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آپ کی بزرگی
وجہاً شان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی سفر میں آپ سے بیعت ہو گئے۔ کچھ دن
خانقاہ میں قیام کے بعد جب واپس جانے لگے تو شیخ سے درخواست کی کہ اہل اجدوہیا کی
اصلاح کے لئے آپ کی دعوت و ارشاد کا ایک مرکز خود اجدوہیا میں بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ

(۱) سیرت اشرف ص ۳۰۔

ان کے اصرار پر شیخ سمنانی نے ایک خانقاہ اجدوہیا میں بھی قائم کی اور اپنے محبوب و مراد خلیفہ شیخ شمس الدین کو اپنا جانشین بنا کر اہل اجدوہیا کی اصلاح و تربیت کی خدمت ان کے سپرد کی۔ شیخ شمس الدین اسی خانقاہ میں بیٹھ کر زندگی بھر تہذیب اخلاق، و تزکیہ نفوس کی اہم ترین خدمت انجام دیتے رہے۔ (۱)

قلب کی طہارت اور روح کی پاکیزگی نے شیخ شمس کی دعاؤں میں ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی کہ جس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کے آگے دستِ دعا دراز کرتے خدائے قاضی الحاجات اسے پورا کر دیا کرتا تھا اپنی اسی خصوصیت کی بناء پر عوام و خواص میں ”فریادرس“ کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ صاحبِ محرز خارشخ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

”شیخ شمس الدین فریادرس کے لقب سے مشہور ہوئے ان کا مزار اجدوہیا میں مرجع خلائق ہے۔“

حسب تحقیق مولوی عبدالکریم اودھی چمنستان اجدوہیا کا یہ گل تازہ اپنے شیخ مرشد کی حیات ہی میں ۷ محرم ۹۰ھ یوم جمعہ کو اس جہان خزاں آباد کو الوداع کہہ کر راہی باغ رضوان ہوا۔ (۲)

لیکن مولانا عبدالحمی حسنی کے اس جملہ ”تصدّر للارشاد بعده“ یعنی مخدوم سمنانی کے بعد مسند ارشاد کے صدر نشین ہوئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مخدوم سمنانی کے بعد نہ صرف حیات رہے بلکہ ان کی اصلاحی سرگرمیاں حضرت مخدوم کی وفات کے بعد ہی بام عروج پر پہنچیں۔ واللہ اعلم۔

آپ کا مزار محلہ بکسر ٹولہ اجدوہیا میں ایٹواتالاب (موجودہ ستیہ ساگر) کے گوشہ شمال مغرب بلندی پر واقع ہے۔ اب سے پچاس سال پہلے مزار کے چاروں سمت پختہ چہار دیواری تھی مگر امتداد زمانہ اور شکست و ریخت کی مرمت نہ ہونے کی وجہ سے مغربی دیوارز میں بوس ہو گئی ہے اور بقیہ تین جانب کی دیواریں بھی نہایت خستہ و بوسیدہ ہو گئی ہیں اگر انہیں اسی حال میں چھوڑ دیا گیا تو وہ بھی چند سالوں میں بے نام و نشان ہو جائیں گی۔

(۱) سیرت اشرف ص ۳۲۔ (۲) گم گشتہ حالات اجدوہیا ص ۲۰۔

گم شدہ حالات اجدوہیا کے مصنف کا بیان ہے کہ مقبرہ کی مرمت اور اس کے دیگر مصارف کے واسطے سلاطینِ دہلی نے ستر بیگہ آراضی بطور معافی دی تھی مگر جن صاحب کے نام سند معافی تھی ان کی ناخلف اولاد نے نہ صرف مقبرہ کی اس معافی کو اپنی ذاتی جاگیر بنا لیا بلکہ مزار کے احاطہ میں مولسری وغیرہ کے جو پودے درخت تھے انہیں بھی پیراگیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا اور قیمت ذاتی مصارف میں خرچ کر ڈالی انہیں لوگوں کے استحصال سے آج مقبرہ بالکل ویران ہے۔ (۱)

بہ تربت ماتمی ہے ان مجازی شہسواروں کی مسلمانوں نے مٹی بیچ لی جنکے مزاروں کی شیخ شمس الدین نے اپنے پیچھے مرید و مسترشدین کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ تین صاحبزادے چھوڑے۔ شیخ بدیع الدین جن کی نسل سے موضع کولاضلع فیض آباد کے شیوخ ہیں۔ دوسرے شیخ جہانگیر ان کے صاحبزادے شیخ علاء الدین تھے، جن کے نام پر موضع علاء الدین پور ضلع فیض آباد آباد ہوا۔ یہیں شیخ علاء الدین کی اولاد بھی ہے اور مزار بھی۔ تیسرے صاحبزادے شیخ احمد تھے جن کے متعلق کچھ صحیح تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

(۱۴) شیخ فتح اللہ اودھی

شیخ فتح اللہ بن نظام الدین اپنے عہد کے زبردست عالم اور بلند پایہ شیخ تھے۔ نحو، فقہ، اصول فقہ میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ان کا آبائی وطن بدایوں تھا۔ تحصیل علم کی غرض سے دہلی گئے اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی سرپرستی میں اساتذہ دہلی سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مسند درس و افادہ کوزینت بخشی اور طویل عرصہ تک جامع مسجد دہلی متصل مینارہ شمسی (قطب مینار) میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، بعد ازاں حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ خاص شیخ صدر الدین احمد حکیم دلہا متوفی ۵۹ھ سے بیعت ہو کر مجاہدہ و ریاضت میں لگ گئے ساتھ ہی تدریسی مشغلہ بھی جاری رہا۔ لیکن مجاہدہ بسیار و ریاضت شاقہ کے باوجود دل کی گرہیں نہ کھلیں اور سوزدروں

(۱) گم گشتہ حالات اجدوہیا ص ۱۹۔

کی جو کیفیت حاصل ہونی چاہئے تھی وہ میسر نہ ہوئی۔ تو شیخ سے عرض حال کی پیر و مرشد حکیم دلہانے فرمایا تدریسی سلسلہ بند کر دیں اور کتابوں کو اپنے پاس سے علاحدہ کر دیں۔ چنانچہ پیر روشن ضمیر کی تجویز کے مطابق درس کو موقوف کر دیا اور چند اہم و پسندیدہ کتابوں کے علاوہ پورا اپنا کتب خانہ دوسروں کے حوالہ کر دیا پھر بھی قلب معرفت کی چاشنی سے نا آشنا ہی رہا۔ شیخ سے دوبارہ رجوع کیا۔ انھوں نے فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال سے بالکل انقطاع نہیں ہوا ہے۔ ”العلم حجاب الاکبر“ جب تک یہ پردہ درمیان میں حائل ہے معرفت کی روشنی قلب تک نہیں پہنچ سکتی۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شیخ فتح اللہ ان عمدہ کتابوں کو جنھیں حرز جان بنائے ہوئے تھے ان کے ایک ایک جز کو الگ کر کے پانی کے کنارے بیٹھے انہیں دھل رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ ”اور ادیدند کہ بر لب آبے نشست اجزای شست و آب از چشم اومی رفت“ بالآخر لوح دل ماسوی اللہ کے نقش سے بالکل صاف ہو گئی، نور معرفت سے سینہ جگمگا اٹھا اور حضرت حکیم دلہانے خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا۔

مقام ارشاد پر فائز ہونے کے بعد حضرت چراغ دہلی اور اپنے پیر و مرشد کے منشاء سے اجودھیا تشریف لائے اور حضرت چراغ دہلی کے آبائی مکان میں فروکش ہوئے جسے حضرت چراغ دہلی نے انکی تحویل میں دے دیا تھا۔ شیخ فتح اللہ زندگی کے آخری لمحے تک اسی میں رہے جو رہائش کا بھی کام دیتا تھا اور بندگان خدا کی اصلاح و تربیت کیلئے خانقاہ کا بھی۔

شیخ فتح اللہ کا ہندوستان کے مشائخ کبار میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے فیض تربیت سے ہزاروں گم کردہ راہ صراط مستقیم سے آشنا ہوئے۔ شیخ محمد عیسیٰ تاج جو پوری، شیخ سعد الدین اودھی، شیخ قاسم اودھی، شیخ درویش اودھی جیسے بلند مرتبہ مشائخ چشت ان کے دامن تربیت سے وابستہ اور مرید و خلیفہ تھے۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں ”از کاملین وقت گشت رو ہزار ہا طالبان حق را بحق رسایند چنانچہ شیخ قاسم دہلوی (اودھی) از خلفائے وے است و نیز شیخ محمد عیسیٰ تاج جو پوری مرید و خلیفہ ابو بود“ (۱) مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی متونی

(۱) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۸۰ ج ۱۔

۸۳۷ھ بھی شیخ اودھی کی خدمت میں بغرض بیعت اجودھیا حاضر ہوئے تھے۔ لیکن شیخ ردولوی مشرب عشق و محبت کے دلدادہ تھے اور شیخ فتح کی روش زہد و فقر اور تسلیم و رضا کی تھی اس لئے مناسبت پیدا نہ ہو سکی (۱) اسی موقع پر شیخ ردولوی نے اجودھیا میں کئی ماہ کا قیام کر کے چلہ کشی کی تھی۔

شیخ فتح اللہ جب دہلی سے رخصت ہو کر اجودھیا کے لئے عازم سفر ہوئے تو ان کے شیخ حضرت طبیب دلہانے اپنے دو صاحبزادوں شیخ یحییٰ اور شیخ نور کو بغرض تعلیم و تربیت ان کے حوالہ کر دیا تھا۔ شیخ اودھی نے دونوں مخدوم زادوں کو علوم ظاہر و باطن سے آراستہ کر کے بغرض دعوت و تبلیغ اجودھیا سے جانب مشرق تقریباً ۳۰-۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر بھیج دیا جہاں پہنچ کر ان دونوں حضرات نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ مقام آج کل ”اونچا گاؤں“ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی میں دونوں حضرات کے مزارات ہیں اور ان کی اولاد اب بھی یہاں موجود ہے۔ مولانا عزیز احمد قاسمی بی، اے استاذ دارالعلوم دیوبند اسی اونچا گاؤں کے رہنے والے اور شیخ یحییٰ کی نسل سے تھے مولانا موصوف کا شجرہ نسب شیخ صدر الدین حکیم دلہا تک یہ ہے۔

مولانا عزیز احمد، بن محمد فاروق، بن الہی بخش، بن محمد اشرف، بن راحت علی، بن عباد اللہ، بن خدا بخش، بن محمد ہادی، بن محمد زاہد، بن اللہ دیا، بن ابو بکر، بن عبد الملک، بن مخدوم یحییٰ، بن شیخ صدر الدین حکیم دلہا۔ (۲)

۲۶ ربیع الاول ۸۲۱ھ کو شیخ فتح اللہ کا وصال ہوا، مزار اجودھیا میں ہے۔ (۳)

مکاتیب شیخ فتح اللہ کے نام سے آپ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ کسی مرید نے جمع کیا تھا جو شائع بھی ہوا تھا مگر اس وقت نایاب ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بعض مکاتیب کے اجزا اخبار الاخیار میں نقل کئے ہیں۔

(۱) اخبار الاخیار ص ۱۹۴-۱۹۵۔

(۲) از خاندانی شجرہ مولانا عزیز احمد قاسمی۔

(۳) زہدۃ النوا طرج ص ۱۳/۱۲۔

شیخ اودھی کا مقبرہ محلہ چراغ دہلی (موجودہ عالم گنج کٹر) اجمودھیہ میں خود انہی کی خانقاہ کے احاطہ میں ہے۔ مزار آج بھی موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے، مزار اور خانقاہ کی مرمت حسب تصریح صاحب گم گشتہ حالات اجمودھیہ اب تک تین بار ہو چکی ہے، سب سے پہلے واجد علی ناظم اودھ نے اس کی شکست و ریخت کو درست کرایا۔ کچھ دنوں کے بعد خانقاہ کا ایک حصہ گر گیا تو شیخ رمضان علی تاجر فیض آباد نے اس کی مرمت کرائی اور گرے ہوئے حصہ کو از سر نو تعمیر کرایا پھر تیسری بار ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء میں خواجہ برکات اللہ اعظم گڈھی نے مرمت کرائی اور خانقاہ مزار کے ارد گرد چہار دیواری قائم کر دی۔ اور خانقاہ کی مسجد کی مرمت ڈیڑھ صدی قبل سید محمد بخش کرنالی رسالہ دار نے کرائی تھی اس کے ایک عرصہ کے بعد رسالہ دار موصوف کے برادر زادہ سید جعفر کرنالی نے دوبارہ اس کی اصلاح و مرمت کرائی۔

خانقاہ کے احاطہ کی مشرقی دیوار کے متصل آپ کے خلیفہ خاص شیخ قاسم اودھی کا مدفن ہے، شیخ قاسم بن برہان الدین دہلوی اودھی عالم و فقیہ اور ولی کامل تھے۔ سلوک کی تحصیل پہلے اپنے والد شیخ برہان الدین سے کی پھر شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اور انہیں کی رہنمائی میں طریقت کی راہیں طے کر کے درجہ ارشاد و تلقین کو پہنچے۔ (۱)

(۱۵) شیخ سعد اللہ اودھی

شیخ سعد اللہ اودھی کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ممکن ہے مرآة الاسرار یا بحر زخار میں ان کا تذکرہ اور تفصیلی حالات ہوں۔ مگر اس وقت یہ کتابیں پیش نظر نہیں ہیں۔ مولانا عبدالحی حسنی نے شیخ محمد بن قاسم (المعروف بہ شیخ درویش) کے تذکرہ میں ضمناً گلزار ابرار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ شیخ فتح اللہ اودھی کے خلیفہ تھے (۲) تذکرۃ العابدین کے مصنف لکھتے ہیں کہ ”آپ خلیفہ شیخ فتح اللہ اودھی کے ہیں۔ آپ بہت بڑے مشائخ طریقت تھے

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۹۔

(۲) نزہۃ ج ۳ ص ۱۴۵/۱۴۶۔

مگر اپنا حال ہمیشہ پوشیدہ رکھا۔ کسی پر یہ ظاہر نہ ہوا کہ آپ کا کیا حال اور طریق ہے۔ وفات آپ کی ۱۷۱۰ھ میں ہوئی اور مزار اودھ میں ہے۔ بلفظہ (۱)

(۱۶) شیخ جمال گوجری

شیخ جمال الدین گوجری اودھی عظیم المرتبت، صاحب نسبت اور بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ تھے۔ پانچ واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب شیخ نجم الدین کبریٰ سے مربوط ہو جاتا ہے۔ اپنے زہد و ورع، مجاہدہ و ریاضت اور کریم النفس و شفقت علی الخلق کی بناء پر شیخ الاولیاء کے لقب سے مشہور تھے (۲) شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ فرماتے ہیں ”از بھکرتا پنڈوہ مسافرت کردم باہج مسلمانے ملاقات نہ شد الا در اودھ یک بچہ دیدم و اشارت بشیخ جمال گوجر کرد“ (۳) بھکرتا پنڈوہ تک سفر کیا مگر کسی (کامل) مسلمان سے ملاقات نہیں ہوئی البتہ اودھ میں ایک شخص جمال گوجر کو دیکھا۔

شیخ جمال سلسلہ فردوسیہ کے مشہور و بلند پایہ بزرگ شیخ مظفر بلخی متوفی ۸۰۳ھ کے مرید و خلیفہ تھے اور انہیں کے حسب منشاء اجمودھیہ میں سکونت پذیر تھے حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں شیخ احمد عبدالحق ردولوی بھی اجمودھیہ میں اقامت گزیرے تھے۔ ان بزرگوں کے اجتماع سے اجمودھیہ دارالاولیاء بن گیا تھا۔ مفتی غلام مسرور لاہوری لکھتے ہیں کہ شیخ جمال گوجر شیخ ردولوی کی مجلس کے حاضر باش اور ان کے دام محبت میں گرفتار تھے۔ محدث دہلوی بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں شیخ احمد ردولوی اجمودھیہ میں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ ایک کتیا بھی تھی۔ اس نے جب بچہ جنا تو شیخ نے اس کی تقریب میں تمام اعیان و اکابر اور امراء شہر کی دعوت کی لیکن شیخ جمال گوجر کو مدعو نہیں کیا۔ انہیں شیخ کی اس بے اعتنائی پر حیرت ہوئی۔ چنانچہ دوسرے دن ان سے شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ کل کی دعوت میں آنجناب بندہ

(۱) تذکرۃ العابدین ص ۱۰۲۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۲۱۔

(۳) اخبار الاخیار۔

کو بھول گئے۔ شیخ ردولوی نے یہ سن کر فرمایا: جمال الدین میزبانی سگ بود، سگاں را طلبیدیم کہ ”الدنیاحیفة و طالبہا کلاب“ تو از جملہ آدمیانی تراچوں طلبم“ (۱) جمال الدین یہ تو کتے کی میزبانی تھی اس لئے کتوں کو دعوت دی گئی کیونکہ (حسب ارشاد نبی پاک) دنیا مُردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں تم تو ایک آدمی ہو اس میں تمہیں کیسے مدعو کر سکتا تھا۔ شفقت علی الحق کے جذبہ سے شیخ جمال بسا اوقات کھچڑی کی دیگ تیار کر کے خود اپنے سر پر لئے اجودھیا کے گلی کوپے میں گھومتے پھرتے جہاں کہیں کوئی بھوکا مل جاتا اسے وہ کھچڑی دیدیتے۔ ایک دن حسب عادت شیخ جمال کھچڑی کی ایک دیگ سر پر لئے کسی اور طرف جانے کے بجائے اتفاقاً سید سلطان موسیٰ عاشقان کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ اور دیگ شیخ عاشقان کے آگے رکھ دی، اس وقت ان کے یہاں تین دن سے فاقہ چل رہا تھا۔ شیخ جمال کی بروقت اس پیش کش پر سید عاشقان بجمد ممنوع ہوئے اور جزاک اللہ کہتے ہوئے فرمایا ”جمال تو دیگ طعام (برنگ گوجراں کہ سببے شیر بر سر گرفتہ می فروشد) گرفتہ می گردی لیکن بہ بہائے عشق می فروشی“ اے جمال تم گوجروں کی طرح (جو دودھ کی ٹھلیا سر پر رکھے بیچتے پھرتے ہیں) کھانے کی دیگ سر پر لئے گھومتے ہو لیکن (بیچ تو یہ ہے کہ اسے) عشق و محبت کی قیمت کے عوض فروخت کرتے ہو۔ کہتے ہیں کہ اسی دن سے شیخ جمال گوجر کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ اور پھر اسے اتنی شہرت ہوئی کہ نام کا جزو بن گیا۔ آپ کی فوات ۸۵۸ھ میں ہوئی (۲)

مزار محلہ بکسر یا ٹولہ اجودھیا میں ایک احاطہ کے اندر تھا مگر عرصہ ہوا احاطہ کی دیواریں گر کر بے نشان ہو گئی ہیں۔ البتہ کچھ شکستہ قبریں اب بھی موجود ہیں جن میں سے ایک کے بارے میں اجودھیا کے لوگ کہتے ہیں کہ یہی شیخ جمال اولیاء کا مدفن ہے۔ (۳) واللہ اعلم۔ صاحب گم گشتہ حالات اجودھیا و مرتب شہر اولیاء دونوں نے مزار جمال اولیاء

(۱) اخبار الاخیار ص ۱۹۶۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۲۱۔

(۳) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۲۲ و شہر اولیاء ص ۲۱۵۔

کے عنوان سے اوپر کی تفصیلات تحریر کی ہیں لیکن یہی دونوں حضرات دوبارہ اپنی کتابوں میں مزار جمال گوجری کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں ”شاہ مظفر کی مسجد سے دکن جانب حضرت شاہ جمال گوجری کا مزار ہے۔ گم گشتہ ص ۳۹ و شہر اولیاء ص ۲۵۲ جبکہ جمال اولیاء اور جمال گوجری دونوں ایک ہی بزرگ ہیں جیسا کہ خود صاحب گم گشتہ کی بیان کردہ تفصیلات سے بھی ظاہر ہے۔ ان دونوں حضرات کی یہ تحریریں دیکھ کر بے ساختہ نوک قلم پر غالب کا یہ مصرعہ آگیا ”یا الہی یہ ماجرا کیا ہے“

صاحب گم گشتہ نے شیخ جمال کے چار خلفاء کا نام ذکر کیا ہے۔ مولانا کمال الدین جو شیخ جمال کے برادر خرد تھے۔ ان کا مزار شیخ جمال کے مزار کے متصل ہے۔ شاہ جانی، شاہ درویش۔ ان دونوں بزرگوں کا مرقد اترو لہ ضلع گونڈہ میں ہے۔ اور چوتھے مولانا عبدالکریم اودھی جن کا مقبرہ محلہ قضاہ اجودھیا میں ہے، مزار کے گرد پختہ چہار دیواری تھی، مگر عرصہ ہوا اسی محلہ کے ایک عاقبت فراموش نے (اس دعویٰ سے کہ میرے دادا نے ان دیواروں کو تعمیر کیا تھا) انھیں توڑ کر ساری اینٹیں فروخت کر دیں۔ (۱)

”بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کا مدفن تم ہو“

(۱۷) شیخ سید سلطان موسیٰ عاشقان

سید سلطان موسیٰ عاشقان، شیخ حاجی صدر الدین چراغ ہند متوفی ۷۹۵ھ کے مرید و خلیفہ تھے۔ انھیں کے ہمراہ ملتان سے ظفر آباد (جون پور) آئے، اور پھر وہاں سے شیخ کے حکم سے اجودھیا میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، اجودھیا میں جس جگہ آپ کی رہائش تھی وہ محلہ سید واڑہ کے نام سے مشہور ہے۔ افسوس کہ سید عاشقان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ صاحب تاریخ شیراز ہند نے بحوالہ مرآة الاسرار جو کچھ لکھا ہے انھیں کے الفاظ میں وہ تفصیلات ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

”آپ درویش اہل دل اور تنہائی پسند تھے حضرت مخدوم چراغ ہند سے بیعت تھی۔“

(۱) گم گشتہ ص ۱۲۔

اور آپ ہی کے ہمراہ بسلسلہ جہاد (دعوت و تبلیغ) ظفر آباد تشریف لائے تھے۔ ریاضت و مجاہدات میں محنت شاقہ برداشت فرمائی تھی۔ جب آپ کو مقام قطبیت حاصل ہو گیا تو بحکم پیر و مرشد ولایت ملک اودھ آپ کو عطا کی گئی۔ آپ نے وہیں قیام فرمایا۔ لباس میں محض ستر عورت کا اہتمام کرتے زیادہ تر ننگے سر رہتے تھے۔ کبھی کبھی جذب اور وجد کی کیفیت طاری رہتی۔ ہجوم کو ناپسند کرتے اور تنہائی سے وحشت ہوتی، صد ہا فقراء و مساکین آپ کی خانقاہ میں رہتے تھے لنگر خانہ جاری تھا۔ (۱)

گم گشتہ حالات اجدودھیا میں تاریخ وفات ۸ صفر لکھی ہے مگر سن ندارد ہے۔ پہلے عرس بھی ہوتا تھا۔ سید عاشقان کے تین صاحبزادے تھے۔ ایک صاحبزادہ کی اولاد قبضہ سیدن پور ردولی میں اب بھی موجود ہے۔ دوسرے صاحبزادہ نے موضع ملہار پور کلاں ضلع جون پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی اولاد بھی اب تک اس موضع میں مقیم ہے۔ بڑے صاحبزادے جو والد بزرگوار کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے اجدودھیا ہی میں مقیم رہے۔ ان کے سلسلہ نسب سے ایک بزرگ سید سلطان علی عرف سید سلطان بخش تھے جو نہایت متوکل اور صبر و رضا کے مالک تھے۔ اکثر خانہ نشین رہتے تھے۔ اگر کبھی گھر سے باہر نکلتے تو اولیائے کرام کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے ضرور جاتے۔ ۵۷ سال کی عمر میں ۱۲۶۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور اپنے آباء و اجداد کے مقبرہ میں دفن ہوئے (۲)

شہر اولیاء میں شیخ عاشقان کے مزار کی نشاندہی اور اس کی موجودہ کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

”گوکل پھول مندر کے پاس سے ایک کچا راستہ دکھن سمت گیا ہے جو آگے جا کر فیض آباد اجدودھیا روڈ کے سامنے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے راستے پر دکھن جانب تقریباً سو سو سو میٹر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ ایک قطعہ اراضی نظر آئے گی جس میں خود رو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ اسی قطعہ اراضی میں عام راستہ سے ۲۵، ۲۰ قدم ہٹ کر قدرے اونچے

(۱) تاریخ شیرازہ ہندس ۱۹۹۱ از سید اقبال جونپوری طبع قدیم۔

(۲) گم گشتہ ص ۵۰۔

ایک چبوترے پر چند دوسری قبروں کے ساتھ سید سلطان موسیٰ عاشقان صاحب کا مزار ہے۔ مزار کے پاس کافی گندگی ہے اور کوڑا کباڑ کا انبار ہے۔ (۱)

فاعتبروا یا اولی الابصار

(۱۸) قاضی شہاب الدین اودھی

قاضی شہاب الدین مداری اودھی المقلب بہ پرکالہ آتش، قاضی قدوة الدین اسرائیلی کی اولاد میں تھے۔ علوم دینیہ بالخصوص فقہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے اور اودھ کے قاضی تھے۔ ہندوستان کے مشہور صوفی شیخ بدیع الدین مدار متوفی ۸۴۰ھ جس وقت کالپی سے جو پنپور جارہے تھے اسی سفر میں قاضی شہاب الدین ان کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اور پہلی ہی ملاقات میں شیخ مدار سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بیعت ہو کر ان کے حلقہ خدام میں شامل ہو گئے۔ (۲)

پھر پیر و مرشد کی محبت کا ایسا غلبہ ہوا کہ علمی مشغلہ ترک ہو گیا، تمام کتابوں کو دریا برد کر دیا اور منصب قضا سے بھی دست بردار ہو گئے۔ شیخ مدار کی خدمت یا ذکر و مراقبہ بس یہی زندگی کا مشغلہ رہ گیا۔ (۳) شیخ مدار سے اس درجہ تعلق ہو گیا تھا کہ سفر و حضر کسی وقت بھی ان کی صحبت سے جدائی گوارا نہیں تھی۔ شیخ مدار کو بھی ان سے انس خاص تھا اور زیادہ تر خدمت انھیں سے لیتے تھے۔ چنانچہ شیخ مینا لکھنوی متوفی ۸۷۰ھ کو شاہ مدار نے اپنا مصلیٰ قاضی شہاب الدین پر کالہ آتش ہی کے ذریعہ سے بھیجا تھا (۴)

الحاصل پیر و مرشد کی توجہ خاص سے درجہ تکمیل کو پہنچ کر خلافت سے مشرف ہوئے۔ شیخ مدار کے کل ستر (۷۰) خلفاء تھے جن میں قاضی سید اجمل بہراچی، مولانا حسام الدین ملا متی جون پوری، مولانا محمد جہندہ بدایونی، قاضی محمود کشوری، اور شیخ

(۱) شہر اولیاء ص ۲۶۵ ڈاکٹر دیر فیض آبادی۔

(۲) انتصاح عن ذکر اہل الصلاح ص ۹۶۔

(۳) نزہۃ النوح اطرح ص ۸۷۔

(۴) انتصاح عن ذکر اہل الصلاح ص ۹۶۔

شہاب الدین پر کالہ آتش اجل خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔ (۱)

پر کالہ آتش لقب سے متعلق مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں ”لقبہ الناس لذکاوتہ پر کالہ آتش“ ان کے ذہن ثاقب کی بناء پر لوگوں نے انھیں پر کالہ آتش کا لقب دیدیا تھا۔ (۲) بعض لوگوں نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ”حرارت شوق الہی چنانا غالب می بود کہ از آتش انفس خود مرغ می پخت و از کثرت جلال خلق اورا پر کالہ آتش می گفت“ عشق الہی کی حرارت اس قدر تیز تھی کہ سانس کی گرمی سے چڑیا پک جاتی تھی۔ اور کثرت جلال کی وجہ سے لوگ انھیں پر کالہ آتش کہتے تھے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

سن وفات معلوم نہ ہو سکا ان کے شیخ و مرشد مخدوم مدار کی وفات ۸۴۰ھ میں ہوئی ہے، اس لئے اندازہ ہے کہ خود ان کی وفات نویں صدی ہجری کے آخر میں ہوئی ہوگی۔ مقبرہ موضع جملائی میں ہے جسے اب بڑا گاؤں کہتے ہیں، جو اجدوہیا سے ۲۵،۲۰ کلومیٹر بر جانب مغرب واقع ہے اور معمولی درجے کا ریلوے اسٹیشن ہے جس پر صرف پسنجر گاڑیاں رکتی ہیں۔

شیخ بدیع الدین مدار کے اجدوہیا میں ایک خلیفہ اور بھی تھے جو شیخ جو دھن مدار کی اودھی کے نام سے مشہور تھے۔ صاحب انتصاح نے شیخ مدار کے خلفاء کی فہرست میں لکھا ہے ”حضرت شاہ جو دھن کہ در شہر اودھ مسکن گرفتہ“ اور شاہ جو دھن جو شہر اجدوہیا میں مدفون ہیں۔ لیکن ان کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے اور نہ مقبرہ کی نشاندہی ہو سکی کہ کس محلے میں تھا۔ اجدوہیا میں شاہ مدار نام سے ایک محلہ ہے، ممکن ہے ان کا قیام اسی جگہ رہا ہو جس کی مناسبت سے یہ نام پڑ گیا ہو۔

(۱۹) شیخ محمد درویش اودھی

آپ کا نام نامی محمد اور لقب درویش ہے والد ماجد کا اسم گرامی قاسم بن برہان

(۱) تذکرۃ المصنفین ج ۲ ص ۲۵ مع زیادہ۔

(۲) نزہتہ ج ۳ ص ۸۷۔

الدین اودھی ہے۔ صاحب نزہتہ نے آپ کے تذکرہ کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے ”الشیخ الصالح الفقیہ محمد بن قاسم بن برہان الدین اودھی احد المشائخ المشہورین“ شیخ، صالح، فقیہ محمد بن قاسم بن برہان الدین اودھی مشہور مشائخ میں سے تھے۔ تذکرۃ الرشید ص ۸۶ میں شیخ درویش بن محمد قاسم درج ہے جو صحیح نہیں ہے۔ احد المشائخ المشہورین میں ہونے کے باوجود آپ کا تفصیلی تذکرہ دستیاب نہیں ہے، خود نزہتہ میں صرف چار پانچ سطریں آپ کے بارے میں ہیں۔ اسی طرح شیخ یسین بناری متوفی ۱۰۷۶ھ نے مناقب العارفین میں شیخ محمد بن عیسیٰ بن تاج الدین جو نپوری متوفی ۸۷۰ھ کے خلفاء کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ درویش کا ذکر کیا ہے مگر درج ذیل چند جملوں کے اور کچھ نہیں لکھا ہے۔ ”وازمجملہ خلفاء حضرت مخدوم درویش قاسم اودھی است بسیار بزرگ بود شیخ عبدالقدوس گنگوہی رازا ایشاں جامہ خلافت رسید (۱) اور منجمہ خلفاء کے حضرت مخدوم درویش بن قاسم اودھی ہیں۔ بہت بڑے بزرگ تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو ان سے جامہ خلافت ملا ہے۔

تذکرۃ العابدین میں یہ چند سطریں ہیں ”آپ خلیفہ شیخ سعد اللہ کے اور پیر حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے ہیں۔ آپ بہت بڑے عالم بہ علوم ظاہری و باطنی و مقبول و عاشق خدا تھے۔ آپ نے اپنی تمام عمر ریاضت و مجاہدہ میں صرف کی اور جا بجا مشائخ کی خدمت میں گئے اور کئی طریق سے سلسلہ طریقت حاصل کیا اور مخلوق خدا کو فیض یاب کیا (۲)

صاحب تذکرۃ العابدین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ درویش کو اپنے عہد کے بہت سے مشائخ سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ راقم الحروف کو تلاش و جستجو کے بعد چھ ایسے مشائخ کا علم ہوا جن سے آپ نے اخذ فیض کیا اور خلافت پائی۔ تفصیل اس طرح ہے۔ (۱) اپنے والد محترم شیخ قاسم اودھی (۲) شیخ سعد الدین اودھی (۳) شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جو نپوری، یہ تینوں بزرگ شیخ فتح اللہ اودھی کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان تینوں مشائخ سے

(۱) مناقب العارفین قلمی ص ۱۵۔

(۲) تذکرۃ العابدین ص ۱۰۳۔

واسطہ کے بغیر براہ راست (۴) شیخ فتح اللہ سے بھی آپ کو خلافت حاصل تھی چنانچہ مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں ”قال المندوی فی گلزار ابرار انه اخذ الطريقة الجشتیة عن والده وعن الشيخ سعد الدین اودھی كلاهما عن الشيخ فتح اللہ. واخذ عن الشيخ فتح اللہ بلا واسطه (۱)“

صاحب گلزار ابرار کا بیان ہے کہ شیخ درویش نے طریقہ چشتیہ اپنے والد اور شیخ سعد الدین اودھی خلیفہ شیخ فتح اللہ سے حاصل کیا۔ اور خود شیخ فتح اللہ سے بغیر واسطہ کے بھی اخذ فیض کیا۔ (۵) شیخ میاں بن حکیم اودھی خلیفہ سید صدر الدین اودھی سلسلہ چشتیہ کے ان پانچوں مشائخ کے علاوہ سلسلہ مدار یہ سہروردیہ میں (۶) شیخ بدھن بہراچی خلیفہ شیخ اجمل بہراچی سے بھی خلافت یافتہ تھے۔ اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۴ھ ان تمام سلسلوں میں شیخ درویش کے مجاز و خلیفہ تھے۔ مناقب العارفین میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی شیخ درویش کی خدمت میں حاضری اور پھر شیخ سے ان کی گرویدگی کا بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

پہلے پہل جب مولانا عبدالقدوس شیخ کی خدمت میں باریاب ہوئے تو گدڑی پوش تھے۔ شیخ نے انھیں اس لباس میں دیکھ کر پوچھا کہ آپ کو اس لباس میں دیکھ کر اگر کوئی یہ کہے کہ یہ درویش جارہا ہے، تو یہ بات آپ کے کانوں تک پہنچے گی یا نہیں؟ مولانا نے جواب دیا ہاں پہنچے گی۔ شیخ نے فرمایا کانوں سے گزر کر دل تک جائے گی؟ مولانا نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ شیخ نے پھر سوال کیا کہ دل اس بات کی طرف متوجہ ہوگا یا نہیں؟ مولانا نے عرض کیا ہاں متوجہ ہوگا۔ شیخ درویش نے یہ سن کر فرمایا ”چراوشے اختیار باید کرد کہ مشغولی از دست برود“ ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا جائے جس کی وجہ سے خدا کی یاد سے دل غافل ہو جائے۔

شیخ کی اس لطیف تشبیہ سے مولانا عبدالقدوس گنگوہی اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھیں کی صحبت میں رہ پڑے تا آنکہ شیخ درویش نے انھیں جامعہ خلافت اور فن تصوف میں اپنی

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۵/۱۴۶۔

تصنیف ”آداب السالکین“ دے کر رخصت کیا۔ (۱)

شیخ درویش کی تصنیف آداب السالکین کا ذکر مولانا عبدالحی حسنی نے بھی کیا ہے لکھتے ہیں ”لہ کتاب آداب السالکین کتاب مفید فی السلوک“ شیخ درویش کی فن سلوک میں آداب السالکین مفید کتاب ہے۔ شیخ فتح اللہ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”اخذ عنہ محمد بن قاسم اودھی صاحب آداب السالکین“۔ ان سے اخذ سلسلہ کیا محمد بن قاسم آداب السالکین کے مصنف نے (۲)

علاوہ ازیں اپنی مشہور تصنیف ”الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند“ میں بھی آداب السالکین کو شیخ محمد درویش کی تصنیف بتایا ہے۔ (۳)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی شیخ فتح اللہ اودھی کے تذکرہ میں ضمناً آداب السالکین کا ذکر کیا ہے اور نصف صفحہ سے زائد اس کا اقتباس بھی دیا ہے، لیکن کتاب کی نسبت شیخ درویش کے بجائے ان کے والد شیخ قاسم کی طرف کی ہے لکھتے ہیں ”شیخ قاسم اودھی از میدان اوست رسالہ دارد مسٹی بہ آداب السالکین“ (۴) شیخ قاسم اودھی دہلوی ان (شیخ فتح اللہ) کے مریدوں میں سے ہیں جن کا آداب السالکین نامی ایک رسالہ ہے۔

یوم پنجشنبہ ۱۶ محرم ۸۹۶ھ کو شیخ درویش کا وصال ہوا۔ محلہ چراغ دہلی اجودھیا (عالم گنج کٹر) میں شیخ فتح اللہ کے حظیرہ میں مشرقی دیوار کے متصل اپنے والد بزرگوار کے پائیں آسودہ خواب ہیں۔ (۵)

منشی محبت اللہ فرید آبادی سپرنٹنڈنٹ نے مولانا محمد علی خلیفہ مولانا سید امیر علی شہید کے حکم سے شیخ قاسم شیخ محمد درویش کے مزاروں کی مرمت اب سے تقریباً ۸۰/۷ برس پہلے کرا دی تھی اس لئے دونوں قبریں ابھی درست حال میں ہیں۔ (۶) مگر یہ آج سے

(۱) مناقب العارفین ص ۱۱۵۔

(۲) نزہتہ ج ۳ ص ۱۴۶، ایضاً ج ۳ ص ۱۴۔

(۳) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند اردو ترجمہ ص ۲۷۳۔

(۴) اخبار الاخیار ص ۱۷۴۔

(۵) نزہتہ ج ۳ ص ۳۵۔ (۶) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۳۵۔

پچاس سال پہلے کی اطلاع ہے۔ اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ نشانات محفوظ ہیں یا نہیں؟

(۲۰) شیخ علاء الدین حسینی اودھی

مولانا سید علاء الدین اودھی سید شریف احمد ماہر و بغدادی کی اولاد سے اور حسینی سید تھے۔ علم و صلاح سے متصف صاحب ذوق و حال بزرگ تھے۔ ہندوستانی سنگیت اور موسیقی کے ماہر تھے۔ شیخ عبدالسلام بن سعد الدین بجنوری کے مرید و خلیفہ تھے۔ فارسی زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ نمونہ کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار درج ہیں۔

ندانم آں گل خنداں چہ رنگ و بودارد کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد
بجستجوئے نیابد کسے مراد ولے کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد
نشاط بادہ پرستان بہ منتہا برسید ہنوز ساقی مابادہ درسو دارد
حدیث عشق تو تنہا نہ من ہی گویم کہ ہر کہ ہست ازیں گوئے گفتگو دارد
متاع دل بکف دلبرے بدہ تو علا کہ ایں متاع گرانمایہ او نکو دارد
آپ کے خلفاء میں سید علی تلمہری اور صاحبزادے سید ماہر و بطور خاص شہرت کے

مالک ہوئے۔ باختلاف روایت ۹۶۸ھ یا ۹۷۷ھ میں وفات پائی۔ (۱)

اجودھیا کے مشہور قبرستان ”خردمکہ“ میں محو خواب راحت ہیں۔ اسی میں آپ کے صاحبزادے سید ماہر و اور دیگر اہل خاندان و متعلقین کے مزارات ہیں۔ سید علاء الدین کے مزار کے سرہانے ایک سیاہ پتھر نصب تھا، مگر ۶۰/۷۰ سال کا عرصہ ہوا، کچھ نامعلوم افراد رات کو وہ پتھر وہاں سے اُکھاڑ لے گئے اور اسی کے ساتھ بہت سی قبریں بھی کھود ڈالیں۔ بعد میں بذریعہ پولیس تحقیقات کرائی گئی مگر کچھ سراغ نہ ملا کہ کن لوگوں کی یہ حرکت تھی۔ اور کن اغراض کے تحت ایسی مذموم حرکت کی گئی (۲)

”خردمکہ“ قبرستان پر مودین کٹیا کے پورب ۳۰/۴۰ میٹر کے فاصلہ پر اس مشہور

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۳۲۔

(۲) گم گشتہ ص ۱۷ (۵)

مقبرہ (جس میں بڑے بڑے علماء، اولیاء، عباد، زہاد مدفون ہیں) کی ناگفتہ بہ حالت کو ڈاکٹر دبیران الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”گذرگی اور غلاظت سے بھرا ہوا ایک باغ ہے جس میں خود و جنگلی پودے اُگے ہوئے ہیں۔ کبھی یہ باغ ایک وسیع احاطہ کے اندر رہا ہوگا۔ کیونکہ قدیم ترین چہار دیواری کے باقیات اب بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔ باغ کا یہی احاطہ ”خردمکہ“ کہلاتا چلا آ رہا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک اس میں ہزاروں پختہ و خام قبریں موجود تھیں۔ جس زمانہ میں ”راجہ درشن سنگھ“ نے نالا کھودوایا بہت سی قبریں اس نالہ میں آ کر تلف ہو گئیں۔ اس کے علاوہ بہت سی قبریں فیض آباد، گھور کھپور روڈ بننے کے وقت سڑک اور فٹ پاتھ میں آ کر تلف ہو گئیں۔“ (۱)

(۲۱) شیخ عاشق شاہ اودھی

شیخ غلام المعروف بہ عاشق شاہ اجودھیا کے علمائے عظام و مشائخ کبار میں سے تھے۔ ابتداء میں علماء کی روش پر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ بعد میں جاذب حقیقی نے اپنی طرف کھینچا تو علمی مشغلہ سے دل اُچاٹ ہو گیا اور مرشد کامل کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ گھومتے پھرتے شیخ عبدالباسط الہ آبادی متوفی ۱۱۹۶ھ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ شیخ عبدالباسط پران کی نظر جیسے ہی پڑی ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اور وارفتگی کے عالم میں بدن کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ بعد میں افاقہ ہوا تو شیخ الہ آبادی نے انہیں اجودھیا واپس لوٹ جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ حکم کے مطابق واپس تو آ گئے مگر شیخ کی نگاہ کیمیا اثر نے دل کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ وطن مالوف میں سکون نہ ملا اور جملہ اسباب و مال و متاع نذر فقراء و مساکین کر کے دیوانہ وار شیخ الہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اور مسلسل کئی سال تک صحبت میں رہ کر ریاضت شاقہ میں مشغول رہے۔ تا آنکہ شیخ نے خلافت اور عاشق شاہ

(۱) شہر اولیاء ص ۲۰۷/۲۰۸ مع اختصار۔

شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جو پنپوری

شرقی عہد ۸۰۴ھ سے مغل بادشاہ محمد شاہ ۱۱۳۱ھ کے زمانہ تک دارالخجور شہر جو پنپور علماء و مشائخ کا مرکز رہا ہے۔ جون پور کی علمی تاریخ میں پچاسوں مدرسوں خانقاہوں کا پتہ چلتا ہے جن میں بیک وقت سیکڑوں علماء و فضلاء اور مشائخ تعلیم و تزکیہ کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔

(۱) ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۸ھ (۲) قاضی نظام الدین جو پنپوری مرتب فتاویٰ ابراہیم شاہیہ متوفی ۸۵۸ھ (۳) شیخ ابوالفتح جو پنپوری متوفی ۸۵۸ھ (۴) شیخ محمد بن عیسیٰ جو پنپوری ۸۵۸ھ (۵) ملا داد جو پنپوری بخشی ہدایہ و مدارک وغیرہ متوفی ۹۲۳ھ (۶) شیخ قطب بینائے دل جو پنپوری متوفی ۹۲۵ھ (۷) شیخ معروف جون پوری ۹۴۰ھ (۸) شیخ بہاء الدین چشتی متوفی ۹۴۷ھ (۹) میر سید عبدالاول محدث جون پوری متوفی ۹۶۲ھ (۱۰) شیخ مبارک جو پنپوری متوفی ۹۸۳ھ (۱۱) شیخ عبدالقدوس قلندر جو پنپوری متوفی ۱۰۵۲ھ (۱۲) استاذ الملک ملا محمد افضل جو پنپوری متوفی ۱۰۶۲ھ (۱۳) ملا محمود جو پنپوری مصنف شمس بازغہ وغیرہ متوفی ۱۰۶۲ھ (۱۴) شیخ دیوان محمد رشید جو پنپوری متوفی ۱۰۸۰ھ (۱۵) قاضی خوب اللہ محدث متوفی ۱۱۰۰ھ (۱۶) مفتی محمد جمیل جو پنپوری از مرتبین فتاویٰ عالمگیری متوفی ۱۱۲۳ھ (۱۷) ملاحفیظ جو پنپوری متوفی ۱۱۲۸ھ وغیرہ اپنے اپنے دور میں یہاں کے مشائخ کبار اور علماء عظام میں گذرے ہیں۔ جن میں الشیخ، الامام، العالم الکبیر، العلامة محمد بن عیسیٰ حنفی جو پنپوری اپنے معاصر علماء و مشائخ میں خاص شہرت اور مقام و مرتبہ کے مالک ہیں۔ آج کی بزم شرقی میں سے انھیں کا تذکرہ زیر عنوان ہے۔

کے خطاب سے نواز کر اجودھیارخصت کیا۔ کثرت ذکر کی وجہ سے جذب و سکر کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے مدتوں سرگشتہ اور ادھر ادھر گھومتے۔ بالآخر اس کیفیت میں کچھ کمی آئی تو وطن عزیز واپس آئے اور محلہ کاغذی ٹولہ کی مسجد میں فروکش ہو گئے۔ کسی معتقد نے مسجد کے غسلخانہ کے اوپر ایک حجرہ تعمیر کرا دیا تھا۔ اسی حجرہ میں زندگی کے بقیہ دن گزار دیئے۔ مریدین و طالبین کی اصلاح و تربیت کے ساتھ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ شیرازی کا درس بھی دیتے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے عہد نوابی ۱۲۱۲ھ میں وفات پائی۔ محلہ کاغذی ٹولہ میں معماروں کے امام باڑہ کے متصل آپ کی قبر ہے۔ اسی مناسبت سے مولوی سید محمد علی اودھی نے مصرعہ تاریخ وفات یوں کہا ہے:-

آستان امام شد جانش

۱۲ ۱۲

مزار کی عالیشان عمارت اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔ (۱)

☆ ☆ ☆

شیخ محمد کے تذکرہ کے ماخذ و مراجع

(۱) ہماری تحقیق میں ان کے سب سے قدیم تذکرہ نگار خود انھیں کے پڑپوتے شیخ مصطفیٰ جو پوری ہیں جو عہد اکبری میں جو پور کے علماء و امراء میں خاص اہمیت کے حامل تھے۔ شہنشاہ اکبر نے انھیں دہلی بلا کر بڑی عزت افزائی کی اور قاضی القضاة کا منصب جلیل عطا کر کے لاہور بھیجا، لیکن یہ اکبر کی دینی بے اعتدالیوں سے بدل ہو کر ج کی رخصت پر جو پور چلے آئے اور پھر کسی عہدہ کو قبول نہ کیا۔

انھیں شیخ مصطفیٰ نے اپنے اسلاف کے حالات میں ایک رسالہ لکھا تھا جس میں اپنے پردادا شیخ محمد بن عیسیٰ جو پوری کے سوانح تفصیل سے لکھے ہیں جو بعد کے تذکروں کے مقابلہ میں زیادہ مفصل اور مستند ہے لیکن یہ رسالہ اب بالکل نایاب ہے اس لئے براہ راست اس سے استفادہ نہیں کیا جاسکا ہے البتہ شیخ یسین بناری نے مناقب العارفین میں اس رسالہ کے اکثر حصہ کو بعینہ نقل کر دیا ہے، زیر نظر مقالہ میں زیادہ تر مواد شیخ یسین کی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

(۲) اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ نے شیخ جو پوری کا تذکرہ اخبار الاخیار کے ص ۱۸۶ پر کیا ہے، مگر اس میں ان کی ولدیت بیان کرنے میں محدث دہلوی سے چوک ہو گئی ہے جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے۔

(۳) مناقب العارفین قلمی: مولفہ شیخ یسین بناری متوفی ۱۰۷۶ھ خلیفہ شیخ طیب بناری، بزرگانِ چشت کے ذیل میں مولف نے شیخ جو پوری کے حالات شیخ مصطفیٰ جو پوری کے حوالہ سے بالتفصیل درج کئے ہیں، یہ قلمی کتاب شیخ طیب بناری اور ان کے خانوادہ کے حالات میں نہایت مستند اور گرانقدر ذخیرہ ہے۔

(۴) گنج ارشدی: یہ شیخ محمد ارشد بن شیخ دیوان محمد رشید جو پوری المتوفی ۱۱۱۳ھ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے خلیفہ شیخ شکر اللہ نے جمع اور شیخ غلام محمد رشید بن شیخ محبت الدین بن شیخ ارشد نے مرتب کیا ہے۔

دیوان محمد رشید کے مشائخ کے ضمن میں شیخ جو پوری کا مختصر سا تذکرہ ہے۔
(۵) مرآة الاسرار قلمی: مصنف شیخ عبدالرحمن چشتی یہ ایک جامع تذکرہ ہے جس میں تصوف کے تمام مشہور سلسلوں کے قابل ذکر بزرگوں کے حالات مذکور ہیں، شیخ چشتی نے مرآة الاسرار کے ص ۴۲۵ پر شیخ جو پوری اور ان کے خلفاء کا ذکر کیا ہے۔

(۶) اعلام الانام لوفیات الاعلام قلمی: مولفہ شیخ محمد یحییٰ خوب اللہ آبادی متوفی ۱۱۴۴ھ علماء و صوفیاء کے حالات میں یہ ایک اہم کتاب ہے جسے مولف علام نے سنین کی بجائے شہور کی ترتیب پر مرتب کیا ہے۔ ابھی تک یہ کتاب طبع نہیں ہو سکی ہے دائرہ اجمل شاہ الہ آباد کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے شیخ الہ آبادی نے ماہ ربیع الاول کے تحت ص ۳۵۲ پر شیخ جون پوری کے حالات درج کئے ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ بحر زخار قلمی، اخبار الاصفیاء قلمی، تجلی نور، تذکرۃ العلماء (جو پور نامہ) تذکرہ علماء ہند، نزہۃ الخواطر جلد سوم اور تاریخ شیراز ہند وغیرہ میں بھی شیخ جو پوری کا ذکر ہے مگر ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تقریباً سب نے مذکورہ بالا کتابوں کی باتیں دہرائی ہیں البتہ تذکرۃ العلماء میں ایک نئی بات ہے جو اپنے موقع پر بیان ہوگی۔
اس مقالہ کی ترتیب میں مذکورہ بالا سبھی کتابوں سے مدد لی گئی ہے مگر اصل ماخذ کی حیثیت مناقب العارفین ہی رکھتی ہے۔

تاریخ ولادت اور نام و نسب

شیخ محمد بن قاضی عیسیٰ بن شیخ تاج الدین بن شیخ بہاء الدین کی ولادت ماہ صفر ۷۸۰ھ میں دہلی میں ہوئی سلسلہ نسب اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکا، البتہ صاحب نزہۃ الخواطر نے منہج الانساب کے حوالہ سے صدیقی النسل ہونے کی صراحت کی ہے۔

اس موقع پر ایک بات خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ جو پوری کے والد کا نام ”احمد“ تحریر فرمایا ہے بعد کے بہت سے تذکرہ نویسوں نے ان کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے اسی کو لے لیا ہے لیکن گنج ارشدی، مناقب

العارفین اور نزہۃ الخواطر وغیرہ میں والد کا نام ”قاضی عیسیٰ“ مرقوم ہے اور یہی صحیح ہے۔ شیخ احمد شیخ جو پوری کے چھوٹے بھائی ہیں نہ کہ والد جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

شیخ جو پوری کے آباء و اجداد دہلی کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے تھے، جدا مجد شیخ تاج الدین معلم التقلین کے لقب سے مشہور تھے، کیونکہ ان کے درس میں انسانوں کے ساتھ جنات بھی حاضر ہوتے تھے۔

والد بزرگوار قاضی عیسیٰ حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت میر سید جلال الدین بخاری متوفی ۷۸۵ھ کے مرید و خلیفہ اور عالی مرتب صوفی تھے۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد مجھے حجرہ کے دروازہ پر جہاں طلبہ اپنی جوتیاں نکالتے ہیں دفن کیا جائے، حسب وصیت انھیں اسی مقام پر دفن کیا گیا۔

اس وصیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی عیسیٰ کے دل میں علم و علماء کی کتنی عظمت و عزت تھی۔ (۱)

دہلی سے جو پور آمد

فتنہ تیموری کے وقت دہلی جو کبھی رشکِ بغداد اور غیرتِ مصر تھی۔ جہاں چپہ چپہ پر خانقاہیں اور قدم قدم پر درس گاہیں تھیں ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ دُور دُور تک خاک اڑنے لگی، علمی و روحانی محفلیں اُجڑ گئیں گھر کے گھر بے نور و بے چراغ ہو گئے۔ اسی ہنگامہ رست و خیز میں قاضی عیسیٰ نے اپنے دونوں بیٹوں شیخ محمد و شیخ احمد کو ہمراہ لے کر دہلی کو بصد حسرت و یاس خیر باد کہا اور جو پور کا رخ کیا جو اس وقت تاجدار سلطنت شرقیہ ابراہیم شاہ شرقی متوفی ۸۴۴ھ کے حسن انتظام، علم دوستی اور علماء نوازی کی بناء پر مرجع ارباب کمال بنا تھا، صاحب مناقب بحوالہ رسالہ مصطفائیہ لکھتے ہیں۔

دوے درایام فتور فعل از حضرت دہلی بجانب جو پور آمد و اقامت فرمود

حضرت مخدوم خواجہ محمد و خواجہ احمد ہر دو برابر ہمراہ وے آمدند (۲)

(۱) مناسب العارفین ص ۱۰۷۔ (۲) ایضاً۔

(بزمانہ ہنگامہ قاضی عیسیٰ دہلی سے جو پور چلے آئے اور یہیں اقامت پذیر ہو گئے ان کے ساتھ شیخ محمد و شیخ احمد دونوں بھائی بھی جو پور آئے)

محدث دہلوی رقمطراز ہیں:

در فترتے کہ از آمدن امیر تیمور بصوب دہلی افتاد اکثرے اکابر جو پور رفتند

اونیز در اں میاں بود۔ (۱)

(امیر تیمور کے حملہ سے دہلی میں جو ہنگامہ ہوا اس کی وجہ سے اکثر اکابر جو پور چلے گئے، ان جانے والوں میں قاضی عیسیٰ بھی تھے)

تعلیم و تربیت

محدث دہلوی کی تصریح کے مطابق اس وقت شیخ محمد جو پوری کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ (۲) شیخ جو پوری نے ایسے گہوارہ میں آنکھیں کھولیں جو علم و فضل کا مرکز تھا۔ آپ کے والد قاضی عیسیٰ صوفی المشرّب ہونے کے ساتھ عالم، فقیہ اور قاضی بھی تھے، علاوہ ازیں اس زمانہ میں شاہ شرقی کی قدر شناسی اور علم پروری کی بدولت جو پور مدرسوں اور خانقاہوں کا ایک عظیم مرکز تھا۔ یہاں کی علمی و دینی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ملا خیر الدین سیر الملوک کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

از متعلقات الہ آباد شہر بیست کہ سلطان فیروز دہلوی آنرا در سنہ ہفت صد

و ہفتاد و ہجری بنا نہادہ بہ جون پور موسوم ساختہ در عہد سلاطین شرقیہ

دار السلطنت گردیدہ صد ہا مدارس و مساجد در شہر حوالی آں بنا یافتہ و علماء

فقراء از اقالیم دراں بلدہ رسیدہ (۳)

(متعلقات الہ آباد کا ایک شہر ہے جسے فیروز شاہ دہلوی نے ۷۷۲ھ میں جون پور کے

نام سے آباد کیا۔ سلاطین شرقیہ کے عہد میں دار الحکومت ہو گیا۔ سیکڑوں مدرسوں اور مسجدیں

شہر اور اس کے اطراف میں تعمیر ہو گئیں اور علماء و مشائخ مختلف شہروں سے وہاں پہنچ گئے۔)

(۱) اخبار الاخیار ص ۱۸۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تذکرۃ العلماء ص ۴۔

علم اور روحانیت کے اس دور شباب میں شیخ مخدوم محمد جو پوری پروان چڑھے خود ان کا گھر علم و فضل کا نمونہ تھا۔

شیخ جون پوری نے پہلے اپنے والد ماجد سے اکتساب فیض کیا۔ بعد ازاں ملک العلماء قاضی شہاب الدین متوفی ۸۲۹ھ کے حلقہٴ درس میں شامل ہو گئے۔ اور خداداد صلاحیت کی بدولت تھوڑے ہی دنوں میں استاذ کے منظور نظر بن گئے یہاں تک کہ قاضی صاحب نے ان کی تعلیم کے لئے بطور خاص اصول بزدوی کی شرح لکھی۔
نزہۃ الخواطر میں ہے:

فکان القاضی یحبہ حبا مفرطا صنف له شرحا علی اصول البزدوی الی
مبحث الامر عند قرأته ذالک الکتاب. (۱)

”قاضی دولت آبادی آپ سے انتہائی محبت رکھتے تھے آپ کیلئے اصول بزدوی کی باب الامر تک شرح لکھی۔ جس وقت آپ اس کتاب کو پڑھ رہے تھے۔“

اس زمانہ میں علم ظاہری کے ساتھ تصوف میں کمال حاصل کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر علماء مشائخ اور مشائخ علماء ہوتے تھے، خود شیخ کے والد زبردست صاحب تدریس عالم، فقیہ اور قاضی ہونے کے ساتھ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے مرید و خلیفہ تھے، اس لئے طلب علم ہی کے زمانہ سے شیخ کا دل سلوک و طریقت کی طرف مائل تھا۔ اور نوعمری ہی میں شیخ ابوالفتح جو پوری متوفی ۸۵۸ھ کے حلقہٴ ارادت میں داخل ہو گئے تھے لیکن تعلیم و تحصیل میں انہماک کی وجہ سے طریقہ صوفیہ کے اخذ و کسب کی جانب پوری توجہ نہ ہو سکی اس لئے تعلیم سے فراغت کے بعد حسب منشاء ادھر متوجہ ہوئے اور شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۱ھ سے بیعت ہو کر عبادت و ریاض میں لگ گئے۔

تجلی نور میں ہے۔

در صغریٰ اولاً حضرت شیخ ابوالفتح دریافت سپس از حضرت شیخ فتح اللہ اودھی

ارادت آورد و بیعت نمود۔ (۱)
بچپن میں پہلے شیخ ابوالفتح کی خدمت میں پہنچے بعد ازاں شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقہٴ ارادت میں شامل ہوئے اور بیعت کی۔

کثرت ریاضت اور اس کے اثرات

شیخ اودھی کی صحبت میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ بچپن کی دہائی چنگاری شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اٹھی اور شیخ کی پوری زندگی اسی کی نذر ہو گئی، سارے مشاغل و تعلقات سے یکسو ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے اور اس میں انہماک اس درجہ بڑھا کہ بارہ برس کی طویل مدت میں نہ زین سے پیٹھ لگا گیا اور نہ نماز پنج وقتہ کے علاوہ حجرہ سے باہر قدم نکالا، کثرت مراقبہ سے گردن کی ہڈیاں اوپر کونکل آئیں اور ٹھوڑی سینہ سے لگ گئی تھی۔
مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں۔

واخذ الطريقة الشیخ فتح اللہ اودھی و جاهد فی اللہ حق جہادہ حتی
قبل ان ظهرہ لم یمس الارض اثنی عشر سنة (۲)

سلوک کی تعلیم حضرت شیخ فتح اللہ اودھی سے حاصل کی اور اس راہ میں جدوجہد کا حق ادا کر دیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بارہ سال تک لیٹنے کی نوبت نہ آئی۔

مراقبہ اور ذکر و فکر کی کثرت نے عشق و محبت کی ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ اسی کی حلاوت اور لذت میں شیخ ہر آن سرمست اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر رہتے تھے بیان کرنے والوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ شیخ کے حجرہ کے متصل ایک درخت اُگ آیا تھا مگر مدت دراز تک انھیں اس کا علم نہ ہو سکا۔ ایک دن اتفاقاً اس کی چند پتیاں ہوا سے اڑ کر حجرے میں آ گئیں تو حیرت سے دریافت کرنے لگے یہ پتیاں کہاں سے آ گئیں۔ بتانے والوں نے بتایا کہ دروازہ کے قریب جو درخت ہے یہ اسی کی پتیاں ہیں تو نہایت

متعجب ہو کر فرمایا کیا یہاں کوئی درخت ہے۔“ (۱)

شانِ استغنا

شیخ جو پوری نبی کریم..... کے اس فرمان پر شدت سے عامل تھے جس میں علماء اور ارباب فضل و کمال کو امراء و اغنیاء کے یہاں بلا ضرورت آمد و رفت سے منع کیا گیا ہے۔ اور ان سے تعلق رکھنے کو علماء کے حق میں فتنہ عظیم بتایا گیا ہے۔

ان کا معمول تھا کہ نہ خود کسی امیر و رئیس کے یہاں جاتے اور نہ اسے موقع دیتے کہ وہ آپ کی مجلس میں حاضر ہو۔ چنانچہ ایک بار سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ازراہ نیاز مندی کچھ نقد اور خلعت خدمت میں پیش کئے تو بکمال استغناء اسے واپس کر دیا اور یہ رباعی پڑھی۔

من دلق خود باطلس شاہاں نمی دہم

من فقہ خود با ملک سلیمان نمی دہم

از رنج فقر در دل گنج کہ یافتم

ایں رنج را براحت سلطان نمی دہم

شیخ کے استغناء کے سلسلے میں شیخ مصطفیٰ جو پوری نے ایک عجیب و غریب واقعہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دن سلطان حسین شاہ شرقی نے شیخ کے صاحبزادہ شیخ حبیب اللہ سے نہایت اصرار کے ساتھ یہ درخواست کی کہ مخدوم زادہ اگر کچھ زمین قبول فرمائیں تو اہل خانقاہ کے صرف و خرچ میں آسودگی و آسائش ہو جاتی۔ شیخ حبیب اللہ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے، سلطان حسین ایک دیہات کی جاگیر کا پروانہ خانقاہ کے کسی خادم کو دے کر چلا گیا، کچھ دنوں کے بعد جاگیر کی پیداوار لے کر اس گاؤں کے کاشتکار خانقاہ میں حاضر ہوئے دیہات کے لوگ آداب خانقاہ سے ناواقف اس لئے کچھ شور و شغب ہو گیا، شیخ کے کان میں اس کی آواز پہنچی تو پوچھا کیا ہنگامہ ہو رہا ہے کسی نے عرض کیا ”مخدوم زادہ کی جاگیر سے غلہ آیا ہے اسے وزن کیا جا رہا ہے“ یہ سنتے ہی شیخ کا تیور بدل گیا، غضب

(۱) تجلی نور ص ۲۳۔

ناک ہو کر فرمایا۔

حبیب اللہ اس رائے خور و خلیفہ اور خواہد خورد طعام خودی رسد حبیب اللہ اس را چرا قبول کرد و ساکت ماند۔

حبیب اللہ اسے نہ کھا سکے گا بلکہ اس کا قائم مقام کھائے گا طعام تو خود سے پہنچتا ہے حبیب اللہ نے اسے کیوں قبول کر لیا اور خاموش رہا۔

انجام کار شیخ نے جو فرمایا تھا وہی ہوا، اس واقعہ کے تیسرے دن شیخ حبیب اللہ کا انتقال ہو گیا اور اس غلہ کو وہ نہ کھا سکے۔ (۱)

شیخ اور تعمیر مسجد جامع جو پور

شاہان شرقیہ کو شیخ سے غایت درجہ عقیدت و ارادت تھی وہ ہمہ وقت ان کی خدمت کو سرمایہ سعادت سمجھتے تھے، اگرچہ شیخ اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے... شیخ کی خانقاہ کے قریب کوئی جامع مسجد نہ تھی اس لئے جمعہ و عیدین کی ادائیگی کیلئے خانقاہ سے کافی فاصلہ پر محلہ خالص پورہ کی مسجد میں جانا پڑتا تھا، آخر عمر میں ضعف و نقاہت کی وجہ سے دشواری پیش آنے لگی تو سلطان محمود شرقی کو شیخ کی رضاء حاصل کرنے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ اگر حضرت پسند فرمائیں تو خانقاہ سے قریب ہی ایک جامع مسجد تعمیر کرا دی جائے۔ شیخ نے فرمایا ”خوب است“ چنانچہ ۸۴۲ میں ان کے مکان سے قریب مسجد کی بنیاد رکھ دی گئی اور دس سال میں تعمیر مکمل ہو گئی۔ مسجد جامع الشرق تکمیل کی تاریخ ہے۔ (۲)

مسجد کے مکمل ہو جانے کے بعد شیخ اسی میں جمعہ و عیدین کی نماز ادا کرنے لگے۔ آج کل یہ مسجد ”بڑی مسجد“ کے نام سے مشہور ہے اور سلاطین شرقیہ کی عظمت رفتہ کی ایک عظیم یادگار ہے۔

(۱) مناقب العارفین ص ۱۰۸۔

(۲) تذکرۃ العلماء ص ۳۹۔

درس و تدریس

شیخ کی زندگی کا روحانی پہلو اتنا پرکشش اور نمایاں رہا کہ تذکرہ نگاروں نے عام طور سے ان کی اسی حیثیت کا ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ دوسرے مشائخِ چشت کی طرح ظاہری علوم کا درس بھی دیتے تھے۔

ملا خیر الدین لکھتے ہیں۔

در حضور پدر بتدریس طلبہ علوم پرداخت و غوامض مسائل را در اندک تأمل
منکشف ساخت۔ (۱)

اپنے والد کی موجودگی میں طلبہ کو درس دیتے تھے اور دقیق مسائل علمیہ کو ادنیٰ غور و فکر سے حل کر دیا کرتے تھے۔

لیکن ان طلبہ علوم میں سے دو کے علاوہ کسی اور کا نام باوجود تلاش بسیار کے معلوم نہ ہو سکا۔ ان میں ایک شیخ بہاء الدین عمری جو پنپوری ہیں جنہوں نے جملہ علوم شرعیہ کی تحصیل و تکمیل آپ ہی سے کی، دوسرے شیخ بدہ حقانی ہیں جن کے بارے میں شیخ یلین بنارس لکھتے ہیں، در خدمت مخدوم بعضے کتب تحصیل نمود۔ (۲)

مشائخ کی تذکرہ نگاری کا یہ پہلو ہمیشہ سے بہت افسوسناک رہا ہے کہ ان کے روحانی درجات و مراتب اور کرامات و تصرفات کے انبار میں ان کی علمی زندگی دب کے رہ گئی ہے کچھ یہی معاملہ شیخ جون پوری کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ان کے جملہ تذکرہ نگار ان کے روحانی فضل و کمال کو تو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں، مگر ان کے علمی مقام و مرتبہ کی جانب کسی نے توجہ نہ دی۔

تصنیف و تالیف

شیخ کے کسی تذکرہ نویس نے ان کی کسی تصنیف کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور شیخ کے مجموعی

(۱) تذکرۃ العلماء، ص ۲۱۔ (۲) مناقب العارفین، ص ۱۰۴۔

حالات بھی یہی بتاتے ہیں کہ انھیں اس جانب توجہ مبذول کرنے کی نوبت نہ آئی ہوگی، مگر اس کے علی الرغم ملا خیر الدین الہ آبادی نہ جانے کہاں سے لکھتے ہیں ”اوصاحب تصانیف کثیرہ است“، یعنی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے اور صاحب بحر ذخار نے ان تصانیف کثیرہ کی تعداد ”یک صد“ بتائی ہے مگر یہ تصریح محل نظر ہے کیونکہ اگر شیخ کی کوئی تصنیف ہوتی تو کم از کم ان کے پرپوتے مصطفیٰ جون پوری اس کا ضرور تذکرہ کرتے جبکہ انہوں نے شیخ کی معمولی سے معمولی خدمت کو بھی ذکر کیا ہے، واللہ اعلم۔

قبول عام

شیخ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت عطا کی تھی اور ہر طبقہ کے لوگ ان کے فضل و کمال کے معترف تھے، محدث دہلوی لکھتے ہیں:

و هو ممن یتفق علی ولایتہ و عظمتہ و کرامتہ۔ (۱)

شیخ جو پنپوری ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی ولایت، عظمت اور کرامت پر سب کا اتفاق ہے، اور تو اور خود ان کے استاذ اجل ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی آپ کی اس حیثیت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اپنے آڑے وقتوں میں طالب توجہ بھی ہوتے تھے، صاحب گنج ارشدی لکھتے ہیں کہ ایک بار قاضی صاحب کا ملا خیر اتنی سے دربار شاہی میں مناظرہ طے پا گیا قاضی صاحب نے آخر عمر میں درس و تدریس کا مشغلہ کچھ کم کر دیا تھا اس لئے انہیں تشویش ہوئی تو خانقاہ میں حاضر ہوئے اور کامیابی کی دعا چاہی شیخ نے عرض کیا آج رات کو اپنے کتب خانہ کی جس کتاب پر پہلے نظر پڑے اسی کا مطالعہ فرمائیں انشاء اللہ فتح و کامرانی نصیب ہوگی۔ شیخ کی تجویز کے مطابق قاضی صاحب کتب خانہ پہنچے تو ان کی نظر اپنی ہی تصنیف کردہ کتاب ”الارشاد فی الخو“ پر پڑی، قاضی صاحب نے اسی کا مطالعہ کیا اور بفضلہ تعالیٰ شیخ کی دعا کی برکت سے کامیاب ہوئے۔

(۱) اخبار الاخیار، ص ۱۸۶۔

وفات و مدفن

شیخ جو پنپوری کی تاریخ وفات میں تذکرہ نگاروں کا سخت اختلاف ہے۔ شیخ مصطفیٰ نے اپنے رسالہ میں ۱۲ ربیع الاول ۸۷۰ لکھا ہے۔ صاحب مناقب اور گنج ارشدی نے اسی قول کو ترجیح دیا ہے۔ (۱) لیکن اس کے برخلاف صاحب نجلی نور لکھتے ہیں کہ محدث دہلوی نے اخبار الاخبار میں سن وفات ۸۴۵ھ درج کیا ہے، میرے سامنے اخبار الاخبار کا جو نسخہ ہے اس میں سن وفات مرقوم نہیں ہے ممکن ہے زیدی مرحوم کے نسخے میں اس کی تصریح رہی ہو، اخبار الاصفیاء قلمی میں ۸۶۹ھ درج ہے۔ (۲)

شیخ خوب اللہ الہ آبادی نے ۸۹۹ھ تحریر کیا ہے (۳) ان سبھی حضرات کی تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیاء میں ۹۱۱ لکھتے ہیں۔ ان سبھی اقوال میں صحیح شیخ مصطفیٰ اور گنج ارشدی ہی کا قول ہے، چنانچہ تاریخ اسلامی ہند کے محقق مولانا عبدالحی مرحوم نے نزہۃ النواظر میں اسی قول کو لیا ہے۔

گذشتہ سطور میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلطان محمد شاہ شرتی نے شیخ جو پنپوری کی رضا جوئی میں ۸۴۲ھ میں جامع الشرق کی بنیاد رکھی اور دس سال (۸۵۲ھ) میں تعمیر مکمل ہوئی اور شیخ نے نماز جمعہ و عیدین اسی نو تعمیر مسجد میں ادا کرنی شروع کر دی اس لئے لازمی طور سے ۸۵۲ھ کے بعد تک شیخ کا موجود رہنا ضروری ہے۔ اس طرح ۸۴۵ھ والی روایت غلط ہو جاتی ہے، رہیں مفتی لاہوری اور شیخ الہ آبادی کی بیان کردہ روایتیں تو وہ اس لئے صحیح نہیں کہ شیخ مصطفیٰ نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ شیخ کے پرپوتے شیخ فضل اللہ بن شیخ نعم اللہ کی ولادت کے بعد شیخ جو پنپوری صرف چھ ماہ بقید حیات رہے اور شیخ فضل اللہ کی پیدائش ۸۶۹ھ میں ہوئی ہے۔

(۱) مناقب العارفین ص ۱۰۹۔

(۲) اخبار الاصفیاء قلمی، ص ۷۶۔

(۳) اعلام الامام لوفیات الاعلام قلمی، ص ۳۵۲۔

مقبرہ جامع الشرق (بڑی مسجد) کے قریب محلہ ارزن میں بھارت پختہ آج بھی موجود ہے اور زیارت گاہ خلاق ہے، مقبرہ اور خانقاہ کی پختہ سنگین تعمیر ”جنید برلاس“ نے کرائی تھی جو عہد بابر میں جون پور کا حاکم تھا، اس کے بعد محمد شاہ کے دور حکومت میں شیخ ہی کے خانوادہ کے ایک بزرگ شیخ محمد ماہ جو پنپوری نے اس کی شکست و ریخت کی مرمت کرائی، مقبرہ کے صدر دروازہ پر اب تک یہ عبارت موجود ہے ”خاکروب ایں درگاہ محمد ماہ“۔

شیخ کے چند ملفوظات

شیخ کے چند ملفوظات درج کئے جاتے ہیں جو حقیقتاً روح تصوف اور خلاصہ سلوک ہیں۔ ان سے شیخ کے انداز تربیت کا بھی کچھ اندازہ ہوگا۔

(۱) اپنے متعلقین سے بتا کید فرماتے رہتے تھے ہمہ وقت اللہ کو حاضر و ناظر جانو اور تدریجاً اس بات کی کوشش کرو کہ ”اَلَمْ یَعْلَمَ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی“ (کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہے ہیں) کا تصور دل میں اس طرح جاگزیں ہو جائے کہ ایک لمحہ بھی دل اس خیال سے غافل نہ ہو۔

(۲) اوراد و اشغال سے مقصود اصلی یہ ہے کہ ظاہراً و باطناً اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہو جائے اور دل میں یہ یقین راسخ ہو جائے کہ انہ ارحم بہ من نفسہ وانصح لہ من نفسہ ومن الناس اجمعین، یعنی اللہ تعالیٰ میری ذات پر خود مجھ سے زادہ مہربان ہے اور خود مجھ سے اور تمام لوگوں سے زیادہ میرا خیر خواہ ہے۔

(۳) سعی اس بات کی ہونی چاہئے کہ قلب یاد حق میں اور قالب کار حق میں مشغول رہے۔

(۴) جو کام بھی کیا جائے صرف اللہ کی رضا کیلئے کیا جائے اور ہر امر میں فعال حقیقی

اسی کو سمجھا جائے۔ (۱)



(۱) مناقب العارفین، ص ۱۱۸۔

قاضی خاں ظفر آبادی

ظفر آباد کی مختصر تاریخ

ظفر آباد جون پور سے ۶ میل پورب اور دکھن میں واقع ہے۔ یہ قدیم اور تاریخی مقام ایک زمانہ میں علماء اور مشائخ کا مرکز رہ چکا ہے۔

اس کا اصل اور قدیم نام منہج تھا۔ جب مسلمانوں کی آمد اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس علاقہ پر ان کا قبضہ ہو گیا اس وقت سے منہج کے بجائے ظفر آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۵۸۹ھ میں سلطان شہاب الدین غوری کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک نے گوالیار، بدایوں اور کالپی وغیرہ کی تسخیر کے بعد منہج پر حملہ کیا اس وقت یہاں کا راجہ اودے پال نامی ایک راجپوت تھا۔ اودے پال، ایبک کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکا اور اپنے خاندان کو لے کر مارواڑ کی جانب بھاگ گیا۔

ایبک فاتحانہ شہر میں داخل ہوا اور چند دن یہاں قیام کر کے انتظامات درست کیے اور اپنی جانب سے اودے پال کے وزیر جیت سنگھ کو شہر کا حاکم بنا کر خود دلی چلا گیا۔ اس تاریخ سے منہج اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ لیکن عملاً حکومت جیت سنگھ اور اسکی اولاد کے قبضے میں رہی، یہ لوگ برابر سالانہ خراج دہلی بھیجتے رہے اور اپنی نیاز مندی اور ماتحتی کا اقرار کرتے رہے۔

لیکن جیت سنگھ کی پانچویں پشت میں سکیت سنگھ نامی ایک ایسا راجہ ہوا جو ناقابت اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متعصب بھی تھا۔ اس نے ایک طرف تو شاہان دہلی کی برتری کا انکار کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور دوسری جانب جو مسلمان اس کی حدود سلطنت میں تھے ان کے درپے آزار ہو گیا۔ اور نت نئے مظالم ان پر توڑنے لگا۔ اس کے

تعصب کی پیاس جب ان مظالم سے نہ بجھ سکی تو اعلان کر دیا گیا کہ کوئی مسلمان اس کی حدود سلطنت میں رہنے نہ پائے جو مسلمان اس اعلان کے بعد اپنی مجبوریوں سے ہجرت نہ کر سکے وہ اس کی جارحیت و بربریت کے ہاتھوں ہلاک و برباد ہوئے۔ (۱)

انہیں ایام میں جبکہ سکیت سنگھ مسلمانوں پر جبر و تشدد کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ شیخ سید (۲) اسد الدین آفتاب ہند المتوفی ۷۹۳ھ جو اس عہد کے اولیائے کاملین میں تھے اپنے شیخ مخدوم رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے حکم سے دیار پورب میں مقیم تھے انہیں جب سکیت سنگھ کی زیادتیوں کی اطلاع ملی تو وہ مسلمانوں کی مدد اور انہیں ظلم و ستم کے خونیں پنجے سے نجات دلانے کے لیے بے چین ہو گئے۔ اور فوراً ایک خط اپنے پیرومرشد شیخ ملتانی کی خدمت میں ارسال کیا۔ انہیں راجہ کے ظلم و تعصب سے باخبر کر کے اجازت چاہی تاکہ منہج جا کر مسلمانوں کی نصرت و حمایت کی جائے اور راجہ کو ظلم و عدوان سے روکا جائے۔

مخدوم آفتاب ہند نے اس سلسلہ میں جو مکتوب شیخ رکن الدین ملتانی کی خدمت میں بھیجا تھا اس مکتوب سے راجہ کی جارحیت اور مسلمانوں کی مظلومیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مکتوب ملاحظہ ہو۔

مکترین بندگان اسد حسین حسینی اُمید وار برکت مخدوم مد اللہ ظلال جلالہ
برآں جملہ کہ ایں بندہ بعد آئے آداب جماعت در دعا مشغول می ماند رجاء
کہ مددے در کار بندہ با خدائے تعالیٰ اسباب دینی و دنیوی ساختہ گرداند۔

دیگر عرض می آفتد چوں بندہ بندگان بحکم آل مخدوم زمان در جہاد بنا دئی

(۱) تاریخ ظفر آباد، ص ۱۹۔

(۲) شیخ مخدوم سید اسد الدین ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے کٹر امانک پور میں شیخ ضیاء الدین زاہد کڑوی سے علوم و فنون کی تعلیم بیس سال کی عمر میں مکمل کی، پھر ملتان جا کر شیخ رکن الدین ابوالفتح بن محمد ملتانی سے بیعت کی اور خلافت پائی۔ آپ فقہ اصول فقہ اور تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ سب سے قاری بھی تھے۔ ملتان سے واپس آ کر حضرت سلطان الاولیا شیخ نظام الدین بدایونی سے بھی کسب فیض کیا۔ ۱۶ جمادی الاول ۷۹۳ھ میں بعارضہ فاج وفات پائی۔ محلہ سید واڑہ ظفر آباد میں دریائے گوتمی کے ساحل پر آپ کا مزار ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے... تجلی نور ص ۱۱-۷، و چراغ نور، ص ۲۳-۳۸، و نزہۃ الخواطر، ص ۱۲، ج ۲۔

مشغول و سرگرم ست لاکن معرکہ آرائی ختم نشد ہمدریں اثنا اخبار بدعت آثار
 راجہ منہج کہ در سخت قلب ظلم و کشت بے گناہان و بر مسلمانان انواع انواع
 بدعت و ایذاء می رساند و از خوف و رجاے یوم انتقام غافل است جماعت
 فقراء کہ در زاویہ این بندہ بندگان مامور است بجوش و خروش می خواهد کہ ہراں
 ناعاقبت اندیش نعرہ تکبیر بلند کنند الا انتظار این معرکہ موقوفہ بدل گزین اگر
 نوع مددکار ما بندہ بندگان شود حق سبحانہ تعالیٰ آں سخت قلباں را تخلعت نور
 اسلام مزین کناد و جملہ مسلمانان را فیروز مندی رہاد بمنہ و کرمہ (۱)

مخدوم آفتاب ہند اس وقت بنا دئی (۲) میں مصروف تھے اس لیے شیخ ملتانی نے اپنے
 دوسرے خلیفہ مخدوم صدر الدین چراغ ہند (۳) المتوفی ۷۷۷ھ کو جو اس وقت مرزا پور کے
 علاقہ میں ارشاد و تبلیغ کے اہم کام میں مصروف تھے منہج کی جانب متوجہ ہونے کا حکم دیا۔
 شیخ کے حکم پر مخدوم چراغ ہند مرزا پور سے منہج کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کے پہنچتے
 پہنچتے مخدوم آفتاب ہندی بنا دئی سے فارغ ہو کر منہج پہنچ گئے۔ دونوں بزرگوں نے معاملہ
 کی اہمیت و نزاکت کے پیش نظر شاہ دلی غیاث الدین تعلق سے امداد کی فرمائش کی۔ ان
 حضرات کی طلب پر سلطان نے شاہزادہ ظفر خاں کی معیت میں چھ ہزار کاشکری منہج روانہ
 کر دیا۔ شاہزادہ ظفر خاں نہایت تیز رفتاری سے شب و روز منزلیں طے کرتے ہوئے بہت
 جلد منہج کے قریب پہنچ کر دریائے گومتی کے ساحل پر خیمہ زن ہو گیا۔ (۴)

ظفر خاں کے آجانے کے بعد راجہ کو پیغام بھیجا گیا کہ سرکشی اور ظلم و تشدد کے راستہ کو

(۱) تاریخ ظفر آباد بحوالہ مناقب درویشہ قلمی ص ۲۱ و تاریخ شیراز ہند ص ۹۲۵۔

(۲) بنا دئی تحصیل سکری ضلع اعظم گڑھ کا ایک مشہور موضع ہے۔

(۳) شیخ صدر الدین ظفر آبادی ۷۰۵ھ میں ملتان میں پیدا ہوئے اور اس دور کے اساتذہ سے حفظ قرآن اور دیگر
 علوم متعارف کی تکمیل کی پھر اپنے ماموں زاد بھائی شیخ رکن الدین ملتانی سے بیعت کی اور خلافت پائی اور شیخ کے حکم
 سے تبلیغ دین کی غرض سے دیار پورب میں تشریف لائے۔ آپ نے سات بار پیدل حج کیا تھا۔ ۸/ ذی قعدہ ۹۷۴ھ
 یا ۹۹۰ یا ۹۹۵ میں وفات پائی۔ آپ کا مدفن مملکت شیخ واڑہ ظفر آباد میں ہے۔ دیکھئے چراغ نور ص ۴۷-۴۳ و تجلی نور ص

۱۳-۱۱ و نذرہ الخواطر ص ۶۰ ج ۲۔ (۴) تاریخ ظفر آباد ص ۲۲۔

چھوڑ کر اطاعت قبول کر لو اور اگر یہ منظور نہیں ہے تو پھر جنگ کے لیے آمادہ ہو جائے۔ راجہ
 کی جانب سے اس پیغام کا کچھ جواب نہیں ملا جسے مسلمانوں نے اس کے کبر و نخوت اور
 آمادگی جنگ پر محمول کیا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔

راجہ سکیٹ سنگھ اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پا کر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اور
 مسلمانوں کے پاس پیغام بھیجا کہ لڑنے کے بجائے ہمارے درمیان مذہبی مباحثہ ہو جائے
 اگر مسلمان اس مباحثے میں کامیاب ہو جائیں گے تو مجھے قبول اسلام سے کوئی عذر نہ ہوگا
 اور اگر بازی ہمارے ہاتھ رہی تو پھر مسلمان کو ہمارا شہر خالی کر دینا پڑے گا۔ مخدوم چراغ
 ہند نے راجہ کی تجویز تسلیم کر لی اور محاصرہ اٹھالیا۔

دونوں فریق کے لوگ جمع ہوئے اور مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔ فریقین کے نمائندوں
 نے اپنے اپنے دلائل پیش کیے۔ انجام کار میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ راجہ کے
 مناظرین، اسلام کی حقانیت کے معترف ہو کر مسلمان ہو گئے۔ راجہ کو جب اس شکست کی
 خبر ملی تو وہ بدعہدی کرتے ہوئے اپنے خاندان کے افراد کو ہمراہ لے کر چپکے سے جان
 پچا کر مرزا پور بھاگ گیا۔ اور فوجیوں نے قلعہ کا دروازہ بند کر لیا۔ ناچار مسلمان پھر لڑنے پر
 مجبور ہوئے چونکہ راجہ فرار ہو چکا تھا اس لیے فوج زیادہ دیر تک مقابلہ میں قائم نہ رہ سکی اور
 معمولی مزاحمت کے بعد قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور مسلمان فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے (۱)
 یہ جنگ ۷۷۷ھ میں پیش آئی ہے اور اس وقت سے یہ قدیم اور تاریخی شہر منہج کے
 بجائے ظفر آباد کے نام سے موسوم ہوا۔

اس سن کی تصدیق اس کتبہ سے ہوتی ہے جو حضرت چراغ ہند کے مقبرہ کے صدر
 دروازہ پر نصب ہے جس پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

بعہد ملک ذوالقرنین ثانی بنائے شہر را از عدل بانی
 غیاث دین و دنیا بوالمظفر سلیمان خاتم و جمشید و افسر
 شہ آفاق تعلق شاہ اعظم کہ بروے شد جہانگیری مسلم

(۱) تاریخ ظفر آباد ص ۲۲ و تاریخ شیراز ہند ص ۹۲۷۔ تاریخ ظفر آباد ص ۲۳ و تاریخ شیراز ہند ص ۱۰۱۳۔

دوشنبہ بست و ہفتم روز بودہ ربيع الاول ماہ ستودہ
ہایوں سال وساعت وقت مسعود زہجرت ہفت و صد و بست یک بود
مظفر شد چوں شد معمور این شہر ظفر آباد نامش ماندہ در دہر
یہ کتبہ دراصل اس شہر پناہ کا تھا جسے شاہزادہ ظفر خاں نے شہر پر قبضہ ہو جانے کے
بعد بنوایا تھا مگر جب شہر پناہ گر گئی تو بعد میں وہ پتھر یہاں لا کر نصب کر دیا گیا۔ (۱)

شہر کے فتح ہو جانے کے بعد مخدوم آفتاب ہند و چراغ ہند نے اسی جگہ اقامت
اختیار کر لی۔ ان دونوں بزرگوں کے ہمراہ اس تبلیغی و جہادی قافلہ میں شیخ نظام الدین
علامی، قاضی اعز الدین، ملا بہرام منطقی، شیخ محمد کوفی، قاضی تاج الدین ناصحی، ملا
بدر الدین، ملا آدم وغیرہ بھی تھے جو اپنے وقت کے مشاہیر علماء و صوفیاء میں شمار ہوتے تھے
جن کی وجہ سے ظفر آباد علماء و مشائخ کا عظیم ترین مرکز بن گیا۔ (۲)

قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحی ظفر آباد کے اولین قاضی منتخب ہوئے۔ یہ حافظ
قرآن اور نہایت خوش الحان قاری تھے اور مخدوم آفتاب ہند کے ممتاز خلفاء میں تھے۔
سلطان الشرق ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں ۸۳۰ھ میں فوت ہوئے۔ (۳)

انھیں قاضی تاج الدین ناصحی کی چوتھی پشت میں نویں صدی کی ابتداء میں اس نادر
روزگار ہستی کا وجود ہوا جس نے بیک وقت درس گاہ اور خانقاہ دونوں کو اپنی علمی و روحانی
سرگرمیوں سے آباد رکھا اور جس کے دست قناعت نے فقر و فاقہ کے باوجود کسی امیر و رئیس کا
شرمندہ احسان ہونا پسند نہیں کیا۔ اسی قدسی صفات بزرگ کی ذات آج زیب عنوان ہے۔

اسم گرامی اور تاریخ ولادت

نام نامی جلال الدین اور لقب قاضی خاں اور ناصحی ہے۔ ناصحی آپ کا خاندانی لقب

(۱) سید سلیمان ندوی قدس سرہ نے حیات شبلی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ غیاث الدین تغلق نے مخدوم چراغ ہند
کے لیے ظفر آباد میں ایک محل بنوایا تھا یہ کتبہ اسی محل کا ہے مگر تمام تذکرے اس روایت سے خالی ہیں اس کے برخلاف
تاریخ شیراز ہند، ص ۱۰۱۲ پر ہے کہ یہ کتبہ شہر پناہ کا تھا جسے بعد میں شہر پناہ کے منہدم ہو جانے کے بعد روضہ کے
دروازے پر نصب کر دیا گیا ہے۔ (۲) چراغ نور، ص ۲۳۔ (۳) چراغ نور، ص ۱۲ بحوالہ مناقب درویشیہ۔

ہے جس سے پورا خاندان ملقب ہے۔ اس لقب کے سلسلے میں صاحب مناقب درویشیہ
لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم ادہم قدس سرہ نے جب تاج و تخت سے کنارہ کش ہو کر
درویشانہ اور فقیرانہ روش اختیار کر لی تو ان کے ایک صاحبزادہ محمود نے آپ کو پند و نصائح
کے ذریعہ پھر سلطنت و حکومت کی جانب مائل کرنا چاہا اسی پند و نصیحت کی وجہ سے لوگ محمود
کو محمود ناصح کہنے لگے اور اس کی اولاد ناصحی کی نسبت سے مشہور ہوئی۔ (۱)

آپ کی ولادت ۸۰۵ھ میں بمقام ظفر آباد ہوئی۔ مادہ تاریخ پیدائش خاصان حق ہے۔

شجرہ نسب اور اصلی وطن

آپ نسباً شیخ فاروقی اور حضرت ابراہیم ادہم کی اولاد سے ہیں۔ شجرہ نسب یہ ہے۔
جلال الدین قاضی خاں، بن قاضی یوسف ناصحی بن نظام الدین ناصحی بن شیخ صدر عالم
ناصری بن قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحی بن سلطان حسین ناصحی بن سلطان سلیمان ناصحی
بن سلطان محمود ناصح بن شیخ ابراہیم ادہم قدس سرہ (۲)

حضرت ابراہیم قدس سرہ کے تارک الدنیا ہو جانے کے بعد بھی کئی پشتوں تک ان
کے خاندان میں حکومت باقی رہی لیکن سلطان حسین ناصحی کے عہد میں شاہ عباس فرماں
روائے ایران نے حملہ کر کے حکومت بخارا کو تاخت و تاراج کر دیا اور خاندان ناصحی کا
شیرازہ اقصائے عالم میں منتشر ہو گیا۔

اسی حملہ کے بعد ۷۰۸ھ میں شیخ تاج الدین ناصحی نے بخارا کی سکونت ترک کر کے
دہلی کو اپنا مسکن و وطن بنایا۔ بعد ازاں حضرت آفتاب ہند کی معیت میں ۷۲۱ھ میں ظفر آباد
تشریف لائے اور یہاں کے قاضی مقرر ہوئے۔ یہی عہدہ قضا بعد میں خاندان ناصحی کے

(۱) چراغ نور، ص ۴۷، نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۶۵۔

(۲) چراغ نور، ص ۱۲۵۔ ناصحی خاندان کے شیوخ اپنا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم تک پھر اس کے اوپر حضرت
فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک لے جاتے ہیں لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ علامہ ابن اثیر کامل میں لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن
ادہم قبیلہ بکر بن وائل سے تھے اور حافظ نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم ناصحی تھے اور بعض نے
تہذیب لکھا ہے۔ امام بخاری بھی قبیلہ کے حوالہ سے انھیں تہذیبی بیان کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ظفر آباد میں قیام کا سبب ہوا۔ (۱)

شیخ تاج الدین نے ظفر آباد میں جس مقام کو اپنی قیام گاہ بنایا تھا وہ جگہ محلہ ناصحی سے مشہور ہوئی اور آج تک اسی نام سے موسوم ہے۔

خاندانی وجاہت

قاضی خاں نے جس وقت آنکھ کھولی آپ کا گھر علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ والد بزرگوار قاضی یوسف ناصحی ظفر آباد کے قاضی تھے۔ گھر میں علوم و فنون کے چرچا کے ساتھ فراغت و رفاہیت بھی تھی۔ ابھی آپ چھ ماہ کے تھے کہ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے آپ کو ایک قاضی کے گھر سے وزیر اعظم کی آغوش میں پہنچا دیا۔

آپ کے والد قاضی یوسف ایک شب اپنے خسر عماد الملک بختیار خاں وزیر اعظم کے بالا خانہ پر تہجد کے بعد ذکر و شغل میں منہمک تھے۔ اتفاقاً شیخ بہاء الدین (۲) جو پنپوری قدس سرہ کا گزر بالا خانہ کے پاس سے ہوا۔ شیخ نے قاضی یوسف کو دیکھ کر بڑے پردرد لہجے میں بلند آواز سے یہ اشعار پڑھے۔

دارم سخنے اگر نہی گوش من رسم سوئے تو خاموش
ایوان ترا بسے بلند است اینجا حرص و ہوا کمند است
باید در عشق خانہ بردوش مجنوں شدہ کوہ کوہ بخرش

خدا جانے شیخ کی آواز میں کیا جادو تھا کہ ان اشعار کے سنتے ہی قاضی یوسف از خود رفتہ ہو گئے اور ایک آہ سرد مار کر بیابان کی راہ لی۔ سلطان الشرق اور عماد الملک نے ہر چند تلاش و جستجو میں آدمی دوڑائے مگر کچھ خبر نہ ملی کہ کہاں گئے اور کیا ہوئے۔ (۳)

(۱) بیان الانساب سادات زید پور، ص ۱۳۹، بحوالہ تاریخ شیراز ہند۔

(۲) شیخ بہاء الدین جون پوری چشتی مشہور مشائخ چشتیہ میں سے ہیں۔ مولانا عبدالحی رائے بریلوی نزہۃ الخواطر ص ۶۱، ج ۲ میں شیخ بہاء الدین جون پوری کے ترجمہ میں لکھتے ہیں العالم الفقہ المورث جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم باطن کے ساتھ علوم ظاہر میں بھی یدِ طولی رکھتے تھے۔ شیخ محمد عیسیٰ تاج جو پنپوری کے مرید اور راجہ حامد شہ ماگپوری کے خلیفہ تھے بقول صاحب بحر زار ۹۱۱ھ میں وفات پائی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تجلی نور، ص ۲۷۔

(۳) چراغ نور، ص ۲۸، گنج ارشدی ص و نزہۃ الخواطر، ص ۶۱، ج ۲۔

قاضی یوسف کے اس طرح لاپتہ ہو جانے کے بعد قاضی خاں کی نگہداشت اور تربیت کی تمام ذمہ داری ان کے نانا عماد الملک کے سر آئی۔ عماد الملک جملہ علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور وزیر السلطنت بھی تھے اس لیے علمی ماحول کے ساتھ ہر طرح کی آسائش اور آسودگی بھی میسر تھی جس کا اثر مخدوم قاضی خاں کی نشوونما پر بہت اچھا پڑا اور سترہ سال کی قلیل مدت میں علوم متداولہ کی تعلیم و تحصیل سے فراغت ہو گئی۔

نزہۃ الخواطر میں ہے۔

ونشاء فی مہد جدہ لامہ الوزير عماد الملک الجونپوری واشتغل بالعلم

من صباہ وقرء فاتحة الفراغ فی السابع عشر من سنہ، (۱)

اے نانا عماد الملک وزیر جو پنپور کی آغوش میں پروان چڑھے اور بچپن ہی میں تحصیل علم میں مشغول ہو گئے اور سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

مخدوم قاضی خاں نے کن کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اس کی تفصیل سے تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں لیکن اتنی بات واضح ہے کہ انھوں نے عماد الملک کی زیر نگرانی علمی مراحل طے کئے اور جملہ علوم و فنون کی تحصیل جو پنپور ہی میں کی۔ عماد الملک خود ایک تبحر عالم اور علم و علماء کی عظمتوں سے واقف، بیدار دل، روشن ضمیر بزرگ تھے اور جون پور سلطان الشرق کی علم پروری اور علماء نوازی سے چمنستان علم و فضل بنا ہوا تھا۔

اس لیے یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ شفیق نانانے عزیز نواسے کی علمی تربیت کے لیے وقت کے علماء و فضلا کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔

عرفان و سلوک

علوم ظاہری کی تحصیل سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے اور سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ شیخ حسن بن طاہر جون پوری کی خدمت میں دہلی پہنچے اور مسلسل تیس سال ان کی صحبت میں رہ کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہے اور ولایت کے اعلیٰ مدارج طے کر کے شیخ سے خلافت حاصل کی۔

(۱) نزہۃ الخواطر، ص ۲۶۵، ج ۲، تجلی نور، ص ۱۵، وفیات الاعلام، ص ۱۸۰۔

مولانا عبدالحی مرحوم نزہۃ الخواطر میں رقمطراز ہیں۔

ثم لازم الشيخ حسن بن الطاهر العباسي الجونپوري وصحبه ثلاثين

سنة واخذ عنه الطريقة (۱)

پھر وہ شیخ حسن بن طاہر عباسی جو نپوری کی خدمت میں جا پڑے اور پورے

تیس سال ان کی صحبت میں رہ کر راہ سلوک طے کی۔

شیخ حسن طاہر جو نپوری اپنے عہد کے مشاہیر علماء و مشائخ میں سے تھے۔ علوم باطنی

کے ساتھ علوم ظاہری کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ شیخ کو راجہ حامد شہ ماٹکپوری المتوفی ۹۰۱ھ

سے خلافت حاصل تھی۔ شیخ حامد فرماتے تھے کہ قیامت کے دن حسن مرے لیے حجت و دلیل

ہوں گے۔ سلطان سکندر پوری کی خواہش پر جون پور سے آگرہ پھر وہاں سے دلی تشریف لے

گئے اور وہیں بچے منڈل میں ۹۰۹ھ میں ہمیشہ کے لیے اقامت گزریں ہو گئے۔ (۲)

قاضی خاں کا مقام علماء کی نظر میں

مخدوم قاضی خاں کے تمام تذکرہ نگاران کی جلالت شان کا تذکرہ نہایت شاندار اور
پُر شوکت الفاظ میں کرتے ہیں۔ شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

”میاں قاضی خاں ظفر آبادی قدس سرہ مرید و خلیفہ شیخ حسن طاہر است از

جملہ صادقان ایں طریق است، صاحب استقامت و کرامت و حرمت

وزہد و تجرید، ولے بحسب زماں اگرچہ متاخر است لیکن بجمہت صفائی

معاملہ اعداد از متقدمان است۔ (۳)

قریب قریب انھیں خیالات کا اظہار مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی کیا ہے لکھتے ہیں:

”شیخ قاضی خاں ظفر آبادی قدس سرہ مرید و خلیفہ شیخ حسن طاہر است شیخ بود

صاحب استقامت و کرامت وزہد و ورع و تقویٰ و تجرید و تفرید (۴)

(۱) نزہۃ، ص ۲۶۵، ج ۲، اخبار الاخیار ص ۲۳۹۔

(۲) اخبار الاخیار ص ۲۰۱، تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۷، نزہۃ الخواطر ص ۸۹، ج ۲۔

(۳) اخبار الاخیار ص ۲۳۹۔ (۴) خزینۃ الاصفیاء ص۔

مولانا عبدالحی مرحوم ان الفاظ میں ان کی جلالت کا اعتراف کرتے ہیں:

”الشیخ العالم الصالح جلال الحق قاضی خاں بن یوسف الناصحی العمری

الظفر آبادی کان من کبار المشائخ الجشتیہ (۱)

صاحب تجلی نور رقم طراز ہیں:

حضرت بندگی جلال الحق در بزرگان متاخرین اہل چشت از بس نام آورد

صاحب زہد و توکل عبادت و ریاضت و اہل استقامت و کرامت بود حتی کہ

پیش ہنگام فرو شدن پسر خود عبدالعزیز را جہت تعلیم باطنی با تقویٰ نمود (۲)

سلوک کے مراحل طے کر لینے اور درجہ کمال حاصل ہو جانے کے بعد پیر و مرشد کی

اجازت سے وطن مالوف واپس تشریف لائے۔ ہر نوع کے شاہی عہدے اور مناصب کے

دروازے آپ پر کھلے تھے مگر سب سے کنارہ کش ہو کر درویشانہ زندگی اختیار کی اور دنیاوی

عزت و جاہ سے بے نیاز ہو کر درس و تدریس اور تصفیہ قلوب و تزکیہ نفوس میں مشغول ہو گئے۔

لیکن جب افلاس اور تنگدستی کی گرفت سخت ہو گئی اور اہل و عیال کی حالت فقر و فاقہ

سے بالکل خستہ تو قاضی صاحب کو بھی یک گونہ پریشانی لاحق ہوئی ناچار ایک عریضہ غربت

و تنگدستی کی شکایت میں شیخ کی خدمت میں ارسال کیا۔ شیخ حسن قدس سرہ نے جواب میں

تحریر فرمایا۔

بخدمت قاضی خاں ظفر آبادی چوں غم فرزند و اطفال و عیال و متعلقہ آں

درد ل بگذر و مضمون یک بیت را در خاطر تصور نمائند۔

از خدا خواہم وز غیر نخواہم بخدا

کہ نیم بندہ غیر و نخواہم دگر است

فرزند بندہ است خدا را تو غم خور تو بندہ ہستی نہ خداوند پروری اگر مفلس است گنج تو

کل برائے او کافی تو رنج ناحق و ناروا مبر۔ (۳)

(۱) نزہۃ الخواطر ص ۲۶۵، ج ۲۔ (۲) تجلی نور ص ۱۶۔

(۳) بیاض درویشیہ قلمی بحوالہ چراغ نور ص ۲۸

شیخ کے مکتوب سے قاضی خاں کی ساری پریشانی کا فور ہوگئی اور اطمینان و سکون حاصل ہو گیا اس کے بعد زندگی بھر نہ فقر و فاقہ کی شکایت لب پر آئی نہ کبھی خانقاہ سے باہر قدم نکالا۔

شان استغناء

مخدوم قاضی خاں کے مزاج میں حد درجہ قناعت و استغناء تھی۔ امراء و سلاطین کے دربار میں حاضری تو درکنار ان سے کسی قسم کا ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا بھی گوارا نہ تھا۔ ایک بار ہمایوں شاہ نے اپنے ایک امیر مرزا عسکری کو خدمت میں بھیجا کہ مخدوم جتنے مواضع کی خواہش کریں معاف کر دیے جائیں۔ مرزا عسکری کو باریابی نصیب نہ ہوئی اس لیے آپ کے چچا قاضی صدر الدین ناصحی کے ذریعہ بادشاہ کا پیغام پہنچایا۔ آپ نے ہمایوں شاہ کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور یہ قطعہ پڑھا۔

ما حرص و ہوا دو بندہ داریم با ہر دو برام بادشاہیم
تو بندہ بندگان ما ہستی از بندہ بندگان چہ خواہیم

ہمایوں شاہ کو جب اس بے نیازی اور شان استغناء کا علم ہوا تو اس کی عقیدت اور بڑھی خود آستانہ پر حاضر ہوا مگر قاضی خاں اس وقت خلوت کدہ میں تھے ملاقات نہ ہو سکی دوسرے دن صبح سویرے پھر حاضر ہوا مگر قاضی صاحب حسب معمول اس وقت طلبہ کے درس میں مشغول تھے۔ درس سے فراغت کے بعد ملاقات ہوئی، ہمایوں نے بحسب خواہش خود مواضع و قریات کی معافی کا فرمان پیش خدمت کیا۔ آپ نے فرمان واپس کر دیا اور فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ سے عہد کیا ہے

از خدا خواہیم وز غیر نخواہم بخدا کہ نیم بندہ غیر و نخواستہ دگر است

جاتے جاتے ہمایوں نے سادہ کاغذ پر مہر شاہی ثبت کر کے قاضی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کہ جتنے مواضع اور نقد کی خواہش ہو مخدوم اس پر تحریر فرمادیں آپ نے اسے بھی لوٹا دیا اور فرمایا کہ

”مارا احتیاجے نیست و بے احتیاج حق مسلماناں گرفتار نہ روانہ باشد“ (۱)
کہتے ہیں کہ جب مخدوم قاضی خاں نے اس گراں بہا نذرانہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ہمایوں نے ان کے بڑے صاحبزادے شیخ عبداللہ کی خدمت میں پیش کیا شیخ عبداللہ نے بھی رد کر دیا اور فرمایا:

پسر باید کہ بر متابعت پدر رد و چوں پدر ما قبول نکرد ناچار مارا نیز آں باید کرد
کہ ایشاں کردند (۲)

وفات

بالآخر علم و فضل اور رشد و ہدایت کے اس امام نے، تعلیم کتاب و حکمت اور تطہیر قلوب و انفس میں پوری زندگی گزار کر ۱۵ صفر ۹۴۴ھ کو جاں آفریں کے حوالہ کر دی۔ سید نور الدین زیدی ظفر آبادی نے تاریخ رحلت ان اشعار میں لکھی ہے۔

گل گلزار باغ لامکانی در دریائے عمان معانی
مئے شوق محبت نوش کردہ خمار جام وحدت ہوش بردہ
بملک فقر شاہنشاہ مسعود جلال الدین قاضی خاں محمود
ز مجوری بساط قرب جستند زد دنیا رفتہ خلد آباد کردند

چوں زیدی جست سال فوت قاضی

نداے فخر دیں کردہ منادی (۳)
۹۴۴

شیخ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار (۴) میں اور مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں سال وفات ۹۷۰ھ تحریر فرمایا ہے۔ صاحب تذکرہ علمائے ہند (۵) نے بھی اسی سن کو درج کیا ہے۔ ان حضرات کے برخلاف شیخ محمد یحییٰ خوب اللہ الہ آبادی المتوفی

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۳۹ و تجلی نور ص ۱۷، چراغ نور ص ۴۹، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶۔

(۲) اخبار الاخیار ص ۲۴۰ و تذکرہ علماء ہند ص ۱۶۶۔ (۳) چراغ نور ص ۵۰ و تجلی نور ص ۱۸۔

(۴) دیکھئے اخبار الاخیار ص ۲۴۰۔ (۵) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶۔

۱۱۴۳ھ نے وفیات الاعلام میں ۹۵۰ھ لکھا ہے (۱)۔ زیدی ظفر آبادی مخدوم قاضی خاں کی کرامات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ”میر علی عاشقان سرائے مری، شیخ اڈہن جو پوری، سید غیاث الدین درویش ظفر آبادی اور مخدوم جلال الحق قاضی خاں ظفر آبادی میں باہم مخلصانہ دوستی اور راہ و رسم تھی۔ ایک مرتبہ چاروں حضرات بیٹھے موت اور مابعد الموت کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے درمیان میں یہ بات آئی کہ ہم میں سے جس کی وفات پہلے ہو وہ اطلاع دے کہ وہاں سب سے زیادہ قدر کس عمل کی ہے۔“

خدا کا چاہا ایسا ہوا کہ ان حضرات میں سے پہلے قاضی خاں کی وفات ہوئی۔ وفات کے تیسرے دن تینوں حضرات قاضی خاں کے مزار پر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ”اکرم اذی و عدونی“ اسی وقت ہوا کا ایک بگولہ اٹھا اور قبر کے پاس ختم ہو گیا۔ ہوا کے ختم ہونے کے بعد دیکھا گیا تو کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا جس پر حافظ شیرازی کا یہ شعر قاضی خاں کے خط میں لکھا ہوا تھا۔

آنجا فنون شیخ نیرزد بنیم خس راحت بدل رساں کہ ہمیں راخرند ولس
سید میر علی عاشقان کی وفات حسب تصریح شیخ محمد عارف ۹۵۵ھ ہے۔ (۲) اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو قاضی صاحب کا سن وفات ۹۵۰ھ یا ۹۴۴ھ ہی صحیح ہوگا۔ شاید اسی وجہ سے مولانا عبدالحی مرحوم نے نزہۃ الخواطر ص ۲۶۵ میں انھیں دونوں تاریخوں کو نقل کیا ہے اور ۹۷۰ھ والی روایت کو نظر انداز کر دیا۔ واللہ اعلم

اولاد اور خلفاء

مبدأ فیاض نے حضرت قاضی کو علم و فضل اور زہد و ورع کی دولت جاودانی کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی شادمانی عطا فرمائی تھی۔ مناقب درویشیہ اور اخبار الاخیار سے معلوم

(۱) وفیات الاعلام ص ۱۸۰۔

(۲) رسالہ عاشقان ص ۳۲، رسالہ عاشقیہ کو شیخ محمد عارف نے میر علی عاشقان سرائے مری کے حالات میں قلمبند کیا ہے۔ شیخ علی عاشقان کے حالات میں اس سے زیادہ اہم اور مستند کوئی اور ماخذ نہیں ہے اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا نجم الدین اصلاحی دامت برکاتہم کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

ہوتا ہے کہ آپ کثیر الاولاد تھے مگر شیخ عبداللہ ناصحی کے علاوہ بقیہ اولاد کی تفصیل سے تمام تذکرے خالی ہیں۔

شیخ عبداللہ ناصحی

نام نامی آپ کا عبداللہ اور لقب جمال الحق ناصحی ہے۔ آپ مخدوم قاضی خاں کے پہلو ٹھے صاحبزادے ہیں۔ شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں ”شیخ عبداللہ اکبر اولاد او بود“ آپ بڑے صاحب حال بزرگ تھے۔ کبھی کبھی صحو و سلوک میں آجاتے ورنہ ہمیشہ جذب و مستی اور سکر کی کیفیت طاری رہتی۔ ریاضت و کرامت میں خاص شہرت کے مالک تھے اور بڑے مستجاب الدعوات، سیف زبان تھے۔ والد بزرگوار کی طرح دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز اور نذر و نیاز قبول کرنے سے محترز تھے۔

حضرت قاضی خاں کے بعد سجادہ مشینت پر رونق افروز ہوئے اور والد محترم کی صحیح جانشینی فرمائی۔ ۱۰۰۱ھ میں وفات ہوئی اسم گرامی ”شیخ عبداللہ“ سے سن وفات نکلتا ہے (۱) حضرت قاضی خاں کے متوسلین اور خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ان میں دو بزرگوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی بغرض اختصار انھیں دو کے حالات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی

آپ شیخ حسن بن طاہر جو پوری کے فرزند ارجمند تھے۔ ۸۹۸ھ میں جو پور میں پیدا ہوئے ڈیڑھ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ دہلی آگئے پھر وفات تک یہیں رہے۔ شیخ عبدالعزیز شریعت و طریقت دونوں کے جامع تھے۔ علوم باطنی کی تکمیل حضرت قاضی خاں کے زیر تربیت کی، شیخ حسن بن طاہر نے وفات کے وقت انھیں قاضی خاں کے سپرد کر دیا تھا۔ چنانچہ والد کی وفات کے بعد یہ ظفر آباد آئے اور طویل مدت تک یہاں مقیم رہ کر عبادت و ریاضت اور کسب سعادت میں مشغول رہے اور سلوک کی منزلیں طے کر کے

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۳۰ و تاریخ شیراز ہند ص ۹۹۲۔

قاضی خاں سے خرقہ خلافت حاصل کیا پھر دہلی آکر مسند ارشاد کوزینت بخشی۔ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں آپ سے بڑا فیض ہوا اس عہد میں آپ کا کوئی ہمسر اور مثیل نہ تھا۔ شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

اور ادروا وضع و حلم و صبر و رضا و تسلیم و شفقت بر خلق و رعایت و نقر نظیر نبود و در زمان خود یا گار مشائخ چشت بود گرد دہلی بوجود و سلسلہ ارشاد مشیخت برپا بود (۱)

ان کے تقدس، حلم اور تواضع نے انہیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ سلسلہ چشتیہ کی دیرینہ روایات اس تاریک دور میں پھر ایک بار ان کے ذریعہ زندہ ہونے لگی تھیں۔ عوام و خواص سب ہی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ بیرم خاں خانان خاص طور سے معتقد تھا۔

۶ جمادی الاخریٰ ۹۷۵ھ میں آیت ”فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون“ کے سماع پر بحالت وجد محبوب حقیقی سے جا ملے۔ ”یادگار چشت“ سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ (۲)

شاہ مسعود خلوتی

یہ بزرگ بھی حضرت قاضی خاں کے ارشد خلفاء میں ہیں۔ بیعت کے بعد ذکر و شغل کی غرض سے بارہ سال تک عوام الناس سے بالکل منقطع ہو کر ذکر و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہے اسی وجہ سے ”شاہ خلوتی“ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ عزلت گزین اور تنہائی پسند تھے۔ عوام سے اختلاط بالکل پسند نہ کرتے۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر شب و روز ذکر الہی اور یاد ربانی میں محو رہتے۔ بلا کسی شدید ضرورت کے بات نہ کرتے ہمیشہ ایک جوڑا کپڑا رکھتے۔ ازدواجی جھمیوں سے بھی تاحیات الگ رہے۔ ۹۸۴ھ میں بعد اکبر شاہ انتقال فرمایا۔ مزار محلہ ناصحی ظفر آباد میں موضع رام داس پور کے متصل اب بھی موجود ہے۔ (۳)

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۸۸ - چراغ نور ص ۱۰۵، تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۶، اخبار الاخیار ص ۲۸۸۔

(۳) تاریخ شیراز ہند ص ۹۹۵ و چراغ نور ص ۱۰۶۔

سید محمد جوینپوری اور تحریک مہدویت

سید محمد جوینپوری کی ذات نویں صدی ہجری سے آج تک اہل علم کے حلقہ میں محل بحث و اختلاف چلی آرہی ہے ایک جماعت انہیں صاحب مقامات اور کشف و کرامات کا حامل سمجھتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ متقی پرہیزگار ضرور تھے لیکن دعوائے مہدویت میں غلطی پر تھے۔ ایک تیسری جماعت ہے جس کا خیال یہ ہے کہ وہ زاہد و متقی بالکل نہیں تھے بلکہ ایک جدید مذہب کے بانی تھے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے حالات کا جائزہ ان کے معاصرین اور دیگر محقق مورخین کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں لیا جائے تاکہ صحیح نتیجہ پر پہنچا جاسکے اور اس مشہور روزگار ہستی کے سلسلے میں درست معلومات حاصل ہوں۔

تاریخ ولادت اور نام و نسب

محمد نام، اسد العلماء، خاتم الاولیا اور نور بخش القاب ہیں۔ سلسلہ نسب یہ ہے: سید محمد بن سید عبداللہ بن عثمان بن موسیٰ بن قاسم بن نجم الدین بن عبداللہ بن یوسف بن یحییٰ بن نعمت اللہ بن اسمعیل بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن باقر بن زین العابدین بن سیدنا حسین بن امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔

۱۴ جمادی الاولیٰ ۸۴۷ھ/۱۴۱۳ء میں بزمانہ سلطنت ابراہیم شاہ شرقی شہر جوینپور

میں پیدا ہوئے۔ (۱)

تعلیم و تربیت اور ابتدائی حالات

عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو خاندانی روایت کے مطابق تعلیم و تحصیل کا سلسلہ

(۱) مقدمہ ترجمہ رسالہ مناقب۔

شروع کیا اور استاذ کے لئے جو پور کے مشہور عالم اور بزرگ ترین صوفی شیخ دانیال کا انتخاب ہوا سات سال کی قلیل عمر میں قرآن حکیم کے حفظ سے فراغت ہوگئی اور بارہ برس کی عمر میں علوم و فنون رسمیہ سے فارغ التحصیل ہو گئے مطالعہ کی کثرت، معلومات کی وسعت اور بحث و مباحثہ کے وقت انتقال ذہنی کو دیکھ کر بڑے بڑے اہل علم متحیر ہو جاتے تھے انھیں اوصاف کے تحت اس عہد کے علماء نے آپ کو اسد العلماء کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔ (۱)

علوم رسمیہ سے فارغ ہونے کے بعد شیخ دانیال کی صحبت میں رہ کر تربیت علوم باطنی کی بھی تکمیل کی اور انھیں سے خرقہ خلاف حاصل کیا۔ (۲)

۸۶۲ھ میں شاہ حسین شرتی نے اڑیسہ پر فوج کشی کی۔ ترہٹ کاراجہ دلپت راؤ مقابلہ میں آیا جسے شاہ حسین نے پہلے ہی حملہ میں پسپا کر دیا بالآخر معاملہ ادائیگی خراج پر ختم ہوا۔ لیکن واپسی کے بعد دلپت راؤ نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور خراج کی رقم روک لی جس کے نتیجے میں شاہ حسین نے ۸۶۳ھ میں اس پر دوبارہ حملہ کیا اس جنگ میں سید محمد نے بھی بہ نیت جہاد شرکت کی اور دلپت راؤ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے کامیابی کے ساتھ واپس آئے اس وقت آپ کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

شیخ دانیال کی صحبت کے اثر سے تصوف کا چسکا پہلے لگ ہی چکا تھا اور اس راہ کی منزلیں طے کر کے خلافت بھی پا چکے تھے مگر جنگ کی شرکت نے دنیا کی بے ثباتی کا ایسا نقشہ سامنے کر دیا کہ ماسویٰ اللہ سے بے نیازی اور تعلق مع اللہ کی حالت جذب کے درجہ تک پہنچ گئی اور سات سال تک بے حد استغراق رہا اور پانچ برس تک صحو و سکر کی ملی جلی کیفیت طاری رہی اور اسی عالم میں وطن عزیز کو خیر باد کہہ کر راہ غربت اختیار کر لی۔

جو پور سے ہجرت

۸۸۷ھ میں جو پور سے روانہ ہو کر عظیم آباد کے جنگلات میں اقامت پذیر ہو گئے

(۱) گلشن زار بحوالہ مقدمہ رسالہ مناقب۔ (۲) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۶۷۔

اس سفر میں آپ کی زوجہ محترمہ اور بڑے صاحبزادے سید محمود کے علاوہ اور دوسرے طالبان بھی ہمراہ تھے۔ کچھ دنوں یہاں قیام کرنے کے بعد چندیری گئے اور وہاں سے مالوہ کے پایہ تخت مانڈو میں رونق افروز ہوئے۔ مالوہ کا حکمران علاء الدین خلجی متونی ۹۰۵ھ نے جب آپ کے پاکیزہ اخلاق اور اتباع سنت نبوی کا چرچا سنا تو آپ کا گرویدہ ہو گیا یہاں آپ کے مواعظ حسنہ سے ہزاروں ہدایت یاب ہوئے مانڈو سے کوچ کر کے ۸۸۸ھ میں گجرات تشریف لائے اور تقریباً ڈیڑھ سال یہاں مقیم رہ کر خلق خدا کی اصلاح و تربیت میں مشغول رہے اسی مقام پر آپ کی زوجہ کا ۸۹۰ھ میں انتقال ہو گیا اس زمانہ میں گجرات فتح نہیں ہوا تھا مگر سلطان محمود بیگڑھ اس کا محاصرہ کئے تھا۔ سلطان محمود کو آپ کے ورع تقویٰ اور پسندیدہ اخلاق کی خبر پہنچی تو آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن امرائے سلطنت نے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سید صاحب کی صحبت سے سلطان متاثر ہو کر ترک حکومت کر بیٹھے تو پھر گجرات کی مہم یونہی ناتمام رہ جائے گی۔ سلطان کو کسی طرح سے سید صاحب کی مجلس میں آنے سے باز رکھا اسلئے سلطان محمود بیگڑھ اس مبارک صحبت سے محروم رہ گیا مگر اسی جگہ جالور کا تاجدار زبدۃ الملک عثمان خاں شرف ملاقات سے بہرہ اندوز ہو کر عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا ۸۹۰ھ میں گجرات سے روانہ ہو کر خاندیش کے دارالسلطنت برہان پور پہنچے پھر وہاں سے دولت آباد ہوتے ہوئے احمد نگر میں اقامت گزریں ہوئے چندے قیام کرنے کے بعد یہاں سے بیدر شریف کا قصد کیا بیدر کا حاکم قاسم بیدر آپ کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گیا بیدر سے کوچ کر کے گلبرگہ پہنچے یہاں آپ کے پند و نصائح سے بے شمار لوگ ہدایت یاب ہوئے گلبرگہ سے بندر ڈابھیل آئے اور یہاں سے بذریعہ جہاز مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

۸۹۱ھ میں زیارت حرمین سے فیضیاب ہو کر براہ جدہ کھمبائٹ واپس آئے پھر احمد آباد تشریف لے گئے اور شہر سے باہر تاج خاں سالار کی مسجد میں فروکش ہوئے یہاں آپ کے زہد و تقویٰ اور اخلاق حمیدہ کا بے حد چرچا ہوا اور ایک کثیر تعداد آپ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوئی۔ احمد آباد کے مشہور بزرگ حضرت سید جلال الدین عرف شیخ

جیو کو جب آپ کے اوصاف و کمالات کی اطلاع پہنچی تو ملاقات کے لئے خود حاضر ہوئے۔ سید صاحب نے دوسری اور تیسری آیات پڑھیں شیخ جیو نے ان کا جواب بھی قرآن ہی سے دیا اور اس کے بعد وہاں سے رخصت ہوئے راہ میں کسی نے ان سے سید صاحب کے بارے میں معلومات چاہی تو فرمایا مرد صاحب حال ہے خواص کی باتیں عوام سے کہتا ہے۔ اور کلموا علی قدر عقولہم کی رعایت نہیں کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے بعد اس کے مقلدین غلط فہمی میں مبتلا ہو کر فتنہ کھڑا کر دیں گے۔

احمد آباد کے قیام کے زمانہ میں سید صاحب نے ایک دن یہ فرمایا کہ میں اس دنیا میں انھیں مادی آنکھوں سے خدا دکھا سکتا ہوں اس بات سے اہل علم کے حلقہ میں ایک قسم کا اضطراب پیدا ہو گیا اور علماء جو سید صاحب کے اثر و رسوخ اور روز افزوں ترقی سے پریشان تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن کے خلاف (لا یدرکہ الابصار) کا دعویٰ کرنے والے کے قتل کا فتویٰ تیار کر دیا۔

مولانا تاج محمد نے جو اپنے وقت کے بڑے مشہور عالم تھے لوگوں کو اس قسم کی جرأت سے روکا بالخصوص اپنے شاگردوں کو جن کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھ سے علم اسی لئے حاصل کیا تھا کہ اس کے ذریعہ سادات کے قتل کا فتویٰ دیا کرو۔

مولانا تاج محمد کی بروقت ترجمانی سے حکام سلطنت نے کسی قسم کی پیش دستی نہیں کی لیکن علماء سوء کی شورش برابر جاری رہی اس لئے سید صاحب فتنہ کے خیال سے ۹۰۳ھ میں احمد آباد سے سائنج چلے آئے اور یہاں سے نہروالا (پٹن) منتقل ہو گئے جہاں خان سرور کے تالاب کو قیام کے لئے انتخاب کیا۔

سید صاحب کا یہ عام دستور تھا کہ قیام کے لئے شہری زندگی سے الگ کسی مسجد تالاب یا کھلی جگہ کو منتخب کرتے تھے جہاں آپ کا قیام ہوتا تھا اس کو آپ کے معتقدین دائرہ کہتے تھے۔ اس کی تصریح نہیں ملتی کہ دائرہ کی اصطلاح سید صاحب کی زندگی ہی میں رائج ہو گئی تھی یا ان کی وفات کے بعد اس کا رواج ہوا۔

دائرہ کا اپنا خاص معاشرتی نظام ہوتا تھا۔ جس میں سب ایک گھر کے افراد کی طرح

مل جل کر رہتے تھے۔ محنت و مزدوری سے جو کچھ دستیاب ہوتا اس کا دسواں حصہ خدا کی راہ میں صرف کر دیتے باقی کو آپس میں برابر تقسیم کر کے کھاتے تھے۔ صبر و قناعت کا یہ حال تھا کہ کئی دنوں تک کھانے کو کچھ نہ ملتا مگر دلوں کی فراغت اور چہروں کی بشاشت سے یہ گمان ہوتا کہ ابھی شکم سیر ہو کر آ رہے ہیں۔

طبقات اکبری میں ہے۔

اگر کشت یا زراعت و تجارت می کردہ دہ یک در راہ خدا صرف می نمود پس ہم چنان شدہ کہ پدر از پسرو زن از شوہر مفارقت گزیدہ راہ فقر و فنا پیش گرفتند و فتوح کہ بادی آمد خرد و کلاں علی السویہ شریک بودند و اگر چیزے بہم نمی رسد تا در سہ روز بہ فاقہ می گزرا بند و اظہار نمی نمود (۱)

اگر کھیتی باڑی زراعت یا تجارت کرتے تو آمدنی کا دسواں حصہ خدا کے راستے میں صرف کر دیتے یہ لوگ آپس میں ایسے رہتے کہ تمام رشتوں کو چھوڑ کر فقر و فاقہ کو اپنا سب کچھ بنا لیا تھا۔ سید مہدی کو فتوحات سے جو کچھ حاصل ہوتا سب لوگوں پر برابر تقسیم کر دیتے اور اگر دو تین دن تک فاقہ کی نوبت آتی تو اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

اسی قسم کے حالات ملا عبدالقادر بدایونی اور عبدالباقی نہادندی نے بھی تحریر کئے ہیں (۲) ہندوستان کی عام تاریخوں میں مذکور ہے کہ بزمانہ قیام بڑی ۹۰۵ھ میں آپ نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ لیکن اس کے برخلاف مہدوی تاریخوں میں ہے کہ آپ نے جب جوینپور سے ہجرت کر کے عظیم آباد کے جنگل کو اقامت گاہ بنایا تو پہلی دفعہ آپ کو الہام ہوا کہ تم مہدی ہو اس کے بعد جب حج کو تشریف لے گئے تو رکن اور مقام کے درمیان کھڑے ہو کر مہدی ہونے کا دعویٰ کیا پھر ۹۰۳ھ میں احمد آباد میں مکرر دعویٰ مہدویت کیا اور جب بڑی پہنچے تو چھ ماہ کے بعد ۹۰۵ھ میں مؤکد طور پر علی الاعلان

(۱) طبقات اکبری ص ۲۳۷۔

(۲) منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۹۸ و ماثر جیبی ج ۱ ص ۶۳۰۔

مہدویت کا اظہار کیا۔ (۱) لیکن مہدوی تاریخوں کی اس روایت کی تائید ہندوستان کی عام تاریخوں سے نہیں ہوتی بلکہ جس مورخ نے بھی مہدویت کے ادعا کا تذکرہ کیا ہے اس نے تصریح کی ہے کہ جب آپ نہر والا سے بڑی گئے ہیں تو مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور یہی صحیح بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کا چرچا بڑی ہی سے شروع ہوا اس سے پہلے کی زندگی میں آپ کے متعلق مسلمانوں کے عام عقائد کے خلاف کوئی بات نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں جہاں پہنچے لوگ ان کے زہد و تقویٰ، فقر و رویشی کو دیکھ کر ان کے گرویدہ ہو گئے کسی جگہ مخالفت نہیں کی گئی۔ اگر مسلمانوں کے عقائد کے خلاف کچھ بیان ہوتا تو اس کا ذکر تاریخوں میں ضرور آتا خاص کر مخالفین تو کبھی بھی معاف نہ کرتے حالانکہ تاریخوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے آپ کی مخالفت احمد آباد میں رویت باری تعالیٰ کے مسئلے میں کی گئی اس کے علاوہ یہ امر بھی نہایت اہم ہے کہ اگر آپ حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں مہدویت کا اعلان کئے ہوتے تو تمام دنیائے اسلام میں ایک شور برپا ہوتا اور علمائے مکہ معظمہ سے اسی وقت بحث و مناظرہ شروع ہو گیا ہوتا مگر کسی تاریخ سے بھی اس قسم کی کسی بات کا سراغ نہیں ملتا جو سراسر عقل کے خلاف ہے۔ (۲)

بڑی میں آپ کا قیام کل چھ ماہ رہا اور اعلان مہدویت کے بعد یہاں علماء اور عوام کی مخالفت حد سے بڑھ گئی اس لئے اسکو چھوڑ کر دھراؤ چلے آئے اور یہاں سے جالور پہنچے اور چار ماہ قیام کرنے کے بعد ۹۰۶ھ میں مارواڑ تشریف لے گئے پھر وہاں سے جیسلمیر ہوتے ہوئے نصر پور کاہہ میں رونق افروز ہوئے۔ رمضان کا اکثر مہینہ اسی جگہ گزار کر ۲۷ ماہ مذکورہ کو نوسو مخلصین کی جماعت کے ساتھ خراسان کی جانب روانہ ہو گئے اور ۹۱۰ھ میں مقام فرخ میں پہنچ کر اقامت گزین ہوئے۔ اسی جگہ ۱۹ رذی قعدہ ۹۱۰ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۵۰۵ء کو آپ نے دق کے عارضہ میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔

آپ کے صاحبزادے سید محمود نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مقام رنج و فرخ کے

(۱) تاریخ پالں پورج ص ۷۰ تا ۷۵۔

(۲) مقدمہ رسالہ مناقب اردو ص ۵۸۔

درمیان مدفون ہوئے عشق تم سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ (۱)

سید صاحب کی تعلیمات اور ان کا اثر

نویں صدی کا زمانہ جو اکبر سے پہلے گذرا ہندوستان میں طوائف الملوکی کا زمانہ تھا روز روز حکومتیں بنتی اور بگڑتی تھیں کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں تھی جو احکام شرع کے اجراء کی ذمہ دار ہوتی مزید برآں علمائے حقانی بہت تھوڑے تھے اور علمائے دنیاہر طرف پھیلے ہوئے تھے دنیا طلبی اور مکرو فریب کی گرم بازاری تھی اس پر طرہ یہ تھا کہ جاہل صوفیوں کی بدعات و منکرات نے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا ایسے حال میں سید موصوف نے احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کیا۔ (۲)

آپ نے دنیا طلبی، بدعات و منکرات اور گمراہی سے بچانے کیلئے اپنی تعلیمات اور دعوت و تذکیر کے آٹھ اصول مرتب کئے تھے۔ (۱) ترک دنیا (۲) صحبت صادقین (۳) عزلت از خلق (۴) توکل (۵) طلب دیدار حق (۶) عمشتر (۷) ذکر کثیر (۸) ہجرت۔

انہوں نے اپنے مشن کو تقلیل دنیا کی بنیاد پر شروع کیا تھا آپ کا ارشاد تھا کہ دنیا محض کھیتی کی جگہ ہے اسے اپنی منزل نہ بناؤ اس سے زاد راہ لو گمراہ اس سے چمٹ نہ جاؤ اس سے فائدہ حاصل کرو مگر اس کو اپنے اوپر مسلط نہ کرو۔ سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی آپ کے اصول کے قطعاً خلاف تھی آپ فرماتے تھے کہ مؤمن ذخیرہ نہ کند (۳) آپ کی تعلیمات کا اثر بقول مولانا آزاد یہ ہوا۔

عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اور متعدد سلاطین وقت نے بیعت کی۔ (۴)

(۱) ایضاً ص ۶۰۔ (۲) تذکیر ص ۴۷۔

(۳) مقدمہ سراج الاخبار ص ۲۰۳-۱۹۶۔

(۴) تذکرہ ص ۴۶۔

آپ کے متوسلین کی زندگی کا نقشہ مولانا آزاد نے اس طرح پیش کیا ہے۔ ان لوگوں کے طور طریق عجیب عاشقانہ والہانہ تھے اور ایسے کہ صحابہ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشق الہی کی ایک جاں نثار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن وزمین کی فانی الفتوں کو ایمان و محبت کے رشتے پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن گئے تھے۔ امیر فقیر اعلیٰ و ادنیٰ سب ایک رنگ میں رہتے اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکام شرع کے اجراء و قیام کے اور کسی سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔ (۱)

سید صاحب کے متعلق علماء کی رائے

زمانہ حال و ماضی کے سبھی مورخین اور سوانح نویس خواہ موافق ہوں یا مخالف معترف ہیں کہ سید محمد علوم رسمہ کے ساتھ زہد و تقویٰ اور فقر و رویشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ شیخ علی متقی متوفی ۱۰۷۵ھ جو سید صاحب کے معاصر اور شدید مخالف تھے جنہوں نے سید صاحب کی تردید میں چند رسالے بھی تحریر کئے ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ابتدائی عہد کمال زہد و تقویٰ اور استغراق اور استہلاک میں گذرا۔ (۲)

ملا عبدالقادر بدایونی متوفی ۱۰۰۴ھ نے سید صاحب کے کمالات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

اِس مرد آیت است از آیات خدا و نیز در ولایت و جلالت و بزرگی محتاج سخن نیست (۳)

(یہ شخص اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور حالات و ولایت و بزرگی

(۱) تذکرہ ص ۴۶۔

(۲) دربار اکبری ص ۸۲۴۔

(۳) نجات الرشید ص ۹۳۹۔

میں محتاج تعریف نہیں)۔

شیخ عبدالغنی شطاری بن شیخ عبداللہ شطاری متوفی ۱۰۴۰ھ تحریر فرماتے ہیں: میر سید محمد جو پوری رحمۃ اللہ مردی خالی از فضیلت نبودہ و از اکابران جو پور بودند در احمد آباد متوطن شدہ بودند در شاہ پور پیر و ن قلعہ احمد آباد مسجدی بودہ و عقب آں مسجد منزل داشتہ مردی نورانی و مرتاض بودہ، ہمیشہ مشغول بود و متوکل و ہرگز از خانہ خود بدر نیامدہ و بخانہ ارباب دولت زرفتہ و بر فقر و فاقہ عمر خود بکمال عشرت و شادمانی گذرانید (۱)

(میر سید محمد جو پوری صاحب فضل و کمال اور اکابرین جو پور میں تھے احمد آباد میں شہر سے باہر ایک مسجد تھی اسکے پشت کی جانب ایک مکان میں اقامت گزریں تھے نہایت مرتاض اور نورانی بزرگ تھے ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے صفت توکل کے سات متصف تھے کبھی گھر سے باہر نہ نکلتے اور امراء کے یہاں حاضری نہ دیتے تھے فقر و فاقہ کی حالت میں نہایت مسرت و شادمانی کے ساتھ عمر گزار دی)۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ اپنے ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں۔ ہر کمالے کہ محمد رسول اللہ داشت در سید محمد مہدی نیز بود فرق ہمیں است کہ آنجا باصالت بود و اینجا بہ جمعیت رسول بجائے اور سیدہ کہ بچوں او شد فقط (۲)

(ہر وہ کمال جو محمد..... رکھتے تھے (بجز وحی اور رسالت کے) سید محمد اسکے حامل تھے فرق یہ ہے کہ وہاں اصل تھا اور سید نے ان کی اتباع کی بدولت اس کے مثل حاصل کیا)۔

ابوالفضل المتوفی ۱۰۱۱ھ آئین اکبری میں لکھتا ہے۔

سید محمد جو پوری سید بدھ اویسی است از افراداں روحانیہ فیض برگرفتہ و برصوری و معنوی علم چیرہ دست از شوریدگی دعویٰ مہدویت کرد بسیارے مردم بردگردد و بسا خارق از و برگزارند۔ (۳)

(۱) تذکرۃ الاولیاء قلمی نسخہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ص ۱۴۸۔

(۲) دربار اکبری ص ۸۲۴۔ (۳) بحوالہ دربار اکبری ص ۸۲۲۔

(سید محمد جوپوری (سید بدھ) مادرزاد ولی ہیں بے انتہا فیوض و برکات کے حامل تھے علوم ظاہری و باطنی میں مہارت تامہ رکھتے تھے شوریدگی حال میں دعوائے مہدویت کیا۔ ان کے بہت سے ماننے والے ہیں اور بہت سی کرامتیں ان کی جانب منسوب ہیں) تحفہ الکریم میں ہے۔

ایشاں سلالة الاولیا الکریم واسوة النجباء العظام سید نور بخش کہ از سلسلہ کبرویہ علم فاخرت می افراختند - صاحب تصانیف و کشف و کرامات در تصوف تصرف از اہل مقامات بودہ در اصل منشاء شریفش در بلدہ جوپور الخ (۱)

مولانا آزاد تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ مولانا جمال الدین دہلوی نے سید محمد کی ولایت کے اثبات میں ایک کتاب لکھی اور دلائل و شواہد قاطعہ سے ثابت کیا کہ حضرت سید محمد کی ولایت حق ہے۔ (۲)

مندرجہ بالا علماء و مورخین کے علاوہ میاں حاتم سنبھلی، شیخ وجیہ الدین گجراتی ابن حجر مکی وغیرہ علماء سید صاحب کو عالم حق اور واصل باللہ تسلیم کرتے ہیں۔

دعوائے مہدویت پر ایک نظر

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نویں صدی ہجری میں بہ چند وجوہ مہدی موعود کا چرچہ عام تھا سر زمین ہند سے عالم اسلام تک ان کے ظہور کے بارے میں انوہ پھیلی ہوئی تھی۔ اس عہد کے علماء و مشائخ کی محفلیں مہدی موعود کے ذکر سے گرم رہتی تھیں اس زمانے کے لگ بھگ ابن حجر نے ان احادیث کی خوب ترویج و تشریح کی جن میں مہدی موعود سے متعلق پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح حضرت سید اشرف سمنانی جو اپنے دور کے بلند پایا عالم اور صوفی تھے۔ ان کی محفلوں میں بھی مہدی آخر الزماں کی آمد سے متعلق احادیث کا خوب چرچا تھا۔ (۳)

(۱) تحفہ الکریم ج ۱ ص ۲۵۰۔ (۲) تذکرہ ص ۳۲۔

(۳) لطائف اشرفی ص ۲۴۔

اس عہد کے قریب علماء حرمین نے بھی ایک فتویٰ شائع کیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ ہجرت نبوی کے ہزار سال پورے ہونے تک مہدی موعود کا ظہور ہو جائے گا۔ (۱)

اسی دور میں جب کہ مہدی موعود کے ذکر سے عوام کے ذہن و دماغ بالکل معمور تھے۔ حضرت سید محمد جوپوری نے اپنی تحریک دعوت و اصلاح کا آغاز کیا مقصد کی لگن اور اس کی سچائی کے یقین نے اس تحریک میں غیر معمولی قوت پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی تحریک کا غلغلہ جوپور سے گزر کر پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ اور بے شمار خلق اللہ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئی جس میں عالم جاہل، امیر غریب رعایا اور بادشاہ ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ سید صاحب کی حیات تک اس جماعت کے افراد نہایت پاک باطن اور خدا پرست تھے اور کسی قسم کی بدعت یا کوئی نیا عقیدہ ان میں رائج نہیں تھا۔ لیکن سید صاحب کی وفات کے بعد اس جماعت کے عقائد میں تبدیلی آ گئی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اس عہد میں مہدی کا چرچا عوام و خواص سب کی زبانوں پر تھا۔ اس لیے سید صاحب کے وفات پاتے ہی ان کے جاہل عقیدت مندوں نے اس عقیدے کا کھلے بندوں اعلان شروع کر دیا کہ سید محمد جوپوری ہی مہدی موعود تھے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت سید نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا اور اگر عالم سکر میں یہ الفاظ کبھی آپ کی زبان پر آ گئے تھے تو حالت صحو میں اس کی تردید کر دی جیسا کہ بہت سی تاریخوں سے ثابت ہے۔

خزینۃ الاصفیاء میں ہے۔

سید محمد مہدی جوپوری قدس سرہ پردی یوسف و اصلش از جوپور مرید و خلیفہ شیخ دانیال و از اولیائے مغلوب الحال و صاحب سکر بود در حالت سکر۔ چنانچہ بعضے اکابر ان اللہ وانا الحق و سبحانی و امثال آں گفتہ اند اولفظ مہدی بر زبان آورد و اما در حالت صحو مثل دیگر بزرگان از دعویٰ مہدویت تائب شد بہ مہدی موعود اقرار نمود اما مردم جہلا کہ در زمان سکر حاضر بودند معاودت اور

(۱) بدایونی ص ۳۸۔

اعتبار نہ کردہ برہن اول او اصرار نمودہ اور امہدی موعود دانستند و در چاہ
ضالالت و بطالت افتادند۔ (۱)

(حضرت سید محمد کے والد یوسف ہیں۔ جو پنپور کے رہنے والے تھے۔ شیخ دانیال
کے خلیفہ تھے۔ جو پنپور کے اولیائے کبار میں سے تھے وہ اکثر حالت سکر میں رہتے تھے۔
چنانچہ جس طرح بعضے اکابرین نے غلبہ حال میں انا اللہ اور انا الحق وغیرہ کہہ دیا اسی طرح
سے انھوں نے انا مہدی کا نعرہ لگایا مگر جب افاقہ ہوا تو اس کی تردید کی اور مہدی موعود کا
اقرار کیا مگر ان جہلانے جو اس وقت مجلس میں تھے ان کے غلبہ حال کے قول ہی کو اصل
قرار دیا اور ان کو مہدی موعود کہنے لگے اور گراہی میں پھنس گئے۔)
صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں۔

مریدانش محمد مہدی آخر الزماں نشان خوانند و اعتقاد نمودند کہ مہدی موعود گویند
در آخر الزماں جلوہ ظہور نمود ہمیں محمد است چنانچہ ایں عقیدہ در مزاج ایشان
را سخ گشتہ و حالانکہ مرشد بایں معنی امر نکرده ایں بدعت مخترع مریدانش (۲)
(ان کے مریدین انھیں مہدی آخر الزماں کہتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو
مہدی آخری زمانہ میں آنے والے تھے وہ یہی سید محمد ہیں۔ چنانچہ یہ عقیدہ ان لوگوں
میں پختہ ہو گیا ہے حالانکہ ان کے مرشد نے اس امر کا انہیں حکم دیا تھا بلکہ یہ بدعت سراسر
مریدوں کی گڑھی ہوئی ہے۔)

اسی کے قریب قریب مرآة احمدی کے خاتمے میں بھی ہے۔ (۳)

تحریر مہدویت کے بارے میں مولانا آزاد کا خیال ہے:

یہ فرقہ سید محمد جو پنپوری کی طرف منسوب ہے جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے
کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے عقائد میں

بہت سی نئی باتیں اور حد غلو سے بھی گذرے ہوئے اعتقادات شامل ہو گئے،
لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت و حق پرستی پر پڑی تھی یعنی دعوت
و تبلیغ حق و احیائے شریعت و قیام امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا مقصد
اصلی تھا اور خود سید اور ان کے پیروں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ
بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست تھے اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتدا میں
کچھ ہوتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں اور فتنہ غلو و تاویل
بچھلی امتوں کی طرح اس امت کی ہر جماعت کے لئے بھی ایک بڑا فتنہ
ہے یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی
صداقت اخلاف کے غلو و محدثات میں گم ہو گئی۔ (۱)

سید محمد جو پنپوری کے سوانح اور تعلیمات کے مطالعہ سے مجھ پر جو اثر ہوا اس
سے میں نے رائے قائم کی کہ وہ اپنے وقت کے بہترین انسان قابل ترین
عالم اور کامل ترین صوفی تھے جنکی ساری زندگی تعمیل احکام الہی اور اتباع
رسول اللہ..... میں صرف ہوئی ایسے شخص نے دعویٰ مہدویت کیا ہو مجھے
یقین نہیں آتا اور کسی وقت حالت غلبہ میں مہدی ہونے کا اعادہ کیا ہو تو اس
کو سہو پر اطلاق کرنا چاہیے جیسا کہ علی متقی نے فرمایا کہ ولی سے بھی ایسی غلطی
ہو جاتی ہے اور الہام میں غیر انبیاء سے سہو ممکن ہے بلکہ غالب گمان یہ ہے
کہ آپ کی وفات کے بعد ان کے مقلدوں نے ان کی طرف یہ دعویٰ
منسوب کر کے تمام عقائد سے زیادہ اس پر زور دیا اور اسی پر زیادہ اصرار
کرتے رہے۔ (۲)

☆ ☆ ☆

(۱) تذکرہ ص ۴۷۔

(۲) مقدمہ رسالہ مناقب ص ۶۴۔

(۱) خزینۃ الاصفیاء ص ۴۷۔

(۲) تحفۃ الکرام ج ۱ ص ۴۵۔

(۳) مرآة احمدی ص ۶۷۔

اُستادُ الملک ملا محمد افضل جو پوری

شرقی عہد ۸۰۴ھ سے مغل بادشاہ محمد شاہ ۱۱۳۱ھ کے زمانہ تک جو پور دیار یورپ میں علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ مصر و شام اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں یہاں کے علماء نے اسلامی علوم و فنون پر کم کام نہیں کیا ہے۔ (آثار الکرام ج ۱ ص ۲۲۲)

جو پور کی تاریخ میں پچاسوں مدرسوں اور خانقاہوں کا پتہ چلتا ہے جن میں ہزاروں طلباء و فضلاء علمی و روحانی مشغلہ میں مصروف رہتے تھے۔ ذیل میں یہاں کے مشاہیر علماء و مشائخ کی مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے ناظرین کو اس کی مرکزیت کا کسی حد تک اندازہ ہوگا۔

عہد شرقی کے مشاہیر

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی جو پوری المتوفی ۸۴۸ھ (۲) قاضی نظام الدین کیرکلائی جو پوری مرتب فتاویٰ ابراہیم شاہیہ المتوفی ۸۷۵ھ (۳) شیخ ابوالفتح سون بریس جو پوری المتوفی ۸۵۸ھ (۴) ملا پیرام منطقی خطیب جامع مسجد ظفر آباد (۵) قاضی نصیر الدین گنبدی قاضی شہر جو پور (۶) شیخ عیسیٰ بن تاج الدین جو پوری المتوفی ۸۴۰ھ (۷) ملا عبدالملک بن عادل جو پوری استاذ ملا الہ داد۔

عہد لودھی کے مشاہیر

ملا علاء الدین الہ داد محشی ہدایہ وغیرہ المتوفی ۹۲۳ھ (۲) شیخ حسن بن طاہر جو پوری (۳) شیخ سید محمد جو پوری المتوفی ۹۱۰ھ (۴) شیخ معروف چشتی جو پوری (۵) قاضی

صلاح الدین بن خلیل جو پوری۔

عہد مغل کے مشاہیر

میر سید عبدالاول محدث جو پوری شارح بخاری شریف المتوفی ۹۶۸ھ (۲) ملا محمد یوسف قاضی خان المتوفی ۹۷۰ھ (۳) خواجہ محمد ارزانی مولف مدارج الاخبار المتوفی ۹۸۰ھ (۴) استاذ الملک ملا محمد افضل المتوفی ۱۰۶۲ھ (۵) ملا محمود بن محمد مصنف شمس بازغہ وغیرہ المتوفی ۱۰۶۲ھ (۶) دیوان محمد رشید المتوفی ۱۰۸۳ھ (۷) ملا ضیاء الدین استاذ شاہزادہ بہادر شاہ بن عالمگیر (۸) شیخ عبدالقدوس قلندر المتوفی ۱۰۵۲ھ (۹) ملا محمد جلیل، ملا محمد حسین، ملا ابو حامد بن حامد، یکے از مرتبین فتاویٰ عالمگیری (علمائے جو پور کا ماضی) ان حضرات کے علاوہ اور بھی بہت سے نامور علماء و مشائخ اس سرزمین سے اُبھرے جنہوں نے اپنے اپنے دور میں مدرسہ اور خانقاہ دونوں کو اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے آباد کیا ان میں اعلیٰ العلماء افضل الفصحاء جامع علوم ظاہری و باطنی قطب زماں استاذ الملک ملا محمد افضل عثمانی جو پوری کی ذات اپنے عہد میں خاص شہرت اور مخصوص مقام کی مالک ہے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے بعد آپ جیسی ہمہ گیر اور جملہ علوم و فنون میں ماہر شخصیت سرزمین جو پور سے پیدا نہیں ہوئی۔

سید نور الدین زیدی ظفر آبادی لکھتے ہیں:

دمیکہ ملک العلماء جادہ عدم پیو دند اہل جو پور ماتم الوداع علم کردند مگر
ندانستند کہ بذات خود ملک العلماء برفت و خلعت فاخرہ علم پس آئندہ استاذ
الملک گزاشت (۱)

آپ کا حلقہ درس اس قدر وسیع تھا کہ اس زمانہ میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس نے ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسب فیض نہ کیا ہو۔
تجلی نور میں ہے:

دراں زماں ہچ کس نبود کہ پیش آں بلا واسطہ زانوے ارادت تہ نکر دو سبتق نہ
 آموخت صد ہا فیض درس و تعلیم شاہ عالم العلوم و فاضل تبحر گشتند (۱)
 اس مضمون میں اسی فاضل یگانہ کے حالات پیش کیے جائیں گے۔ اس مضمون کی
 ترتیب میں حسب ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔
 گنج رشیدی قلمی، گنج ارشدی قلمی، تجلی نور، سجتہ المرجان، تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ
 الخواطر، معارف اعظم گڑھ مئی ۳۰ ÷ ان کے علاوہ بحر خزارہ مصنفہ شیخ وجیہ الدین اشرف
 لکھنوی، بسط الکلام فی وفیات الاعلام از شیخ یحییٰ عباسی الہ آبادی میں بھی ملا فضل کے
 حالات ہیں لیکن یہ دونوں کتابیں انتہائی کوشش کے باوجود بھی دستیاب نہ ہو سکیں اس لیے
 ان سے استفادہ نہیں کیا جاسکا۔

نام و نسب اور تاریخ پیدائش

نام محمد افضل، لقب استاذ الملک اور استاذ العلماء ہے۔ سلسلہ نسب محمد افضل بن شیخ
 حمزہ بن شیخ فرید الدین بن شیخ بہاء الدین عثمانی ہے۔ شیخ عثمان ہارونی کی اولاد میں ہیں
 سلسلہ نسب اس سے آگے معلوم نہیں ہو سکا۔

صوبہ اودھ کے مشہور تاریخی قصبہ ردولی میں ۱۶ رمضان ۹۷۷ھ کو بعد جلال
 الدین اکبر پیدا ہوئے (۲)۔ آپ کے والد شیخ حمزہ گردش زمانہ سے تنگ آکر اپنے آبائی
 وطن شہر دماوند مضافات مازندران کو خیر باد کہہ کر ہندوستان چلے آئے تھے اور ردولی میں
 سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

شیخ حمزہ زیور علم سے آراستہ تھے اس لیے عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے
 تھے، آپ کے تفقہ اور علم و فضل کا عملی اعتراف اس طرح کیا گیا کہ آپ کو عہدہ قضا پر مامور
 کر دیا گیا (۳)

(۱) ایضاً ص ۲۳۔

(۲) نزہۃ الخواطر ص ۵۵، ۳۵۹، و تجلی نور ص ۲۳۔

(۳) نزہۃ الخواطر ص ۵۵، ۳۵۹۔

تعلیم و تربیت

استاذ الملک نے علم و فضل کے گہوارہ میں آنکھ کھولی تھی۔ آپ کے والد عالم فقیہ اور
 مفتی کی حیثیت سے شہر میں ممتاز تھے۔ گھر میں فراغت و رفاہت بھی تھی جس کا اثر استاذ
 الملک کی نشوونما پر بہت اچھا پڑا۔

ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے والد کی نگرانی میں حاصل کی اور بہت جلد جملہ علوم و فنون
 میں دستگاہ پیدا کر لی۔ پھر مزید تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے گئے اور شیخ حسین عمری کے
 حلقہ درس میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے فراغت کے بعد ملا ابوحنیفہ تلمیذ حکیم گیلانی کے
 حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اور ان سے صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث پڑھ کر سند
 فراغت حاصل کی۔ ”الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند“ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی
 تکمیل کے سلسلے میں لاہور بھی گئے تھے۔

تبحر علمی

اس طرح بیس سال کی مدت میں سرآمدہ روزگار ہو گئے۔ (۱)
 نزہۃ الخواطر میں ہے۔

وجد فی البحث والاشتغال حتی برع فی العلم وافتنی ودرس ولہ نحو
 عشرين سنة صار من اکابر العلماء (۲)

تخصیص و تعلیم میں انتہائی محنت و جانفشانی کی تا آنکہ تمام علوم میں فاضل
 ہو گئے اور بیس سال کی عمر میں اکابر علماء میں شمار کیے جانے لگے۔

نور الدین زیدی رقمطراز ہیں:

در تحصیل علوم چنان ریاضتہا کشید و جانہا کندید کہ بمر بست سال فاتحہ فراغ

(۱) تجلی نور ص ۲۳۔

(۲) نزہۃ الخواطر ص ۳۵۹ ج ۵۔

خواند و طبع و فہم نشتر زن عروق اشکالات و فکر بلیغش گرہ کشائے معضلات
گشت (۱)

تذکرہ علمائے ہند میں ہے:

افضل الفضلاء عصر، علم العلماء دہر، جامع علوم عقلیہ و نقلیہ، منتشرع و متقی،
خوش خلق، سلیم المزاج بود۔ (۲)

ردولی سے جو نپور آمد

تعلیم و تحصیل علوم سے فراغت اور جملہ علوم و فنون متعارفہ میں مہارت حاصل
ہونے کے بعد اپنے برادر خورد سلطان محمود عثمانی کو ہمراہ لے کر ردولی کا قیام ترک کر کے
دارالخیر شہر جو نپور کی سکونت اختیار کر لی۔ (۳)

استاذ الملک نے ردولی کی سکونت کیوں ترک کی اور جو نپور کب آئے اس سے تمام
تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ آپ نے ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جب جو نپور کے علوم
و فنون کا غلغلہ پورے ہندوستان میں بلند تھا اس لیے قیاس ہے کہ یہ غلغلہ سن کر استاذ الملک
جیسے شائق علوم کے دل میں اس مرکز علمی کی کشش پیدا ہوئی ہوگی اور آپ نے ردولی سے
جو نپور کا قصد کیا ہوگا پھر یہ سرزمین ایسی دل پسند ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ تذکرہ نگاروں
کے سیاق کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فراغت تعلیم کے بعد ہی جو نپور چلے آئے تھے اس
اعتبار سے جو نپور میں آپ کی آمد ۱۰۰۰ کے حدود میں ہوئی ہوگی۔

یہ زمانہ جون پور کے علمی شباب کا تھا اور وہاں متعدد مدارس کو تعلیمی مرکزیت حاصل
تھی ان میں چند مشہور مدارس یہ تھے۔

(۱) مدرسہ ملا عبدالباری المتوفی ۱۰۳۶ (۲) مدرسہ ملا شیخ صادق المتوفی ۱۰۶۴ (۳)

(۱) تجلی نور ص ۴۴۔

(۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۱۔

(۳) تجلی نور ص ۴۵۔

مدرسہ ملا شمس الدین بن نور الدین برنوی المتوفی ۱۰۴۷ (۴) مدرسہ مداریہ ملا مداری المتوفی
۱۰۷۲ (۵) مدرسہ ملا خلیل المتوفی (۱۰۷۹) (۶) مدرسہ شیخ حامد (۷) مدرسہ ملا سید مبارک
بن خیر محمد وغیرہ (۱)

استاذ الملک نے بھی اپنی قیام گاہ کے متصل دائرہ افضل کے نام سے ایک درس گاہ
قائم کر کے تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اس مدرسہ نے بہت جلد شہرت و مقبولیت
حاصل کر لی اور طلباء کا اتنا مرجوعہ ہوا کہ تمام مدارس کی رونق سرد پڑ گئی۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا پھر اسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

سلوک و تصوف

استاذ الملک نے پوری زندگی گوعلماء کے انداز پر گزاری لیکن قدرت نے انہیں
صوفی صافی بھی پیدا کیا تھا اس لیے عمر کے ساتھ ساتھ تصوف کی طرف میلان بڑھتا گیا۔
بالآخر شیخ عبدالقدوس قلندر جو نپوری کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔

شیخ عبدالقدوس قلندر زہد و تقویٰ اور عشق الہی میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ استغناء
اور ماسوی اللہ سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتے تھے۔
جنگلات سے گھاس کاٹ کر فروخت کر کے بسر اوقات کرتے تھے۔ کھانے میں مشتبہات
سے انتہائی پرہیز اور اکل حلال کا بڑا اہتمام تھا آپ کی ذات مرجع خلایق تھی خواص و عوام
سب آپ کی صحبت کو سرمایہ سعادت سمجھتے تھے اپنے وقت کے مشاہیر علماء نے آپ سے
کسب فیض کیا۔

آپ کی پیدائش ۹۴۲ میں شہر جو نپور میں ہوئی اپنے والد شیخ قیام الدین (۲) بن قطب
الدین المعروف بہ قطب بینائے دل سے خلافت پائی تھی۔

اپنے مسترشدین کے شوق و طلب کا نہایت سخت امتحان لیتے تھے۔ گنج ارشدی میں

(۱) علمائے جو نپور کا ماضی۔

(۲) شیخ عبدالقدوس کے والد کا اسم گرامی شیخ عبدالسلام (علن) بن شیخ محمد بن قطب بینائے دل ہے۔

ہے کہ جب دیوان محمد رشید جو پوری بیعت کے لیے حاضر ہوئے تو ان سے بات تک نہ کی اور دیوان صاحب بھی رعب کی وجہ سے اظہار مدعا نہ کر سکے مگر مسلسل خدمت میں حاضری دیتے رہتے تقریباً ایک برس کے بعد ایک دن قلندر صاحب نے فرمایا کہ کیوں حاضر ہوتے ہو۔ دیوان صاحب نے عرض کیا، بیعت کے خیال سے، حکم ہوا کہ نصف شب کے بعد آنا۔ خانقاہ دریا کے پار تھی اور آدھی رات کے بعد پل کا دروازہ بھی بند ہو جاتا تھا۔ دیوان صاحب دریا پار کر کے حکم کے مطابق پہنچ گئے۔ اس وقت قلندر صاحب نے بیعت کی۔

تقریباً ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی عمر میں ۱۲ شوال ۱۰۵۲ کو اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا مزار جیل خانہ کے جنوب میں سڑک اور جیل خانہ کی چہار دیواری کے درمیان واقع ہے۔ (۱)

اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض اہل علم نے عبدالقدوس قلندر اور عبدالقدوس شلطاری کو ایک ہی ذات سمجھا ہے حالانکہ یہ دونوں بزرگ الگ الگ شخصیت رکھتے ہیں شیخ عبدالقدوس شلطاری قدن شاہ اور قطب صدیق سے مشہور ہیں اور ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ نظام آباد کے رہنے والے تھے اور آج بھی نظام آباد میں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ شاہ قدن نظام آبادی میر علی عاشقان سرانے میری کے پیر ہیں اور میر علی عاشقان کی وفات ۹۰۵ھ میں ہوئی ہے۔ (۲)

استاذ الملک نے جو پور آنے کے بعد بیعت کی اور تعلیم و تدریس کے ساتھ مجاہدہ و ریاضت کا بھی سلسلہ جاری رہا اور مختصر مدت میں تصوف کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے اور قطبیت کے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔

گنج ارشدی میں ہے۔

مرتب احقر از پیر دستگیر خود شنیدہ فرمود کہ روز وفات استاذ العلماء حضرت بندگی شیخ محمد افضل قدس سرہ در لاہور ہماں روز ملا خواجہ قدس سرہ فرمودہ

(۱) گنج ارشدی قلمی ص ۱۲۴، و تجلی نور ص ۶۸۔

(۲) گنج ارشدی ورق ۱۲۴، و سیر المتاخرین ج ۱ ص ۲۳۵۔

امروز قطب جو پور وفات یافت۔ (۱)

شیخ ملا خواجہ سلسلہ قادریہ کے مشہور مشائخ میں ہیں۔

صاحب تجلی نور لکھتے ہیں:

قطع نظر علوم ظاہری اہل دل صوفی صافی روشن ضمیر آغاز و انجام حقیقت را بیز ان اعتبار ہم سنجیدہ بود بیعت از شیخ عبدالقدوس قلندر جو پوری داشت

در کرامت و خوارق بغایت ستر نموده (۲)

آزاد بلگرامی مرحوم لکھتے ہیں:

انه كان حصور اتقيا حسن الخلق سليم المزاج (۳)

استاذ الملک پاک باطن متقی خوش خلق اور سلیم المزاج تھے۔

تصانیف

استاذ الملک تمام علوم میں امامت و عبقریت کا درجہ رکھتے تھے مگر ان کی کسی تصنیف کا تذکرہ نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے حلقہ درس کی وسعت اور مشغولیت نے تصنیف و تالیف کا موقع نہ دیا۔

شاعری

استاذ الملک کبھی کبھی تفنناً فارسی میں شعر بھی کہتے تھے مگر طبعاً شعر گوئی کی جانب میلان کم تھا نمونہ کلام یہ ہے۔

بازلف تو تودہ عنبر چه کنم
باخال تو مشکناى اذخر چه کنم
تو کافر و زلف کافر و دل کافر
من نیم مسلمان بسہ کافر چه کنم (۴)

(۱) گنج ارشدی ورق ۲۲۔ (۲) تجلی نور ص ۴۵۔

(۳) سبحۃ المرجان۔

(۴) تجلی نور ص ۴۵۔

وفات

آپ کے شاگرد رشید فخر استاذ ملا محمود کا انہتر سال کی عمر میں استاذ الملک کے سامنے انتقال ہو گیا تھا استاذ الملک اس صدمہ جانکاہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ چالیس دن تک آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں دیکھی گئی اور اکتالیسویں دن اس غم کو سینے سے لگائے ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۲ کو بھر چوراسی سال سات ماہ تلمیذ عزیز سے جا ملے۔ استاذ وشاگرد کے تعلق کی یہ مثال ایسی ہے جس کی نظیر تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملے گی۔ بعض لوگوں نے تاریخ وفات ۱۹ کے بجائے ۱۳ ربیع الثانی بیان کی ہے۔

مصرع ”محمود و افضل بگو آہ“ سے استاذ وشاگرد دونوں کا سنہ وفات نکلتا ہے^(۱) مزار محلہ سپاہ شہر جو پور میں ریلوے لائن سے مشرق جانب نیم کے درخت کے نیچے واقع ہے راقم الحروف کئی بار بغرض فاتحہ مزار پر حاضر ہو چکا ہے۔ استاذ الملک کے مزاج میں اس درجہ تواضع وانکسار تھا کہ کسی سے خدمت لینا قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، اپنا کل کام خود ہی انجام دے لیتے تھے دیوان محمد رشید نقل کرتے ہیں کہ حضرت بندگی میاں محمد افضل ہمہ کار ہا خودی کردند حتی کہ چراغ حجرہ خود روشن کردند و کتاب از حجرہ خودی آوردند (۲)

امراء و حکام کے دربار میں حاضری سے بہت اجتناب کرتے تھے کبھی اپنی غرض لے کر ان کے پاس نہیں گئے اگرچہ حکام آپ کی خدمت باعث سعادت سمجھتے تھے البتہ طلباء اور صوفیاء کی ضرورت کے وقت امراء کے پاس جانے میں تامل نہ تھا۔ تجلی نور میں ہے۔

باوصف چندیں باسند عا و طلب بہ دربار امراء و ملوک نمیرفتی مگر برائے حواج
فقرا و طلباء ہچو مردم بخانہ چشم منتظراں در آمدی (۳)

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۹۔

(۲) گنج ارشدی ورق ۱۳۶۔ (۳) تجلی نور ص۔

اتنے کمالات کے باوجود کبھی کوئی طلب لے کر امراء کے دربار میں نہیں جاتے تھے البتہ طلباء و فقراء کی ضروریات لے کر نہایت عزت کے ساتھ جاتے تھے۔

اولاد و تلامیذ

استاذ الملک کی کسی اولاد کا ان کے تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے البتہ ان کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے لیکن ان کی تعیین بھی مشکل ہے تاریخوں میں منتشر طور پر کچھ لوگوں کا پتہ لگتا ہے جن میں مشاہیر حسب ذیل ہیں۔

(۱) ملا محمود بن محمد جو پوری: آپ ولید پور (۱) ضلع جو پور کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت استاذ الملک کے زیر سایہ تکمیل کو پہنچی۔ بڑے ذہین و فطین اور علم کے بجد شائق تھے اس لیے تعلیم کے زمانہ میں بڑی محنت و جانفشانی سے تحصیل کی اور بہت جلد اپنے پیشرووں سے بھی آگے نکل گئے۔ آپ کے طلب و اشتیاق کی قدر استاذ الملک بھی کرتے تھے۔ آپ فخر استاذ تھے استاذ الملک کے تمام تلامذہ میں آپ کا درجہ علمی اعتبار سے سب سے بڑھا ہوا ہے۔ صرف سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم و فنون میں مہارت تامہ حاصل کر لی بالخصوص فلسفہ میں ایسا کمال پیدا کر لیا کہ متقدمین میں بھی ان کے ہم پایہ کم نظر آتے ہیں۔ متعدد اہم کتابوں کے مصنف ہیں ان میں شمس بازغہ اور فرائد محمودیہ بہت مشہور اور اپنے فن میں نہایت جامع ہیں۔ ایک عرصہ تک یہ دونوں کتابیں داخل نصاب رہ چکی ہیں۔ شمس بازغہ پر متعدد علماء نے حواشی و شروح لکھا ہے۔

شعر و سخن میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ دود یوان یادگار چھوڑے، دو شعر نمونہ پیش ہیں۔
برصوفی بے وجد و بال است عبادت بر شیشہ کہ خالیست زہ سجده حرام است

اشکے کہ راز عشق بگوید فشانندی است طفلی کہ خوش محاورہ افتد نماندنی است

(۱) اب ولید پور ضلع اعظم گڑھ میں ہے۔

ملا محمود نے اپنے استاذ کی طرح پوری عمر درس و تدریس میں گزار دی آپ کے مشہور شاگردوں میں ملا عبدالباقی جو پوری خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ۱۰۶۲ میں آپ کا انتقال ہوا مزار چاک پور شہر جو پور میں ہے۔ (۱)

(۲) دیوان محمد رشید بھی استاذ الملک کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ استاذ الملک سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ فراغت تعلیم کے بعد بھی ہفتہ میں ایک بار ضرور حاضری دیتے تھے جب تک استاذ الملک نے درس و تدریس کا صریح حکم نہیں دیا اس کا سلسلہ شروع نہیں کیا لوگوں کے اصرار پر فرماتے کہ جس جگہ استاذ الملک جیسی ہمہ گیر شخصیت مصروف تدریس ہو مجھ جیسے شخص کے لیے تدریس کی مسند پر بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔

دیوان صاحب جملہ علوم میں مہارت رکھتے۔ تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی شغل تھا اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں مناظرہ رشیدیہ، شرح ہدایہ الحکمت اور شرح اسرار الخلوقات نہایت جامع اور اہم ہیں رشیدیہ تو اب تک نصاب میں داخل ہے۔

علم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی آپ کا مقام بہت بلند ہے اس دور میں تصوف کے جتنے سلاسل رائج تھے ان سب سے آپ کو خلافت و اجازت حاصل تھی اس وصف میں دیوان صاحب اپنے تمام معاصرین میں ممتاز اور فائق تھے۔

شاعری میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ سٹشی تخلص تھا۔ دیوان سٹشی کے نام سے آپ کا قلمی دیوان کتب خانہ رشیدیہ جو پور میں اب بھی موجود ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے:

بر بدن صد زخم خنجر گر زنی کے بھیرم جاں بجائے دیگر است
من بیکدم سیر عالم می کنم روح رادستے و پائے دیگر است
۱۰۱۷ ذیقعدہ ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ کو وفات پائی۔ مزار محلہ

رشید آباد شہر جون پور میں ہے۔ (۲)

(۱) تجلی نور ص ۴۹۔

(۲) گنج رشیدی قلمی، تفصیل کے لیے راقم کا مقالہ مطبوعہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ماہ جون و جولائی ۷۲ء دیکھئے۔

(۳) ملا ضیاء الدین جو پوری: استاذ الملک کے مشہور شاگرد ہیں جملہ علوم و فنون میں تبحر حاصل تھا۔ حدیث و فقہ اور لغت میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ ایک ہزار سے زائد احادیث کے حافظ تھے۔ قاموس مولفہ مجد الدین فیروز آبادی بھی نوک زبان تھی۔ نہایت متقی، صالح اور پرہیزگار تھے۔ شہنشاہ عالمگیر نے شاہ زادہ بہادر شاہ کی تعلیم و تربیت پر آپ کو مامور کیا تھا۔ عین عالم شباب میں وفات پائی۔ اس سے زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ (۱)

(۴) سلطان محمود عثمانی: آپ استاذ الملک کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ولادت قصبہ ردولی میں ہوئی۔ تعلیم استاذ الملک کی نگرانی میں پائی اور استاذ الملک کے ساتھ جو پور چلے آئے۔ یہیں شیخ مبارک بن خیر محمد جو پوری کی صاحبزادی سے عقد ہوا۔

سلطان محمود اپنے وقت کے مشہور صوفیاء میں تھے۔ اپنے خسر شیخ مبارک سے بیعت کی اور جملہ مقامات طے کر کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئے۔ اپنے زمانہ میں مرجع خاص و عام تھے اور بے شمار کرامات آپ سے صادر ہوئیں۔

تجلی نور میں ہے۔

طبیعت فقر آشنا بود و از خسر خود حضرت مبارک خیر محمد بیعت نمود و در ریاضت

باطنی بر خود کشیدہ باندک۔ زمانہ طسی منازل کردہ منازل سلوک و فقر جاہ

مستقیم گشت و از میر علی عاشقان سراے میری ہم فراواں برگرفت و بسیار

مردم بروگردیدند و بسیار خوارق از دپر گزارند (۲)

صاحب تجلی نور کی یہ تصریح کہ از میر علی عاشقان سراے میری ہم فراواں برگرفت

محل نظر ہے کیونکہ صاحب سیر المتاخرین کے بیان کے مطابق میر علی عاشقان کی وفات ۹۰۵

میں ہوئی ہے اور تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ سلطان محمود استاذ الملک سے عمر

میں چھوٹے ہیں اور استاذ الملک کی پیدائش با تفاق مورخین ۹۷۷ میں ہوئی ہے اس لیے

سلطان محمود کا میر علی عاشقان سے کسب فیض کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۱) معارف مئی ۱۹۷۳ء۔

(۲) تجلی نور ص ۷۷۔

سن وفات معلوم نہ ہو سکا۔ مزار محلہ چاچک پور شہر جو پور میں ہے۔

(۵) محمد راشد بن دیوان محمد رشید: انھیں بھی استاذ الملک سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ استاذ الملک ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کا پہلا عقد استاذ الملک ہی کی تجویز پر ہوا تھا۔

ولادت ۱۰۴۱ میں ہوئی۔ بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطن میں بھی درجہ کمال کو پہنچ گئے۔ آپ کا مشغلہ بھی تعلیم و تدریس ہی تھا اور اس میں بڑا انہماک تھا۔ صبح درس گاہ میں بیٹھتے تو دوپہر کے وقت اٹھتے اور ظہر کی نماز اول وقت میں جماعت سے ادا کر کے پھر درس شروع کر دیتے تھے۔ طلباء سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے جو خود کھاتے انھیں بھی کھلاتے تھے۔ نہایت متقی، پرہیزگار اور پابند سنت تھے اگر کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تو بڑی بشاشت و انبساط کا اظہار فرماتے کہ سنت نبوی پر عمل کی توفیق ہوئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خاندان رشیدی میں دیوان صاحب کے بعد اس پایہ اور مقام کا کوئی اور شخص پیدا نہیں ہوا۔ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ کو کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے جاں بحق ہوئے۔ آپ کا مزار بھی اپنے والد مکرم کے پاس رشید آباد میں ہے۔ (۱)

(۶) شیخ مولا چندن: نسلاً شیخ صدیقی تھے۔ جملہ علوم کی تعلیم استاذ الملک سے حاصل کی۔ اپنے دور کے مشاہیر علماء و محدثین میں شمار کیے جاتے تھے۔ علم حدیث سے خاص شغف تھا۔ حرمین شریفین کے سفر میں مکہ معظمہ کے محدثین عظام سے بھی حدیث کی تصحیح اور اسکی سند حاصل کی اسی سفر میں ۱۰۶۲ مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ زیادہ تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ (۲)

☆ ☆ ☆

حضرت شاہ طیب بناری اور ان کے اسلاف و خلفاء

ابتدائیہ

بنارس ایک صنعتی اور ایک خاص طبقہ کا مذہبی مرکز ہونے کے علاوہ گذشتہ دور میں اسلامی علوم و فنون اور ارباب فضل و کمال کا بھی مرکز رہ چکا ہے، یہ علاقہ چھٹی صدی میں باقاعدہ اسلامی قلم رو میں شامل ہوا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے غلام قطب الدین ایک نے اس دیار کو فتح کر کے دہلی سے وابستہ کیا۔ اسی وقت سے علمی و روحانی خانوادے یہاں آکر آباد ہونے لگے، خاص طور سے نویں صدی ہجری کے آغاز سے جب پورب کی آزاد خود مختار سلطنت کی بنیاد پڑی اور چند سالوں کے بعد سلطان ابراہیم شاہ شرقی متوفی ۸۴۴ھ تحت نشین ہوا تو اس کے علم پروری علماء نوازی اور عدل گستری کی بدولت پورب کی ساری سرزمین اسلامی علوم اور علمائے اسلام کے حسنات و برکات سے لہلہا اٹھی۔ سلاطین شرقیہ کے بعد افق سلطنت پر لودھی خاندان کا ستارہ چکا اور غروب ہوا۔ مگر یہاں علم و دانش اور فضل و کمال کی محفلیں جہی رہیں۔ زمانہ نے ایک کروٹ پھرنی اور ۹۳۳ھ میں شاہان مغلیہ کی سلطنت قائم ہوئی تو تیموری خاندان کا پانچواں حکمران اس خطہ کی علمی و دینی شان و شوکت اور علماء و فضلاء کی کثرت دیکھ کر بے ساختہ پکارا اٹھا ”مملکت پورب شیراز ماست“ اسی شیراز ماست کا ایک قابل قدر حصہ بنارس بھی تھا جہاں بہت سے علمی و روحانی خانوادے آکر اس طرح اقامت پذیر ہو گئے کہ صدیوں تک ان کے فیوض و برکات کا سلسلہ جاری رہا، ان باہر سے آنے والوں میں قدوۃ اہل تجرید، غریق بحر تو حید فرید ثانی شیخ

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۰ ج ۱۔

(۲) معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۳۰ء ÷

الاسلام شیخ فرید بن قطب الدین اور ان کے برادر خرد امام العارفین ہمام العاشقین شیخ داؤد بن قطب الدین کے خاندان کو علمی و دینی لحاظ سے بڑا فروغ حاصل ہوا، گیارہویں صدی ہجری کے مشہور شیخ شاہ طیب بن معین بنارسی اسی خانوادے کے ایک فرد تھے۔ آئندہ صفحات میں شیخ طیب اور ان کے اسلاف اور خلفاء کے علمی و روحانی کارناموں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

ماخذ و مصادر

ہماری تحقیق میں اس خاندان کے سب سے قدیم ترین تذکرہ نگار شیخ یسین بن احمد بنارسی متوفی ۱۰۷۶ھ ہیں جنہوں نے اپنے شیخ و مرشد طیب بنارسی کی وفات کے بارہ سال بعد مناقب العارفین میں اس خانوادے کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد شیخ ارشد جون پوری متوفی ۱۱۱۲ھ کے ملفوظات گنج ارشدی میں شیخ طیب کے تذکرہ کے ضمن میں اس خاندان کے اکابر کا ذکر تفصیل سے ہے جس میں کچھ باتیں مناقب سے زائد ملتی ہیں۔ گنج ارشدی کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جون پور میں ہے اور میری نظر سے کئی بار گذر چکا ہے۔

بحرِ خار میں بھی اس خانوادے کے بہت سے بزرگوں کا تذکرہ ہے جس کا ایک قلمی نسخہ پیرزادہ شاہ محمود احمد رمزائیڈ و کیٹ خانقاہ ملا سید محمدی الہ آبادی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جسے پیرزادہ صاحب کی نوازشوں کے طفیل متعدد بار مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ بعد کے جن تذکرہ نویسوں نے بھی اس خاندان کے کسی بزرگ کا تذکرہ کیا ہے ان کا مرجع یہی کتابیں ہیں۔ چنانچہ زہرۃ الخواطر عربی، سمات الاخیار، مرقع بنارس، تذکرہ مشائخ بنارس وغیرہ میں انہیں کتابوں کے حوالے سے اس خانوادے کا ذکر ملتا ہے۔

(۱) شیخ الاسلام شیخ فرید بنارسی

نام فرید اور لقب شیخ الاسلام ہے۔ شیخ کے مورث اعلیٰ جد گرامی شیخ خلیل فاروقی، ملک عرب سے ترک وطن کر کے ہندوستان وارد ہوئے اور ضلع غازی پور کے مشہور تاریخی

مقام قصبہ بھتری کے متصل منجھو ارہ نامی بستی کو توطن کیلئے منتخب کیا۔ یہ بستی قصبہ بھتری اور قصبہ چندولی ضلع بنارس کے درمیان واقع ہے اور ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اسی قدیم نام سے آج بھی موسوم و مشہور ہے۔ منجھو ارہ نام کا ایک قصبہ ضلع اعظم گڑھ میں بھی ہے مگر اس منجھو ارہ سے شیخ خلیل کا کوئی تعلق نہیں۔

مناقب العارفین میں ہے:

گویند کہ شیخ خلیل فاروقی از ولایت بالا چوں بایں دیار رسید در پرگنہ منجھو ارہ

توطن اختیار نمود۔ (۱)

”لوگوں کا کہنا ہے کہ شیخ خلیل جب ولایت بالا (خراسان) سے اس دیار میں پہنچے تو پرگنہ منجھو ارہ کو وطنیت کیلئے منتخب کیا۔“

ایک سطر کے بعد مزید تشریح کرتے ہوئے شاہ یسین رقمطراز ہیں:

واز بعضے فرزندان ایشاں شنیدہ کہ وے (شیخ خلیل) در قریہ جٹری کہ

متعلقات منجھو ارہ است می بود، قبر شریف وے در ہماں دیہ بالائے حوض

بر بلندی واقع است۔ (۲)

”شیخ کے بعض لڑکوں سے معلوم ہوا کہ وہ قریہ جٹری متعلقہ منجھو ارہ میں رہتے تھے،

وہیں تالاب کے ٹیلے پر ان کا مزار بھی ہے۔“

محترم جناب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب مدیر رسالہ ”معرفت حق“ الہ آباد، متوطن

قصبہ بھتری سے معلوم ہوا کہ جٹری قصبہ بھتری سے متصل ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اسی

گاؤں کے قدیم تالاب کے ٹیلے پر شیخ خلیل فاروقی کا مزار آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ شیخ

خلیل علم و فضل اور زہد و ورع کی دولتِ لازوال سے بہرہ یاب تھے اس لئے اس نئے وطن

میں بہت جلد اپنا ایک امتیازی مقام پیدا کر لیا۔

صاحب مناقب کا بیان ہے:

(۱) مناقب العارفین ص ۸۸۔

(۲) ایضاً ص ۸۹۔

آں جا با فراغت می بود اکثر امراء وقت که معتقد وے بودند خدمت وے را
سعادت می دانستند۔

”اس جگہ شیخ فراغت کے ساتھ رہتے تھے اس عہد کے اکثر امراء ان سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کی خدمت کرنا سعادت تصور کرتے تھے۔“

یہیں قریب کے موضع خانقاہ میں شیخ خلیل نے اپنے صاحبزادے قطب الدین کا عقد وہاں کے مشہور بزرگ شیخ نور کی صاحبزادی سے کر دیا، اس تعلق سے شیخ قطب الدین منجھوارہ کے بجائے خانقاہ میں شیخ نور کے پاس رہنے لگے تھے۔ شیخ قطب الدین کے دونوں مایہ صد افتخار اور نادرہ روزگار صاحبزادگان شیخ فرید و شیخ داؤد کی ولادت اسی موضع میں ہوئی۔

والد شریف وے بندگی شیخ قطب بن شیخ خلیل فاروقی در مقام خانقاہ کہ
وے است معروف نزدیک بھتری می بودند تولد بندگی میاں فرید در ہماں
مقام شدہ بود۔ (۱)

”شیخ فرید کے والد شیخ قطب بن خلیل فاروقی موضع خانقاہ میں رہتے تھے جو بھتری کے پاس ایک مشہور قریب ہے۔ شیخ فرید کی ولادت اسی قریب میں ہوئی۔“ (۲)

بنارس میں آمد

یہ بتانا مشکل ہے کہ زندگی کے کس مرحلے میں شیخ فرید نے اپنے مادری وطن خانقاہ کو الوداع کہا اور بنارس کو شرف وطنیت سے نوازا۔ تذکروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے والد شیخ قطب الدین کی وفات کے بعد شیخ فرید معہ برادر خرد شیخ داؤد تحصیل علم کی غرض سے بنارس تشریف لائے، اس وقت شیخ موسیٰ فردوسی خلیفہ ارشد محمد و شرف الدین احمد بن بیچی منیری متوفی ۸۳ھ کی عظمت و شہرت کا آفتاب نصف النہار میں تھا، یہ دونوں بھائی انہیں کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ یسین لکھتے ہیں:

(۱) مناقب العارفین ص ۸۸ (۲) ایضاً ص ۸۷۔

گویند کہ بعد وفات بندگی شیخ قطب بندگی شیخ فرید مع برادر عزیز بندگی شیخ داؤد بقصد تحصیل علم در بنارس رسید چوں در اں وقت در شہر مذکور (بحذف القاب) شیخ موسیٰ فردوسی مشہور ترین وقت بودند بالضرورة آں ہر دو برادر اں رخ بجانب خانقاہ حضرت ایشاں کردند۔ (۱)

”لوگوں کا بیان ہے کہ شیخ قطب کی وفات کے بعد دونوں بھائی شیخ فرید و شیخ داؤد بغرض تحصیل علم بنارس آئے چونکہ اس وقت اس شہر میں مشہور ترین شخصیت شیخ موسیٰ فردوسی کی تھی، اس لئے انہیں کی درسگاہ میں حاضر ہوئے۔“

صاحب مناقب کا بیان ہے کہ جس وقت یہ دونوں حضرات شیخ فردوسی کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ شیخ نے دیکھتے ہی محبت آمیز انداز میں فرمایا ”بیاسید فرید“ فرید آؤ پھر مجلس سے اٹھ کر گھر کے اندر گئے اور دو روٹیاں لا کر اپنے دست خاص سے ایک ایک دونوں بھائیوں کو مرحمت کی، پھر فرمایا ”نصیب شما از علوم ظاہری و باطنی از برادر عزیز خواجہ مبارک است (ص ۸۹) یعنی تم دونوں کو علمی و روحانی دولت شیخ مبارک کی خدمت سے حاصل ہوگی اور خود ہی از راہ عنایت ایک خادم کے ذریعہ دونوں حضرات کو خواجہ مبارک بناری کی درسگاہ میں پہنچا دیا۔

تعلیم و تربیت

خواجہ مبارک (۲) کا کاشانہ بیک وقت مدرسہ اور خانقاہ دونوں تھا۔ یہاں پہنچ کر ہر

(۱) مناقب العارفین ص ۸۶۔

(۲) حضرت خواجہ مبارک بناری اپنے وقت کے ممتاز علماء و فضلاء میں تھے۔ آپ کا حلقہ درس بڑا وسیع تھا، ابتداء میں درس و تدریس میں خاص شغف رہا کسی شیخ و مرشد سے بیعت و ارادت کا تعلق نہیں تھا لیکن صفائی باطن کی دولت سے آغاز ہی سے بہرہ ور تھے۔ کبھی کبھی خیال بھی ہوتا تھا کہ کسی سے بیعت کا تعلق قائم کر لیں لیکن علمی تبحر عقیدت کی راہ میں سد راہ بن جاتا تھا، ایک دن ان کے دل میں یہ خطرہ گذرا کہ شیخ محمد بن عیسیٰ جو چوہری کے متعلق تو اترا سے سننے میں آ رہا ہے کہ بڑے صاحب تصرف بزرگ ہیں کیا اچھا ہوتا کہ یہ مجھ پر تصرف فرماتے۔ اور اپنی جانب جذب کر لیتے اس خیال کے آنے کے چند یوم کے بعد ایک شب خواب میں دیکھا کہ بنارس کے اکابر حضور..... کے استقبال کے ←

طرف سے بے نیاز ہو کر تحصیل علوم میں منہمک ہو گئے۔ خواجہ مبارک کی توجہ اور اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت مختصر سی مدت میں جمع کتب متداولہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کر لی۔ شیخ نے جوہر قابل دیکھ کر، ظاہری علوم سے تکمیل کے بعد ان کی روحانی تربیت بھی شروع کر دی اور کلاہ ارادت ان کے سر پر رکھ کر مشائخ چشت کے اوراد و اذکار کی تلقین فرمائی۔ علوم ظاہری کی طرح اس میدان میں بھی شیخ فرید نے نہایت تیز روی کا مظاہرہ کیا، شب و روز ذکر و فکر، صوم و صلوة اور اشغال و مراقبہ میں مشغول رہنے کے ساتھ ساتھ شیخ کی خدمت سے بھی یک دم غافل نہ ہوئے تھے۔ شیخ فرید کی اس اطاعت شعاری اور خدمت گذاری نے خواجہ کے دل کو رام کر لیا۔ شیخ فرید کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے سے پہلے شیخ سعد اللہ بنارس خواجہ کے خاص اور محبوب ترین خادم و مرید تھے، وضو اور غسل کی خدمت انہیں سے متعلق تھی، اکثر مبتدیان سلوک کی تربیت بھی انہیں کے حوالے ہوتی تھی اس اختصاص و امتیاز کی بناء پر خواجہ کے متعلقین میں انہیں خاص اہمیت حاصل تھی۔ اپنے

→ لئے جا رہے ہیں یہ بھی ان کے ہمراہ ہو رہے اور حضور..... کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ کی آمد کا آواز بلند ہو رہا ہے اور لوگ کشاں کشاں کی خدمت میں چلے جا رہے ہیں، یہ بھی جانے والوں کے ساتھ ہو رہے اور جب قریب پہنچتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ خواجہ بسطامیؒ کی بجائے شیخ محمد بن عیسیٰ صدر مجلس ہیں انھوں نے حاضرین میں سے کسی سے سوال کیا کہ شورتو خواجہ بسطامیؒ کی آمد کا تھا مگر یہ تو شیخ محمد جو پوری ہیں، اس شخص نے جواب دیا کہ بایزید بسطامیؒ زمانہ یہی ہیں۔ یہ سن کر حسن عقیدت سے شیخ محمد کے قریب پہنچے۔ شیخ نے فرمایا مبارک سعادت کا وقت ہے وضو کر کے آؤ چنانچہ یہ وضو کر کے آئے تو توجیہ الوضو پڑھنے کا حکم دیا پھر بیعت فرما کر اپنی کلاہ سعادت سر سے اتار کر خواجہ مبارک کے سر پر رکھ دی۔ نیند سے بیدار ہوئے تو ہاتھ وضو کے پانی سے تر تھا اور سر پر ٹوپی بھی موجود تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر شیخ محمد جو پوری کی عقیدت کا جذبہ موجزن ہو گیا جس کی رو میں تمام علمی غرور بہ گیا اور جون پوری کی راہ لی۔ خدمت میں پہنچے تو خواب میں جو کچھ پیش آیا تھا یعنی وہی معاملہ شیخ نے عالم بیداری میں فرمایا۔ اب تو خواجہ مبارک کے حیرت و استعجاب کی حد ہی نہ رہی۔ چنانچہ فوراً شیخ محمد کے دست حق پر بیعت ہو گئے اور صرف ایک ہفتہ کی مدت میں اجازت و خلافت کی دولت سے مالا مال ہو کر بنارس واپس آئے اور طلباء و فقراء کی تعلیم و تربیت میں اس طرح مشغول ہوئے کہ پوری زندگی اسی میں گذاری۔ آپ کی تلقین و تربیت سے بہت سے لوگ درجہ تکمیل تک پہنچے اور اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے جن میں شیخ الاسلام حضرت شیخ فرید بناری، شیخ سعد اللہ بناری، شیخ بدھتھانی جو پوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اور خواجہ کی ان مہربانیوں، اور عنایتوں کو دیکھ کر انھیں بھی یقین تھا کہ خواجہ اپنا جانشین اور خلیفہ مطلق مجھے ہی منتخب فرمائیں گے۔ لیکن شیخ فرید کے خانقاہ میں آجانے اور ان کی صلاحیتوں کے اجاگر ہو جانے کے بعد شیخ سعد اللہ کا وہ اختصاص باقی نہ رہا، بلکہ شیخ فرید بھی اس میں برابر کے شریک ہو گئے۔

خلافت و جانشینی

شیخ سعد اللہ کا دستور تھا کہ خانگی ضروریات کے تحت ہفتہ یا مہینہ میں گھر تشریف لے جاتے، رات مکان پر گزار کر صبح کو خواجہ کی خدمت میں واپس آ جاتے۔ حسب دستور ایک مرتبہ گھر گئے ہوئے تھے کہ شب میں خواجہ نے بوقت تہجد انہیں یاد فرمایا، چونکہ شیخ صاحب موجود نہیں تھے، اس لئے شیخ فرید نے عرض کیا ”فرید حاضر است“ خواجہ خاموش ہو رہے، کچھ دیر کے بعد پھر شیخ سعد اللہ کو آواز دی، شیخ فرید نے عرض کیا ”فرید حاضر ہے“ خواجہ پھر خاموش ہو گئے اور تھوڑے سے وقفہ کے بعد تیسری بار بلند آواز سے انہیں پکارا۔ شیخ فرید نے ڈرتے ہوئے باادب عرض کیا کہ شیخ صاحب آج موجود نہیں ہیں، گھر تشریف لے گئے ہیں۔ خواجہ نے فرمایا فرید غسل کیلئے پانی لاؤ شیخ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ خواجہ مبارک کا معمول تھا کہ وہ نماز پنجگانہ اور تہجد کیلئے تازہ غسل فرمایا کرتے تھے۔ غسل سے فارغ ہو کر تہجد میں مشغول ہو گئے۔

شیخ فرید حجرہ کے متصل مؤدب کھڑے رہے، تہجد کے بعد خواجہ مراقب ہو گئے، مگر شیخ فرید بدستور اسی طرح کھڑے رہے۔ تقریباً سوا گھنٹہ کے مراقبہ کے بعد خواجہ نے شیخ فرید کو آواز دی اور حجرہ کے اندر طلب کیا شیخ فرید لرزاں و ترساں حجرہ میں داخل ہوئے اور خواجہ کے حکم سے باادب روبرو بیٹھ گئے۔ خواجہ نے اسی وقت اپنا خرقة خاص ان کے زیب تن کیا اور فرمایا:

”ہر طالعے کے پیش نما آید و آں را اہل دانی خرقہ پوشانی و تلقین نمائی“

”جو طالعے بھی تمہاری خدمت میں آئے اور تمہیں اس میں صلاحیت معلوم ہو، تو

اسے بیعت کر کے اور ادو وظائف کی تلقین کرنا،

پھر مزید نوازش و کرم کی بارش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”فرزند من و جانشین من توئی نام من روشن خواہد شد و ولایت بنارس را بتو دادم

و ہدایت اہل آل و ولایت بتو سپردم“ (۱)

”میرا (روحانی) فرزند اور جانشین تو ہی ہے میرا نام تیرے ذریعہ سے روشن ہوگا،

اس شہر کی ولایت اور اہل شہر کی ہدایت کا کام میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔“

اس کے بعد ان الفاظ میں چند نصیحتیں فرمائیں:

”باید کہ طالبان ہمدراں ہمدارات و تواضع گذاری و با فقراء سلوک نیکوئی

و با طالب علمان مہرباں باشی و درس علوم ظاہری نہ گذاری، و ہرچہ از غیب

رسد خرچ کنی“ (۲)

”طالبان سلوک کے ساتھ ہمیشہ مدارات و تواضع سے پیش آنا، فقراء کے ساتھ حسن

سلوک کا معاملہ کرنا اور طالب علموں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنا اور علوم ظاہری کے درس

کو برابر جاری رکھنا اور جو کچھ فتوحات ہو اسے خرچ کرتے رہنا۔“

صبح کے وقت شیخ سعد اللہ خواجہ کی خدمت میں پہنچے تو انہیں اپنی محرومی پر نہایت

صدمہ ہوا اور فرط حرمان و یاس سے آنکھیں اشک بار ہو گئیں، ان کے اس رنج و اضطراب کو

دیکھ کر خواجہ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا: ماشاء اللہ کان، اپنے کو بتلائے رنج و یاس مت

کرو اس سعادت میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ ”سعد اللہ تا سعد اللہ و فرید تا قیامت“ خواجہ کی

پیشین گوئی بعد میں درست نکلی۔ شیخ سعد اللہ بھی خلافت و اجازت سے شرف یاب ہو گئے،

مگر ان کا سلسلہ ان ہی کی ذات پر منقطع ہو گیا۔ بالمقابل ان کے شیخ فرید بناری کا سلسلہ

ڈھائی صدی تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ جاری رہا اور ان کی خاندان میں نسلوں بعد

نسلِ ارباب علم و فضل اور اصحاب خیر و صلاح پیدا ہوتے رہے۔

(۱) مناقب ص ۹۱۔

(۲) مناقب ص ۹۱۔

تعلیم و ارشاد

خواجہ مبارک کے ساتھ شیخ فرید کی گرویدگی اور محبت کا یہ عالم تھا کہ علوم شریعت و

طریقت میں درجہ کمال پر فائز ہو جانے کے بعد بھی ایک لمحہ کیلئے ان کی صحبت سے علیحدگی

گوارا نہ تھی۔ چنانچہ خواجہ کی زندگی بھر ان کی صحبت سے جدا نہ ہوئے اور اکتساب فیوض

کرتے رہے، خواجہ کی وفات کے بعد حسب ارشاد سجادہ مشیخت پر بیٹھے اور سالکین کی

تربیت و تلقین کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رکھا۔ عام طور سے ظہر کے

بعد درس دیتے تھے۔ (۱)

مشائخ کی تذکرہ نگاری کا یہ پہلو ہمیشہ سے افسوسناک رہا ہے کہ ان کے درجات

و مراتب اور کرامات و تصرفات کے انبار میں ان کی علمی زندگی دب گئی۔ شیخ فرید کے ساتھ

بھی یہی معاملہ ہوا۔ تذکرہ نگاران کے روحانی تصرفات و درجات کا تو تفصیل سے ذکر

کرتے ہیں لیکن علم ظاہری کے سلسلے میں سرسری طور سے یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں کہ بعد ظہر

سبق لگتے۔

اس لئے تلامذہ کی مکمل فہرست پیش کرنا ممکن نہیں، تلاش و تحقیق کے بعد صرف چار

حضرات کے متعلق صراحت سے معلوم ہو سکا کہ انہوں نے شیخ فرید سے تعلیم حاصل کی، ان

میں ایک شیخ کے خلف اکبر شیخ محی الدین بناری اور دوسرے ان کے برادر زادہ شیخ حسن بن

شیخ داؤد بناری ہیں ان دونوں حضرات نے جملہ علوم متداولہ کی تحصیل و تکمیل شیخ فرید ہی

سے کی۔ تیسرے اور چوتھے اسد العلماء شیخ نصیر الدین مصطفیٰ آبادی جھوسوی متونی ۹۸۰ھ

اور شیخ محمد حافظ بن حبیب اللہ بناری نبیرہ شیخ فرید ہیں۔ ان دونوں حضرات نے شیخ سے

نحو صرف وغیرہ کی چند کتابیں پڑھیں۔

حالانکہ خود مناقب العارفین سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ فرید کی خدمت میں طلبہ کی ایک

کثیر تعداد ہر وقت رہتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ یہ عبارت ہے۔

(۱) مناقب ص ۹۳۔

”حضرت بندگی میاں (شیخ فرید) بتقریب عرس عزیزاں جائے تشریف

برده بود جمع طلبہ ہمراہ ولے بودند۔“ (۱)

”حضرت شیخ فرید کسی عزیز کی دعوت کے سلسلے میں کسی جگہ تشریف لے گئے تھے،

تمام طلبہ ہمراہ تھے۔“

مطبخ کے خرچ کے ضمن میں ہے:

”خرچ مطبخ وے بحدے رسید کہ قریب صد کس از فقراء و طلبہ علم و مہمان بر

سفرہ وے حاضر شدند“ (۲)

”شیخ کے مطبخ کا خرچ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ تقریباً ایک سو فقراء و طلبہ اور مہمان

روزانہ دسترخوان پر موجود رہتے۔“

ان تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کی خدمت میں طلبہ کی کثیر جماعت موجود رہتی

تھی، لیکن ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک حرف بھی نہیں ملتا کہ طریقہ تعلیم کیا تھا،

نصاب میں کیا کیا کتابیں تھیں۔ پھر علوم و فنون میں شیخ کا کیا مقام تھا۔ کتنے طلبہ شیخ کی

درسگاہ سے فارغ ہو کر نکلے۔ یہ سوالات عصر حاضر کے تذکرہ نگاروں کے اذہان میں

ابھرتے ہیں۔ لیکن قدیم دور کے تذکرہ نویسوں کی جانب سے ان سوالوں کے جوابات

سے عام طور پر محرومی ہی ہوتی ہے۔

خدمت خلق

خواجہ کی حیات ہی میں ان کی جانب لوگوں کا رجوع ہونے لگا تھا، لیکن سجادہ

مشیخت پر بیٹھنے کے بعد تو عام شہرت و مقبولیت حاصل ہو گئی اور ارادتمندوں کا حلقہ نہایت

وسیع ہو گیا۔ طلبہ اور سالکین کی ایک بڑی تعداد ہر وقت خانقاہ میں موجود رہتی تھی، امراء

و حکام بھی حاضری کو سرمایہ سعادت خیال کرتے تھے۔ متعدد حکام نے عقیدت میں جاگیر

(۱) مناقب ص ۶۸۔

(۲) مناقب ص ۹۳۔

کے پروانے بھی پیش خدمت کئے، لیکن تجرید و تفرید اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ ان کی جانب

نظر التفات بھی نہ کی، عسرت و تنگی اور فقر و فاقہ کے ساتھ طلبہ و فقراء کی تعلیم و تربیت

میں مشغول رہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ متعدد دن فاقے میں گذر جاتے، خانقاہ کے طلبہ

اور سالکین کی حالت بھی شیخ سے مختلف نہ تھی۔ انہیں حالات میں ایک شب شیخ و مرشد خواجہ

مبارک کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں ”اے فرید فردا ہدیہ از غیب رسد البتہ قبول خواہی

کرد، ہرگز رد نہ کنی۔ خواجہ کی پیشین گوئی کے مطابق دوسرے دن پرگنہ کسوارہ کے حاکم کا

فرستادہ پانچ سو بیگھ کا پروانہ لے کر حاضر ہو گیا۔ مناقب میں ہے:

”صبح آں وقت شخصے از نوکران بعضے حکام پرگنہ کسوارہ پروانہ پانصد بیگھ

زمین از برائے خرچ فقراء آورد ہر چند دل وے بد و مائل نہ بود اما ز جہت

اطاعت حکم حضرت خواجہ قبول کرد۔“ (۱)

”اسی صبح کو حاکم پرگنہ کسوارہ کا ایک ملازم پانچ سو بیگھ آراضی کا پروانہ لے کر حاضر

خدمت ہوا، ہر چند کہ شیخ کا دل قبول کرنے سے ابا کر رہا تھا لیکن مرشد کے حکم کی تعمیل میں

قبول کر لیا۔“

اس کے بعد سے تنگی معیشت اور فقر و فاقہ کی نوبت نہ آئی۔ رفاہیت و فراغت کے

اس دور میں مرشد کی وصیت ”ہرچہ از غیب رسد خرچ کنی“ پر شیخ نے بڑے حوصلہ سے عمل

کیا، جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شیخ یلین بنارسی رقمطراز ہیں:

”بعد ازاں خرچ مطبخ وے بحدے رسید کہ قریب صد کس از فقراء و طلبہ

و مہمان بر سفرہ وے حاضر شدند و از احوال ہمسایگان بہ کمال خبرگرفتی و ہمہ را

یومیہ طعام فرستادی و از اکثر مردم قبائل کما حقہ خبردار شدی بیچ کیے را محروم نہ

گذاشتی ہمہ را بقدر قسمت حصص معین ساختہ“ (۲)

”اس کے بعد شیخ کے مطبخ کا خرچ اس قدر وسیع ہو گیا کہ تقریباً سو افراد از قبیل طلبہ،

(۱) مناقب ص ۹۳۔

(۲) مناقب ص ۹۳۔

فقراء اور مہمانوں کے دسترخوان پر موجود رہتے، ہمسایوں کے یہاں روزانہ پکا پکا کھانا بھیجتے۔ اہل خاندان میں اکثر کے وظیفے بقدر حصہ متعین کر دیا اور کسی کو بھی محروم نہ رکھا۔“ اور خود شیخ کا اپنا معاملہ یہ تھا کہ ”اما خود دریافت شاقہ کشیدے و اکثر صائم ماندے“۔ اسی دور میں چند بار حرمین شریفین کے سفر میں بھی گئے اور حج و زیارت کی سعادت سے شرف یاب ہوئے۔

”گویند کہ وے چند مرتبہ بہ سعادت زیارت حرمین شریفین مشرف شدہ۔“ (۱)

کہتے ہیں کہ وہ (شیخ فرید) متعدد بار حرمین شریفین کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔

وفات اور مدفن

شیخ کے خلف اکبر شیخ محی الدین کسی تقریب کے سلسلے میں چنار تشریف لے گئے تھے اس وقت وہاں کا حاکم ایک افغانی پٹھان تھا، خان کو شیخ محی الدین کا گھوڑا بہت پسند آیا اور بزور طاقت شیخ محی الدین سے لے لیا۔ صاحبزادے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گھوڑے کی بازیابی کیلئے شیخ سے چنار چلنے کی درخواست کی۔ شیخ نے انہیں ہر چند سمجھایا اور صبر کی تلقین کی۔ لیکن ان کا اصرار و اضطراب بڑھتا ہی گیا۔ اس لئے ان کی رعایت خاطر میں اپنے برادر خرد شیخ داؤد اور چند دیگر متعلقین کی معیت میں براہ دریا چنار تشریف لے گئے۔ شیخ کے وہاں پہنچتے ہی ارادتمندوں اور عقیدت کیشوں کا ان کے گرد زبردست مجمع اکٹھا ہو گیا۔ شیخ کی اس مقبولیت اور ہر دلعزیزی کو دیکھ کر ظالم افغانی بھی خدمت میں حاضر ہوا، اور نہایت خاطر مدارات اور نیاز مندی کا مظاہرہ کیا اور شیخ کی تشریف آوری کے مقصد پر مطلع ہوتے ہی گھوڑا صاحبزادے کے حوالے کر دیا، اور جب شیخ وہاں سے واپس ہونے لگے تو مشالعت میں دریائے گنگا تک آیا جب شیخ مع رفقاء کے کشتی پر سوار ہو گئے تو خبث باطنی کی وجہ سے ملاح سے اشارہ کر دیا کہ کشتی ساحل تک پہنچنے نہ پائے، درمیان ہی میں کسی تدبیر سے غرق کر دینا۔ چنانچہ کشتی جب بیچ دھارے میں پہنچی ملاح نے حاکم چنار کی

ہدایت کے بموجب کشتی کو درست کرنے کے بہانے سے ایک پٹرے کو اکھاڑ دیا اور کشتی مع سواروں کے غرقاب ہو گئی۔ رفقاء میں چند افراد بدقت تمام جان بچا سکے۔ بقیہ تمام لوگ جن میں غریق بحر توحید، رئیس اہل تجرید حضرت شیخ فرید اور ان کے برادر عزیز شیخ داؤد بھی تھے۔ دریائے گنگا کی تیز موجوں کی آغوش میں اس طرح کھو گئے کہ تلاش بسیار کے باوجود بھی کچھ سراغ نہ مل سکا یہ حادثہ فاجعہ ۱۴ شوال ۹۰۶ھ کو وقوع میں آیا۔ (۱)

ایک غلطی کا ازالہ

محترم سید اقبال جون پوری اپنی مشہور تصنیف ”تاریخ شیراز ہند جون پور“ میں لکھتے ہیں ”(شیخ فرید) بحکم پیر سیر و سیاحت ختم کر کے جون پور تشریف لائے۔ محمود شرقی کے دور میں کچھ دنوں مشیر سلطنت رہے اس کے بعد جو گوشہ نشین ہوئے تو مرتے دم تک پھر قدم باہر نہ نکالا۔ آپ کا مزار محلہ شاہ گنج جون پور میں بعمارت پختہ و بلند موجود ہے۔ (ص ۶۰۹)

صاحب شیراز ہند کی تصریح کے بالمقابل محلہ سنار پورہ شہر بنارس میں واقع ایک مزار کی نسبت شیخ فرید کی جانب کی جاتی ہے اور سالانہ ۱۴ شوال کو اس کا عرس بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ دونوں روایتیں تاریخی اعتبار سے پایہ تحقیق سے گری ہوئی ہیں کیونکہ خاندان فریدی کے پروردہ شیخ یلین بناری خلیفہ و جانشین شیخ طیب بناری اور شیخ محمد رشید جو نیوری خلیفہ ارشد شیخ طیب موصوف دونوں اس پر متفق ہیں کہ شیخ فرید معہ برادر عزیز شیخ داؤد دریائے گنگا میں غرق ہو گئے اور تلاش بسیار کے باوجود دونوں کا جسد مبارک دستیاب نہ ہو سکا۔

حضرت وے با برادر عزیز میاں شیخ داؤد قدس سرہما پیدا نشند در آب غوطہ خورده ناپید شدند ہر چند بعض معتقدان وے دامہا انداختند و تفحص نمودند،

مگر اثرے ازاں بزرگاں یافتہ نشد۔ (۲)

”حضرت شیخ فرید معتمد شیخ داؤد، ظاہر نہ ہوئے پانی میں ڈوب کر ناپید ہو گئے۔ بعض معتقدوں نے جال بھی ڈالا مگر کوئی سراغ ان دونوں بزرگوں کا نہ مل سکا۔“

پھر چند سطر کے بعد لکھتے ہیں: ”قبر او بر روی زمین نیست“ یعنی ان کی قبر روئے زمین پر نہیں ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلامی ہند کے مشہور مورخ و محقق مولانا سید عبدالحی حسنی بریلوی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”نزہۃ النواظر“ میں گنج ارشدی کے حوالہ سے اسی تحقیق کو نقل کیا ہے ملاحظہ ہونے لخواطر ص ۲۵۸ ج ۴۔

رہا جون پور کا قیام اور مشیر سلطنت کا منصب تو یہ باتیں بھی بے اصل ہیں۔ مناقب اور گنج ارشدی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے آخر لمحہ تک شیخ کا قیام بنارس ہی میں رہا۔ سفر حج کے علاوہ کبھی بھی زاویہ عزلت سے قدم باہر نہیں نکالا۔ اور نہ مدت العمر کسی امیر یا حاکم کے دربار میں گئے۔ مناقب میں صاف موجود ہے کہ ”مدت عمر پیش حاکم کے دنیا داراں نہ رفت“ زندگی میں کبھی کسی حاکم اور دنیا دار کے پاس نہیں گئے۔

خلفائے عظام

شیخ فرید بنارس کے فیض صحبت سے بہت سے لوگوں نے اکتساب فضل و کمال کیا اور منزل تکمیل و ارشاد تک پہنچے۔ شیخ یلین لکھتے ہیں: ”وہ را خلفا بسیار بودند کہ بمرتبہ تکمیل رسیدند“ (۱) ان خلفائے بسیار میں مندرجہ ذیل حضرات نے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی اور ان کا سلسلہ فیض ایک عرصہ تک جاری رہا۔

(۱) شیخ حبیب اللہ بنارسی صاحبزادہ جانشین شیخ قدس سرہ۔

(۲) شیخ غیاث الدین حسن بن شیخ داؤد بنارسی رحمۃ اللہ علیہ۔

ان دونوں بزرگوں کے حالات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) میر سید بدہ بہاری

یہ اپنے وقت کے بزرگ عالم، عظیم المرتبت شیخ اور ماہر طبیب تھے۔ شیر شاہ سوری آپ کا

نہایت معتقد تھا اور بڑے نیاز مندانہ طور سے آپ سے پیش آتا تھا۔ اس وقت کے اکثر افغانی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل تھے۔ احکام شرعیہ کے اجراء میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ عبادت و ریاضت کے ساتھ طلبہ کو درس دینے کا بھی معمول تھا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی الارشاد کی ایک عمدہ شرح بھی لکھی۔ تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ آپ کا مزار موضع مسوئیں صوبہ بہار میں ہے۔ (۱)

(۴) شیخ مبارک محدث بنارس

شیخ مبارک بن شیخ ارزانی کے جد اعلیٰ رہتک سے ترک سکونت کر کے نواحی شہر بنارس میں بکھرانامی قریہ میں آباد ہو گئے تھے، اسی جگہ شیخ مبارک کی ولادت ہوئی، بنارس اور جونپور کے علمائے عصر سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی، فقہ، اصول فقہ، اور حدیث میں تبحر کا درجہ حاصل تھا، مشارق الانوار للصنعانی کی احادیث کو مشکوٰۃ کی ترتیب پر از سر نو مرتب کیا، اور اس کا نام مدارج الاخبار رکھا۔ اس علمی خدمت سے ماہ رجب ۹۵۲ھ کو فارغ ہوئے۔ آپ شیر شاہ سوری کے دربار سے منسلک تھے اور آخر میں ترقی کر کے منصب وزارت تک پہنچے۔ وزارت کی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ذکر و اذکار اور عبادت و ریاضت میں سر موفرق نہیں آنے دیتے تھے۔ اپنے مرشد شیخ فرید سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ ۹۸۰ھ یا ۹۸۱ھ میں وفات ہوئی۔ آپ کی اولاد بنارس اور جونپور میں آباد ہے۔ (۲)

(۵) شیخ لاؤجون پوری

شیخ لاؤ موضع قاضی پورہ متصل مڑیا ہوں ضلع جونپور کے رہنے والے تھے۔ پوربی زبان کے زبردست شاعر تھے۔ اسرار طریقت کو اشعار میں نہایت اچھوتے انداز میں بیان کرتے تھے۔ اپنے شیخ و مرشد شیخ فرید کے مناقب و محامد پر ایک طویل نظم پوربی زبان میں لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ عرصہ دراز تک اس دیار کے قوال اپنی محفلوں میں اسے گاتے تھے۔ مڑیا ہوں کے اطراف و جوانب میں شیخ لاؤ کے بہت سے مریدین تھے۔

(۱) مناقب ص ۹۴، و تذکرہ علمائے ہند ص ۳۱۔

(۲) مناقب ص ۹۴۔ و تجلی نور ص ۵۵، و نزہۃ النواظر ص ۲۷ ج ۴۔

قاضی پورہ ہی میں انتقال ہوا۔ اور وہیں دفن کئے گئے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اب بھی قاضی پورہ میں آباد ہیں۔ (۱)

اولاد و امجاد

مبدۂ فیاض نے شیخ فرید کو جملہ نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا، آپ کے تین صاحبزادے تھے جن میں سب سے بڑے شیخ محی الدین اور چھوٹے شیخ حبیب اللہ تھے۔

(۱) شیخ محی الدین بناری

یہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ جملہ علوم متداولہ کی تحصیل اپنے والد ماجد ہی سے کی تھی، تمام علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شیخ کی زندگی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

مناقب میں ہے:

”علم الزماں بندگی شیخ محی الدین کہ در علم حالت قوی داشت و جمع کتب متداولہ بحضور والد شریف تحصیل نمودہ بود و در می گفت در صلاح و تقوی بے نظیر بود۔“ (۲)

”علم الزماں بندگی شیخ محی الدین علم میں اچھی صلاحیت رکھتے تھے، مروجہ نصاب کی جملہ کتابوں کی تحصیل اپنے والد ہی سے کی تھی اور درس و تدریس کا مشغلہ تھا۔ صلاح و تقویٰ میں بے نظیر تھے۔“

حضرت شیخ فرید کے ہمراہ متعدد بار زیارت حرمین شریفین کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ مناقب میں ہے۔

(۱) مناقب ص ۹۵۔

(۲) مناقب ص ۹۵۔

”گویند کہ وہ ہمراہ پدر بزرگوار چند مرتبہ بحرین شریفین رفتہ و از سعادت طواف مشرف گشتہ“ (۱)

”بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ محی الدین پدر بزرگوار کے ہمراہ چند بار حرمین شریفین حاضر ہوئے اور طواف و زیارت کی سعادت لوٹی۔“

انہیں کے گھوڑے کی بازیابی کے سلسلے میں شیخ چنار شریف لے گئے تھے۔ اور واپسی میں غرقابی کا حادثہ پیش آیا۔ والد ماجد کی وفات کے بعد بنارس سے کچھ فاصلہ پر محی الدین پور کے نام سے ایک آبادی قائم کر کے وہیں رہنے لگے تھے۔ محی الدین پور ہی میں کسی تالاب کے ٹیلے پر آپ کا اور آپ کی اولاد کا مزار ہے۔ تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ (۲)

(۲) شیخ ابواللیث بناری

یہ شیخ کے منجملے صاحبزادے ہیں۔ علوم ظاہری سے چنداں تعلق نہیں تھا۔ ابتداء ہی سے ان پر جذب و سکر کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ سماع سے خاص ذوق تھا۔ بحالت سماع انتقال ہوا۔ آپ کا مزار محلہ بھدوں میں حضرت حواجہ مبارک کے مزار کے احاطہ میں ہے۔

(۳) شیخ حبیب اللہ بناری

یہ اپنے بھائیوں میں عمر کے اعتبار سے سب سے چھوٹے تھے۔ لیکن فضل و کمال میں سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ حضرت شیخ فرید انہیں بہت چاہتے تھے۔ اور ایک دم کے لئے بھی اپنے پاس سے الگ نہ ہونے دیتے تھے، اور ان کی تعلیم و تربیت پر بطور خاص توجہ فرماتے تھے، چنانچہ انہوں نے بھی اپنی فطری صلاحیتوں اور نیک بختی کی بناء پر اکتساب فیوض میں مطلق کوتاہی نہیں برتی اور شیخ کی حیات میں ہی سلوک کے منازل طے کر کے خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔ ان کے اوصاف و محامد کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ یسین لکھتے ہیں:

(۱) ایضاً۔ (۲) ایضاً۔

”کمالات باطنی آراستہ بود و باخلاق حمیدہ پیراستہ خدمت فقراء و مسافراں بوجہ اتم کردے بد لجوی غریباں کما حقہ نمودے و عمدہ خوبہائے وے آں بود کہ جملگی اوقات حاضر خدمت والد بزرگوار بودے و خلاف مرضی وے عمل نہ نمودے“ (۱)

”کمالات باطنی سے آراستہ اور اخلاق حمیدہ سے پیراستہ تھے فقراء اور مساکین کی خدمت و خاطر داری میں ذرا بھی تساہلی نہیں کرتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہمیشہ والد بزرگوار کی خدمت میں حاضر رہتے۔ اور ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے تھے۔“

شیخ فرید قدس سرہ کے سلسلے کو ان کے ذریعہ بڑا فروغ حاصل ہوا، اس دیار کے بے شمار افراد ان کے حلقہٴ ارادت میں داخل تھے اور بہت سے لوگ تکمیل و ارشاد تک پہنچے۔

مناقب میں ہے:

”اکثر طالبان از دولت توجہ وے بمقامات عالی رسیدند و وے شاہد مقصود دیدند۔“ (۲)

”اکثر طالبان (سلوک) ان کی توجہ کی برکت سے بلند مرتبہ پر پہنچے اور اپنے مقاصد سے ہمکنار ہوئے۔“

زندگی کے آخر ایام میں حج و زیارت کے ارادہ سے عازم مکہ معظمہ ہوئے مگر راستہ ہی میں فرنگی رہنوں نے کشتی پر حملہ کر کے غرق کر دیا اور تمام مسافروں کے ساتھ یہ بھی ڈوب کر جاں بحق ہو گئے۔

شیخ حبیب اللہ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ محمد حافظ بنارس مسند سجادگی پر بیٹھے۔ شیخ حافظ صاحب نسبت بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم و فاضل بھی تھے۔ تعلیم و تحصیل اپنے جد بزرگوار شیخ فرید اور خاندان کے دوسرے اکابر سے کی تھی۔

(۱) مناقب ص ۹۶۔

(۲) ایضاً ص ۹۹۔

عبادت و ریاضت میں اپنے وقت میں ممتاز مقام کے مالک تھے۔ شیخ یسین کا بیان ہے:

”وے جمع کتب متداول تحصیل نمودہ بعضے کتب بخدمت جد بزرگوار ہم خواندہ و نظر قبولیت ایشاں ہم می داشت وے در مجاہدہ و ریاضت یگانہ بود“ (۱)

”انہوں نے تمام متداول کتابوں کو پڑھا تھا، بعض کتابیں اپنے جد بزرگوار (شیخ فرید) سے بھی پڑھا۔ شیخ کے مقبول نظر تھے اور مجاہدہ و ریاضت میں بے نظیر۔“

اپنے بزرگوں کی طرح شیخ حافظ بھی مدت العمر امراء و سلاطین کے دربار میں کبھی نہیں گئے۔ ان کی وفات کے بعد شیخ چاندہ صاحب سجادہ ہوئے یہ شیخ حافظ کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ عمرت و تنگی کے باوجود فقراء و طلبہ کی خبر گیری بڑے فراخ حوصلگی سے کرتے تھے۔ ان کے دو صاحبزادے ہوئے۔ شیخ طاہر اور دیوان شاہ عبدالحفیظ، ان دونوں حضرات کے متعلق شیخ غلام رشید جو نیپوری کا بیان ہے کہ مشائخ کبار و قدوہ صغار و کبار بودند، اپنے والد کے بعد یہی شیخ طاہر جانشین ہوئے۔ یہ شیخ طیب بن معین بنارس کے خاص ارادتمندوں میں تھے۔ شریعت آباد میں ایک حجرہ بنا کر عرصہ تک ذکر و اشغال میں مشغول رہے، وہیں برنا و گنگا کے سنگم پر آپ نے ایک سنگین مسجد بھی تعمیر کرائی جو آج تک ان کی یادگار ہے۔ شیخ طیب کی وفات کے تین ماہ بعد ۱۰۴۲ھ میں انتقال کیا۔ (۲)

شیخ طاہر کی شادی دائرہٴ اجمل شاہ میں شیخ طاہر بن یحییٰ خوب اللہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جن کے بطن سے چار صاحبزادے شیخ عبدالرحمن، شیخ عبدالسبحان، شیخ عزیز اللہ، اور شیخ نور اللہ پیدا ہوئے۔ جو سب کے سب علم و فضل اور صلاح و تقویٰ سے آراستہ تھے۔

دوسرے صاحبزادے دیوان شاہ عبدالحفیظ کا عقد امر وہہ میں میر سید بڈھن امر و ہوی کی صبیہ سے ہوا تھا جن سے ایک صاحبزادہ شیخ فیض اللہ ہوئے۔ شیخ فیض اللہ بھی صاحب نسبت اور عظیم المرتبت بزرگ تھے، ان کی نسبت میر سید محمد تقی ظفر آبادی کی دختر سے ہوئی۔ جن سے تین بیٹے شیخ رضی، شیخ محمد رفیع اور شیخ سیف اللہ اور دو صاحبزادیاں

(۱) مشائخ بنارس ص ۱۲۔ (۲) مشائخ بنارس ص ۲۵۔

ہوئیں۔ شیخ محمد رضی کے صاحبزادے شیخ غلام حفیظ تھے، جن کی شادی شیخ رزق اللہ الہ آبادی کے یہاں ہوئی تھی۔ شیخ غلام حفیظ کے دو صاحبزادے صوفی صلاح الدین اور مولوی خیر الدین محمد پیدا ہوئے۔ مولوی خیر الدین نے اپنے وقت میں بڑا فروغ حاصل کیا۔ جملہ علوم میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک انگریزی حکومت سے منسلک رہے۔ آخر میں پنشن لے کر علیحدگی اختیار کر لی۔ اور راجہ بنارس کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مولوی خیر الدین نے بہت سی مفید کتابیں بطور علمی یادگار کے چھوڑیں، جن میں جون پورنامہ (تذکرۃ العلماء) اور بلونت نامہ نہایت اہم ہیں، تذکرۃ العلماء کا ایک مطبوعہ نسخہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے اور میری نظر سے گذر چکا ہے اور بلونت نامہ کا قلمی نسخہ راجہ بنارس رام نگر کے کتب خانہ میں ہے۔ (۱)

اس سلسلۃ الذہب کا ایک سلسلہ یہاں آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے سلسلہ کی ابتداء شیخ فرید بناری کے برادر خورد شیخ داؤد بناری سے ہوتی ہے۔ جس کی تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) حضرت شیخ داؤد بناریؒ

شیخ داؤد بن قطب بناری شیخ فرید کے چھوٹے بھائی تھے۔ انھیں کے ہمراہ بغرض تحصیل علم بنارس آئے۔ پھر شیخ فرید کی طرح یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ علوم و فنون کی تکمیل حضرت خواجہ مبارک بناری سے کی اور بیعت و ارادت کا تعلق اپنے برادرِ کلاں شیخ فرید سے قائم کیا۔ شیخ فرید کی اطاعت و خدمت کا حد درجہ اہتمام کرتے تھے۔ صاحب مناقب لکھتے ہیں:

”گویند کہ شیخ داؤد در زخرودی تا آخر وقت غیر از خدمت برادر کلاں کارے دیگر مقصود نبود حتی کہ بہ نوافل ہم کم پردازتے حکم وے را منتظر بودے، ہر چه

می فرمود ہمازاں ساختے۔“ (۲)

(۱) مکتوب شاہ بدیع الدین لکھنوی بنام غلام حفیظ بناری قلمی بخط مولوی خیر الدین جوہنوری۔

(۲) مناقب العارفین ص ۹۰۔

”بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ داؤد کو بچپن سے آخر عمر تک بجز شیخ فرید کی خدمت کے کوئی اور کام نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ان کی خدمت کی انجام دہی کے پیش نظر نوافل میں بھی کم ہی مشغول ہوتے ہمہ وقت حکم کے منتظر رہے اور جو کچھ وہ فرماتے اسی وقت اس کو پورا کرتے۔“

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد علماء و صلحاء کی طرح پوری زندگی درس و تدریس میں بسر کر دی۔ ۱۳ شوال ۹۰۶ھ کو شیخ فرید کے ساتھ دریائے گنگا میں غرق ہو کر درجہ شہادت سے مشرف ہوئے۔ شیخ داؤد علوم فنون کے ساتھ صلاح و تقویٰ سے بھی آراستہ تھے، لیکن انھوں نے اپنے آپ کو اس طرح گوشہ گمنامی میں رکھا کہ وہ شہرت و مقبولیت انہیں حاصل نہ ہو سکی جس کے یہ مستحق تھے۔

شیخ داؤد کے کل تین اولادیں ہوئیں۔ شیخ حسن، شیخ اللہ داد، اور ایک صاحبزادی۔ شیخ حسن اپنے فضل و کمال کے لحاظ سے کبار مشائخ چشت میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ حسن بناری

شیخ حسن کی علمی و دینی جلالت پر ان کے سبھی تذکرہ نگار متفق ہیں اور ہر ایک نے نہایت شاندار و پر شوکت الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ ولادت اور ابتدائی حالات پر لاعلمی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے، تلاش و جستجو کے بعد اتنا معلوم ہو سکا کہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل اپنے تایا شیخ فرید بناری سے کی۔

مناقب میں ہے:

اکثر کتب ہائے متداول رادر خدمت عم خرد شیخ الاسلام بندگی شیخ فرید بن قطب تحصیل نمودہ بود۔

”اکثر کتب مروجہ کی تعلیم اپنے تایا شیخ الاسلام بندگی شیخ فرید بن قطب الدین سے حاصل کی تھی۔“

ان کے علاوہ کبھی کسی استاذ کے آگے زانوے ادب تہہ کیا تھا یا نہیں اس بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی، لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ والد ماجد شیخ داؤد سے بھی کچھ ضرور پڑھا ہوگا

کیونکہ یہ بھی اپنے وقت کے ایک جید عالم اور کامیاب مدرس تھے اور شیخ فرید کی طرح درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اس لئے اغلب یہی ہے کہ ابتدائی تعلیم کا مرحلہ والد بزرگوار کے سایہ عاطفت میں طے ہوا ہوگا۔

علمی مقام

شیخ حسن بناری قدس سرہ جملہ علوم میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے، اس وقت کے علماء و فضلاء ان کی علمی جلال و عبقریت کے معترف تھے۔
شاہ سلیمان رقمطراز ہیں:

در علم ظاہری حالت قوی داشت فضلاء وقت منقاد وے بود و علماء زمان مطیع او (ص ۷۹)

”علم ظاہری میں قوی صلاحیت رکھتے تھے، اس وقت کے علماء و فضلاء نے ان کے سامنے سراعترا فخم کر دیا تھا۔“

شاہ سلیمان نے ایک دوسرے موقع پر اجلہ وقت و عازہ عہد کے وقیع الفاظ سے یاد کیا ہے۔ حضرت شیخ فرید بناری کو بھی ان کی علمی استعداد اور صلاحیت پر پورا اعتماد تھا اور اپنے مخصوص تلامذہ کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔

تدریس و تصنیف

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد اپنے بزرگوں کی طرح شیخ حسن نے بھی مسند تدریس کو زینت بخشی اور تشنگان علوم کی تسکین خاطر کا سامان فراہم کیا۔ آپ کے حلقہ درس سے ایک کثیر جماعت نے اکتساب فیض کیا جن میں اسدا العلماء شیخ نصیر الدین مصطفیٰ آبادی جھوسوی کا نام نامی سرفہرست ہے۔

تدریسی خدمات کے ساتھ تصنیف و تالیف کے ذریعہ بھی آپ نے علمی حلقہ کو مستفید کیا اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ کے تتبع میں

بطرز ارشاد فن صرف میں ایک کتاب تصنیف کی اور نام مرغوب الطالبین رکھا، علم نحو میں بھی ایک رسالہ سپرد قلم کیا۔

مناقب میں ہے:

و وے در علم صرف کتابے در طریق ارشاد ملک العلماء منضمین ز مثال نوشته
و آں را مرغوب الطالبین نام نہاد و رسالہ در علم نحو ہم نوشته (ص ۷۹)

”اور انھوں نے (شیخ حسن) فن صرف میں ایک کتاب ملک العلماء کی ارشاد کے طرز پر مثالوں کو بیان کرتے ہوئے تحریر کی اور اس کا نام مرغوب الطالبین رکھا اور فن نحو میں بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔“

مرغوب الطالبین اب دنیا سے ناپید ہو چکی ہے، اس لئے اس کے بارے میں کچھ لکھنا دشوار ہے۔ البتہ قاضی شہاب الدین کی ارشاد کے ساتھ مشابہت اس کی اہمیت و افادیت کی جانب مشیر ضرور ہے۔

احسان و سلوک

سلسلہ تدریس نہایت شان و شوکت اور وقار و تمکنت کے ساتھ جاری تھا۔ تشنگان علوم دور و دیار سے آ کر اپنی تشنگی بھارے تھے، عین اسی ہنگامہ قال اقول میں جاذب حقیقی نے اپنی جانب کھینچنا شروع کیا۔ درس و تدریس سے دل لیکھت سرد پڑ گیا۔ مدرسہ کی زندگی سے وحشت ہونے لگی اور خانقاہ کے ماحول سے انس بڑھنے لگا۔ حالت کے اس تغیر سے اپنے استاذ حضرت شیخ الاسلام فرید بناری کو مطلع کیا۔ اور سلسلہ درس کو موقوف کر کے راہ طریقت میں قدم رکھنے کی اجازت طلب کی۔ شیخ کی خواہش تھی کہ ابھی کچھ دنوں تک علمی مشاغل کو برقرار رکھیں، لیکن ادھر تو ذہنی و قلبی کیفیات میں انقلاب عظیم پیدا ہو چکا تھا، عشق الہی نے دل میں جو آگ لگا دی تھی، اس کے بجھانے کے لئے فنون کے خشک مباحث کے بجائے آخر شب کی آہ سرد کی ضرورت تھی۔ بالآخر مرشد کامل نے حالات کے پیش نظر بیعت فرما کر اذکار و اوراد کی تلقین کی، اور ریاضت و مجاہدہ کا حکم دیا۔

صاحب مناقب لکھتے ہیں:

چوں طبیعت از درس علوم سر شد کتاب ہائے راد گوشہ نہاد و از مدرسہ در کج
فقرا می افتاد و احوال خود بخند خدمت مخدوم و مرئی و عم خود عرض کرد ایشاں ہر چند
می خواستند کہ چند روز در استفادہ علم مشغول باشند ہر گاہ شوق ایشاں غالب
دید بعد ارادت و عنایت بہ تشریف خرقہ بطریق حضرت خواجگان چشت
و آخر العراوقات تحفظ انفس و مجاہدہ نفس فرمود (ص ۷۹)

”جب طبیعت علوم ظاہری کے درس سے سرد پڑ گئی تو کتابوں کو ایک کنارے رکھ کر
گوشہ فقراء میں شامل ہو گئے اور اپنے احوال سے حضرت شیخ فرید کو مطلع کیا شیخ کی خواہش
اگرچہ یہی تھی کہ ابھی سلسلہ درس کو جاری رکھیں، لیکن ان کے شوق فراوان کو دیکھ کر بطریق
خواجگان چشت بیعت کیا اور تادم العمر حفاظت اوقات اور ریاضت و مجاہدہ کی تلقین فرمائی۔“
بیعت و تلقین کے بعد آبادی سے باہر راجہ بنارس کے قلعہ کے کھنڈرات کے متصل
ایک حجرہ بنا کر عزت گزریں ہو کر اذکار و اشغال، اوراد اور دیگر مشاغل سلوک میں منہمک
ہو گئے، مسلسل روزہ پر روزہ رکھتے اور افطار میں خشک جو کی روٹی پر اکتفا فرماتے۔ ان ایام
میں صرف اوقات نماز یا شیخ و مرشد اور والد بزرگوار کی زیارت کی غرض سے شہر میں آتے،
ورنہ ہمہ وقت اسی ویرانہ میں تنہا مجاہدات و عبادات میں مشغول رہتے تھے تا آنکہ درجہ کمال
کو پہنچے اور خرقہ خلافت سے مشرف ہوئے۔

مناقب میں ہے:

تا کہ بکمالات رسید و بمقام عالی و مرتقی گردید و اجازت تلقین طالبان یافت
(ص ۸۰)

”یہاں تک کہ درجہ کمال تک پہنچے اور بلند مقام پر فائز ہو کر خلافت و اجازت سے
مشرف ہوئے۔“

خلافت سے شرف یاب ہونے کے بعد شیخ حسن قدس سرہ نے محفل ارشاد و تلقین کو
سجایا اور رشد و ہدایت کے آب زلال سے تشنگان معرفت و حقیقت کے تسکین دل کا سامان

کرنے کے ساتھ ان کے ساتھ قلب و روح کے تزکیہ و تصفیہ کی سعی میں ہمہ تن مصروف
ہو گئے اور اس ویرانہ سے منتقل ہو کر مخلوق خدا کی سہولت کی خاطر علوی پورہ میں قیام فرمایا،
اور زندگی کے آخری سات سال یہیں بسر کئے۔ اس زمانہ میں ہمہ وقت استغراق اور حضور
دائمی کے لذت و سرور سے محمور رہتے تھے۔ اس محویت کے عالم میں گرد و پیش کی کچھ خبر نہ
رہتی تھی، نماز پنجگانہ کے وقت خادم کان میں اللہ اکبر کی صدا بلند کرتا تھا تو کچھ دیر کے لئے
افاقہ ہو جاتا اور نماز سے فراغت کے بعد پھر وہی کیفیت عود کر آتی۔ (مناقب ۸۰)

سفر حج اور واقعہ شہادت

انہیں حالات میں حرمین شریفین کی زیارت کا اشتیاق ہوا اور اس شدت کے ساتھ
کہ تمام جذبات و کیفیات پر غالب ہو گیا۔ اس کیفیت سے بھی اپنے شیخ و مرشد حضرت شیخ
الاسلام فرید بنارسی اور والد ماجد شیخ داؤد کو مطلع کیا اور دونوں بزرگوں سے سفر کی اجازت
طلب کی۔ چونکہ شیخ داؤد کو ان سے عشق کی حد تک محبت تھی، اس لئے مفارقت پر راضی نہیں
ہوئے، ان کی رعایت خاطر میں شیخ فرید نے بھی سفر کی اجازت نہ دی، لیکن شیخ حسن شوق
زیارت میں بیخود تھے، حتیٰ کہ اسی عالم وارفتگی میں اپنی جائے اقامت علوی پورہ ہی سے
احرام باندھ لیا اور تقریباً چھ ماہ تک اسی حالت میں وہاں مقیم رہے۔ ان کی اس حالت کو
دیکھ کر شیخ فرید نے شیخ داؤد کو رخصت کی اجازت پر رضامند کر کے انہیں سفر کی اجازت
مرحمت فرمائی۔ شاہ یلین بنارسی کا بیان ہے کہ جس وقت شیخ حسن اپنے حجرہ سے بقصد سفر
نکلے تو ایک زبردست مجمع ان کی مشایعت میں چلنے کے لئے شہر سے امنڈ آیا جنہیں چند میل
کے بعد شیخ نے بصد اصرار واپس کیا، لیکن چند حضرات کسی طرح ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ
ہوئے۔ چنانچہ انہیں ہمراہ لے کر پایادہ منزل حبیب کی جانب روانہ ہو گئے راہ میں مصطفیٰ
آباد کے پاس پہنچے تو اپنے تلمیذ رشید اور مرید خاص حضرت اسد العلماء شیخ نصیر الدین کو
خدمت میں طلب کیا اور چند روز ان کی خواہش پر وہاں قیام فرمایا اور اپنی توجہ خاص سے
نواز کر اجازت و خلافت سے امتیاز بخشا۔ پھر انہیں اپنا نائب و قائم مقام بنا کر رفقہ سفر کے

ساتھ بجانب منزل روانہ ہو گئے۔ اسد العلماء نے بھی رفاقت و معیت کی خواہش ظاہر کی تو انہیں یہ کہہ کر روک دیا ”عجب کہ من شادریں ملک بجائے خود میدارم و شمار ہو سے دیگر می شود“ (مناقب ص ۷۴) مجبوراً اسد العلماء نے رفاقت کے ارادہ کو فسخ کر دیا۔ اور اظہار نیاز مندی میں ایک نہایت نفیس گھوڑا سواری کیلئے پیش خدمت کیا، شیخ نے اسے بھی رد کر دیا اور فرمایا کہ ”میاں نصیر بی بی رابعہ بصریہ ز نے بود چنیں گویند کہ وقتے بطواف کعبہ می رفت در ہر گامے دو گانہ می گذارد حسن اگر چہ مدنیست اما نام مرد در داگر ہر گامے دو گانہ نمی تو اس گذارد بارے بقدم خود برود۔“ (ص ۷۴)

الحاصل حضرت اسد العلماء کو رخصت کر کے وہاں سے روانہ ہوئے اور خشکی کی مسافت کو پیادہ پا طے کر کے دریا سے کشتی پر سوار ہوئے۔ چند یوم کشتی امن و سلامتی کے ساتھ چلتی رہی، ایک دن اچانک بحری ڈاکوؤں نے کشتی پر حملہ کر دیا۔ شیخ نے نہایت جرأت و ہمت سے ان کا مقابلہ کیا اور کئی ڈاکوؤں کو جہنم رسید بھی کیا۔ لیکن اسی ہنگامہ جنگ و پیکار میں کسی نے آپ کیے سینہ مبارک پر نیزہ مارا جو پارا تر گیا اور یہ عاشق جاننا بیت اللہ کے بجائے رب اللہیت سے جا ملا۔ رفقائے سفر میں شیخ اسماعیل نامی ایک شخص کے علاوہ سبھی کام آگئے۔ شیخ اسماعیل کو ڈاکوؤں نے زندہ گرفتار کر لیا اور ملک روم میں لے جا کر کسی مسلمان تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ شیخ اسماعیل نے اس تاجر سے شیخ اور دیگر رفقائے سفر کے جانگداز حادثہ کو بیان کیا۔ اسے ان کے حال زار پر بہت رحم آیا اور انہیں رہا کر کے حجاز مقدس تک پہنچا دیا۔ یہ حج و زیارت سے فارغ ہو کر ایک سال کے بعد بنارس واپس لوٹے اور اس المناک واقعہ کی خبر دی۔

تحقیق تاریخ شہادت

شیخ حسن بناری کی تاریخ شہادت ۴ ربیع الاول پر ان کے تمام تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے لیکن سنہ میں عجیب اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ گنج ارشدی اور بحرذخار میں سن شہادت ۹۶۰ھ تحریر ہے اسی روایت کو صاحب نزہہ نے گنج ارشدی کے حوالے سے اور

چودھری بنی اللہ سندیلوی نے مرقع بنارس میں بحرذخار کے حوالہ سے لیا ہے اور تذکرہ مشائخ بنارس میں بغیر کسی حوالہ کے ۹۰۰ھ درج ہے۔ ان تصریحات کے خلاف شیخ سلیمان بناری نے ۹۰۶ھ لکھا ہے۔

مناقب کی عبارت یہ ہے:

چند روز بہ سلامت و عاقبت بر کشتی رفت تا کہ روزے فرنگیاں بر جماعت مسلمان تاختہ بازار قتل ایشاں پر داختہ آنحضرت ہم دست بسلاح برود بعضے کافراں را قتل نمود بعد ازاں کافرے نیزہ بر سینہ مبارک وے زدو بمرتبہ شہادت رسید و جان در راہ دوست فدا ساخت و کان ذالک فی رابع

جمادی الاول سنہ ست و تسع مائتہ (ص ۸۳، ۸۴)

”چند یوم امن و سلامتی کے ساتھ کشتی پر سفر جاری رکھا کہ اچانک ایک دن فرنگیوں کی جماعت نے غارت گری مچادی اور قتل کا بازار گرم کر دیا، شاہ حسن نے بھی ہتھیار سنبھالا اور بعض کافروں کو قتل کیا، بعد ازاں ایک کافر نے ان کے سینہ مبارک پر نیزہ مارا جس سے ان کی شہادت واقع ہو گئی یہ حادثہ ۴ جمادی الاول ۹۰۶ھ کو پیش آیا“

اور اس سلسلے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جس دن یہ حادثہ رونما ہوا، اسی دن بعد نماز ظہر حضرت شیخ فرید نے مصلی اٹھایا تو اس کے نیچے سے شیخ حسن کی تسبیح اور کنگھی برآمد ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی شیخ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا کہ پیشوا ہمیں ساعت ازیں عالم رفت و در دریا شہید گشت۔ (ص ۸۴)

اس واقعہ نیز گذشتہ سطور سے معلوم ہو چکا ہے کہ جس وقت شاہ حسن سفر حج کے لئے بنارس سے روانہ ہوئے تھے، اس وقت حضرت شیخ فرید و شیخ داؤد باحیات تھے۔ اور ان دونوں حضرات کی وفات بحسب تصریح مناقب و گنج ارشدی ۹۰۶ھ میں ہوئی ہے۔ اس لئے حضرت شاہ حسن کی وفات اسی سن میں ماننی پڑے گی یا اس سے کچھ پہلے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مناقب اور گنج ارشدی دونوں میں بصراحت موجود ہے کہ شہادت کے وقت ان کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ لیکن شہادت کے سن کو ۹۶۰ھ تسلیم کر لینے کی صورت

میں ان کی عمر کم از کم ۸۵، ۸۶ سال کی ماننی پڑے گی۔ کیونکہ شیخ فرید کی وفات سے سات سال پیشتر انہیں خلافت مل چکی تھی۔ خلافت سے پہلے تعلیم و تحصیل اور درس و تدریس میں طویل عرصہ تک مشغول رہ چکے تھے۔ ان وجوہ سے صاحب مناقب کی بیان کردہ تاریخ ہی درست ہے۔ اغلب گمان یہ ہے کہ گنج ارشدی کے کاتب نے ۹۰۶ھ لکھنے کے بجائے غلطی سے ۹۶۰ھ لکھ دیا ہوگا۔ (کیونکہ ہندسوں میں اس طرح کی غلطی کا ہوجانا بعید نہیں ہے) بعد کے تذکرہ نگاروں نے اسی تاریخ کو اپنی تصنیفات میں درج کر دیا۔ اس طرح سے یہ غلطی چل پڑی۔ واللہ اعلم۔

خلفاء و اولاد

حضرت شاہ حسن نے وفات کے بعد تین بیٹے شیخ مسعود، شیخ معین الدین، شیخ نصیر الدین اور ایک خلیفہ و جانشین اسد العلماء شیخ نصیر الدین مصطفیٰ آبادی کو بطور یادگار چھوڑا۔ شاہ صاحب کے مریدین و متعلقین میں اسد العلماء کے علاوہ کسی اور کو یہ دولت و نعمت حاصل نہ ہو سکی۔ (۱)

مناقب میں ہے:

حضرت شاہ راغیر از حضرت اسد العلماء خلیفہ دیگر نبود و آنچه گفتہ اند پیرا یک مرید کافیسٹ گویا در حق اوست (مناقب ص ۸۷)

”شاہ صاحب سے خلافت صرف اسد العلماء کو حاصل ہوئی۔ صوفیاء کا مقولہ پیرا ایک مرید کافیسٹ گویا آپ ہی کی شان میں کہا گیا تھا۔“

(۱) مولانا عبدالسلام نعمانی نے تذکرہ مشائخ بنارس میں حضرت شیخ حسن بناری کے صاحبزادے شیخ نصیر الدین کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ”حضرت شاہ یسین صاحب مرتب مناقب العارفین تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت بنگی شاہ حسن کا حضرت نصیر الدین کے علاوہ کوئی دوسرا خلیفہ نہیں تھا“ تذکرہ ص ۱۵، یہ حوالہ اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن صاحب مناقب کی اس عبارت کے مصداق حضرت شاہ حسن کے صاحبزادے شیخ نصیر الدین نہیں بلکہ اسد العلماء نصیر الدین جھوسوی ہیں چنانچہ مناقب کی یہ عبارت ملاحظہ ہو: ”حضرت شاہ راغیر از اسد العلماء خلیفہ دیگر نہ برد“ ص ۸۷۔

اسد العلماء نصیر الدین مصطفیٰ آبادی

شیخ نصیر الدین بن شیخ بدیع اللہ صدیقی اپنے وقت میں جامع شریعت و طریقت تھے، دس سال کی عمر میں بنارس آ کر شیخ فرید بناری کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ اور اپنی خدا داد صلاحیتوں کی بناء پر ابتدا ہی سے ان کی توجہات کے مرکز بن گئے۔ شیخ نے صرف و نحو کی چند کتابیں پڑھا کر انہیں اپنے برادر زادہ و تلمیذ و خلیفہ حضرت شاہ حسن بناری کے حوالہ کر دیا اور فرمایا کہ ”بابا ہوا میں بار سعادت آثار حوالہ شمار نمودم در تربیت و سعی کما ینبغی خواہد نمود“ شاہ صاحب نے شیخ و مرشد کے فرمان کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت پر بطور خاص توجہ دی اور ایک عرصہ تک اپنی صحبت میں رکھ کر مختلف فنون کی تعلیم دی، پھر مزید تعلیم کے لئے جون پور بھیج دیا، وہاں حضرت شیخ چند محدث جو پوری کے حلقہ درس میں شامل ہو کر علوم متداولہ کی تحصیل کی جون پور کے زمانہ قیام میں ایک بار حضرت شیخ کی طلب پر بنارس حاضر ہوئے، اتفاق سے جس وقت یہ مجلس میں پہنچے اسی وقت ایک نو وارد طالب علم بھی خانقاہ میں پہنچا اور نہایت پیبا کی کے ساتھ دریافت کیا کہ ”شیخ فرید کجا است ازاں روز کہ در بنارس رسیدہ ام در دیوار نام اومی گوید اورا بہ پیتم کہ چہ طور است“۔ یعنی جب سے بنارس آیا ہوں شیخ فرید کا شہرہ و آواز سن رہا ہوں، آخر میں بھی دیکھوں کہ وہ کس درجہ کے آدمی ہیں، حاضرین کو اس کی یہ بے باکی و بے ادبی بہت شاق گذری، لیکن شیخ نے نہایت تواضع و انکساری کے ساتھ فرمایا کہ: ”فرید میں ہی ہوں فرمائیے کیا ضرورت ہے“ اس نے یہ سنتے ہی قریب پہنچ کر علمی مذاکرہ شروع کر دیا۔ شیخ نصیر نے آگے بڑھ کر اس کے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیا، پھر خود بھی چند سوالات کئے جس کے جوابات اس سے نہ بن پڑے اور شرمندہ ہو کر مجلس کے ایک گوشہ میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا حضرت شیخ فرید کو شیخ نصیر کی حاضر دماغی اور جودت طبع سے بڑی خوشی ہوئی۔ اور اسی مجلس میں اسد العلماء کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اور فرط مسرت میں فرمایا کہ میں تمہیں اپنے حلقہ ارادت میں داخل کر کے ذکر و وظائف کی تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر شیخ نصیر نے عرض کیا کہ حضرت نے

جس وقت مجھے حضرت شاہ حسن کے سپرد فرمایا تھا اسی وقت سے میرا یہ خیال ہے کہ یہ نعمت و برکت مجھے شاہ صاحب کے واسطے سے حاصل ہوگی، اس جواب سے انہیں مزید خوشی ہوئی اور اسی وقت خادم خاص کے ذریعہ شاہ صاحب کو علوی پورہ سے بلوا کر شیخ نصیر کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا:

بابا ہو ہر چہ شمار ازین فقیر و از مردان غیب رسیده از شیخ نصیر الدین در بیخ
نخواہداشت و ہمہ خواہند و تو۔

”اے بابا آپ کو اس فقیر اور مردان غیب سے جو نعمتیں حاصل ہوئی ہیں وہ سب شیخ نصیر کو بخش دیجئے گا۔“

اس گفتگو کے بعد شیخ نصیر شاہ صاحب کے ہمراہ ان کے حجرہ واقع علوی پورہ میں آئے اور چاہا کہ یہیں رہ کر سلوک و طریقت کے اشتغال میں لگ جائیں، مگر خلاف توقع شاہ صاحب نے فرمایا جاؤ تعلیم مکمل کر کے درس و تدریس کی خدمت انجام دو، تمہارا حصہ وقت پر تمہیں مل جائے گا۔ چنانچہ شیخ نصیر پھر جون پور آئے اور علوم مروجہ کی تعلیم مکمل کر کے اپنے آبائی وطن مصطفیٰ آباد میں درس و افادہ کی محفل آراستہ کی، ایک عرصہ کے بعد جب شاہ صاحب سفر حج کیلئے نکلے تو مصطفیٰ آباد جا کر انہیں اپنی نوازشات اور توجہات سے نوازا اور تصرفات باطنی کے ذریعہ انہیں درجہ کمال پر پہنچا کر خلافت و اجازت عطا کی اور ساتھ ہی مصطفیٰ آباد کے بجائے جوسی میں قیام کا حکم دیا۔ اسد العلماء نے شیخ کے حکم کو اس طرح پورا کیا کہ مرکز بھی وہیں رہے۔

خلافت حاصل ہو جانے کے بعد تمام علاقے سے الگ ہو کر ریاضت و مجاہدہ میں ہمہ تن لگ گئے۔ شاہ سلیمان کا بیان ہے کہ دیگر مجاہدات کے علاوہ تقریباً تیس بار چلہ میں بیٹھے، کثرت عبادت و ریاضت سے باطنی صفائی اس درجہ حاصل ہوگئی کہ کشف قلوب و مکاشفہ ارواح کے درجہ پر فائز ہوئے۔

ان فضائل کے ساتھ داد و دہش اور جو دو سخا میں بے نظیر تھے آپ کے درس سے کبھی کوئی خالی ہاتھ واپس نہیں ہوا۔ آخر میں اکل و شرب سے بھی ایک حد تک بے نیازی ہوگئی تھی۔

صرف شور یا دودھ پی لیا کرتے تھے۔ وفات سے دو سال قبل دودھ پینا بھی ترک کر دیا تھا۔ اور فرماتے تھے کہ روح کی طرح معدہ کو بھی صاف رکھنا چاہئے۔

اتباع شریعت کا اس درجہ غلبہ تھا کہ وفات سے ایک روز قبل اپنے صاحبزادہ حضرت خواجہ کلاں کو حکم دیا کہ شرح و قالیہ لاؤ تا کہ تمہیں تجہیز و تکفین کے مسائل سکھا دوں۔ انہوں نے ہر چند عرض کیا کہ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ مجھے اس کے مسائل معلوم ہیں، لیکن اصرار کر کے کتاب منگوائی اور غسل و کفن کے جملہ مسائل نہایت شرح و بسط سے ان کے سامنے بیان کیا اور فرمایا کہ اسی طرح سے غسل و کفن دینا، اس کے بعد صاحبزادہ کو کچھ وصیتیں فرمائیں اور خرچہ خلافت عطا کیا۔

اسد العلماء کی یہ آخری گفتگو تھی، اس کے بعد پھر کسی سے کوئی بات چیت نہ کی اور ہمہ تن محبوب حقیقی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ بالآخر شب پنجشنبہ ۲۰ ربیع الاول ۹۸۰ھ کو معین ذکر کے وقت روح نفس عنصری سے پرواز کر کے جوار رحمت میں پہنچ گئی۔ ایام مرض میں احباب و اعزہ دو علاج کے لئے کہتے تو فرماتے تھے کہ اس مرض کی دو القائے حبیب کے سوا کچھ نہیں، لہذا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ (مناقب از ص ۶۶ تا ۷۸)

حضرت شاہ حسن کی اولاد میں بالترتیب سب سے بڑے شیخ مسعود تھے۔ ان کے بعد شیخ معین الدین اور سب سے چھوٹے شیخ نصیر الدین تھے جو معین عالم شباب میں لا ولد فوت ہو گئے۔

شیخ مسعود بن حسن بنارس

ابھی یہ سن رشد کو بھی پہنچنے نہ پائے تھے کہ والد بزرگوار کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ اس لئے ان سے استفادہ کا موقع نہ مل سکا۔ ان کی رحلت کے بعد شیخ فرید بن شیخ بدہ حقانی جون پوری کے حلقہ درس میں شامل ہو کر علوم و فنون کی تحصیل کی اور انہیں سے بیعت بھی ہوئے۔ شیخ فرید نے ان کی تعلیم و تربیت مکمل کر کے انہیں حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار جون پوری متوفی ۹۷۵ھ کی خدمت میں دہلی بھیج دیا، وہاں دو سال رہ کر سلوک کی

تکمیل کی اور خرقہٴ خلافت سے مشرف ہو کر بنارس واپس آئے اور اپنے آباء و اجداد کے طریق پر درس و تدریس اور ارشاد و تلقین میں پوری زندگی گزار دی۔ شیخ مسعود نے اپنی دینی سرگرمیوں کے لئے منڈواڈیہہ بنارس کو منتخب کیا جو آگے چل کر ان کے برادر زادہ شاہ طیب بن معین بناری کے طفیل رشد و ہدایت اور تبلیغ و تلقین کا ایک عظیم مرکز بنا۔

شیخ مسعود کا قیام تاحیات منڈواڈیہہ ہی میں رہا جہاں وہ طالبین کی اصلاح و تربیت کے ساتھ ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ وفات کے وقت شاہ طیب کو بلایا مگر اتفاق سے وہ موجود نہیں تھے تو بڑی حسرت و یاس سے فرمایا کہ بندہ کی خواہش تھی کہ جو کچھ بزرگوں سے ملا ہے وہ اس فرزند کے حوالہ کر دوں، اس کے چند گھنٹے کے بعد وفات ہو گئی۔ منڈواڈیہہ میں بڑے روضہ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات اور تفصیلی حالات کا علم نہ ہو سکا۔ (مناقب ص ۸۵، ۸۶)

شیخ معین الدین بناری

حضرت شاہ حسن کے منجھلے صاحبزادے تھے، تعلیم و تحصیل اور بیعت و ارادت کا تعلق شیخ فرید بن شیخ بدہ حقانی سے تھا، عبادت و ریاضت اور وجود و سخا میں یگانہ وقت تھے طلباء و فقراء کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ بعالم شباب تیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اور یادگار میں صرف ایک دس سالہ بچے کو چھوڑا جس نے اپنے فضل و کمال، زہد و ورع، تقویٰ و تدین، اور ارشاد و تلقین کے ذریعہ خانوادہ فریدی و داؤدی کے نام پر شہرت دوام کی مہر ثبت کر دی۔ یہی وہ فخر خاندان ہے جسے دنیا شاہ طیب بن معین کے نام سے جانتی ہے۔ شیخ معین کا مزار بھی منڈواڈیہہ تالاب کے کنارے چبوترہ پر ہے اور عوام میں بڑی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔

شیخ المشائخ شاہ طیب بناری

حضرت شاہ طیب بناری گیارہویں صدی کے علماء میں جامع شریعت و طریقت

تھے۔ انھوں نے اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے مدرسہ و خانقاہ دونوں کو آباد رکھا۔ ان کے اصلاحی و تبلیغی کارنامے، آج بھی تاریخ کے صفحات میں نمایاں ہیں اور اپنے ہر تذکرہ نگار سے خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ یسین بناری نے ان الفاظ سے انہیں یاد کیا ہے:

”آں فردیگانہ آں غوث زمانہ آں جامع معانی و دقائق آں منبع اسرار و دقائق آں نہنگ دریائے شریعت آں سیر پیشہ طریقت آں شاہباز عالم ملکوت آں بلند پرواز بیضائے لاہوت آں متمکن در مقام تمکین حضرت بندگی شیخ طیب بن معین۔“ (مناقب ص ۴۳)

شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی نے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے:

”وے را کمالات عالی و حالات لازوال بودہ اند آخر آخر بدوام مشاہدہ رسیدہ بود۔“

(بجز خاص ۱۰۰)

مولانا عبدالحی حسنی نے یوں مدح سرائی کی ہے:

”الشیخ الصالح طیب بن معین۔ کان زاہداً متقللاً متورعاً قنوعاً بشوشاً طیب النفس۔“

(نزهہ ص ۱۹۱ ج ۵)

تعلیم و تحصیل اور ابتدائی حالات

شاہ صاحب کی تاریخ ولادت کی تصریح کہیں نہیں ملتی۔ شیخ یسین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ”والد شریف وے شیخ معین وے رادہ سالہ گذاشتہ خود بجوار رحمت حق پیوست۔“ یعنی ان کے والد انہیں دس سال کی عمر کا چھوڑ کر انتقال کر گئے، والد بزرگوار کی رحلت کے بعد اپنی پھوپھی کی جوار شفقت میں پرورش پائی۔ قرآن حکیم اور فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ عربی کی ابتداء استاذ الفضلاء شیخ نظام الدین بناری سے کی۔ عہد طالب علمی ہی سے شاہ صاحب کے اخلاق و اطوار نہایت پسندیدہ تھے۔ صلاح و تقویٰ، عفت و پاکدامنی اسی وقت سے ان کے ہر قول و عمل سے ظاہر ہوتی تھی۔ ان اوصاف حمیدہ کے پیش نظر شیخ نظام نے ابتدا ہی میں یہ پیشین گوئی کر دی تھی۔

ازیں پسر بوئے مشیخت و مقتدائی می آید جہانے از برکات انفاس وے

نصیب خواہند یافت و اس خاندان از روشن خواہد شد (مناقب ص ۴)
 ”اس بچے سے مشیخت و بزرگی کی بو آ رہی ہے ایک جہاں اس کی برکت سے نفع حاصل کرے گا اور خاندان کا نام اس سے روشن ہوگا۔“

شیخ نظام الدین بناری کی درسگاہ میں صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھ کر جون پور کا علمی سفر کیا اور وہاں کے بعض اساتذہ سے نحو اور معانی کے فن کو مکمل کیا، پھر شیخ نور اللہ (۱) بن طلحہ جون پوری متوفی ۱۰۱۲ھ سے شرح وقایہ مکمل اور حسامی کے کچھ اجزاء کی تحصیل کی۔ دوران تعلیم میں ایک بار مکان تشریف لائے تو اہل خاندان کے اصرار پر رشتہ ازدواجی سے منسلک ہو گئے۔ جس کی بناء پر تعلیم و تحصیل کے سلسلے میں تقریباً تین سال کا وقفہ ہو گیا۔

شیخ یسین لکھتے ہیں:

پس بملازمت افضل العصر علم الدہر شیخ نور اللہ انصاری ہروی، شرح وقایہ تمام خواند و جزوے حسامی بعد ازاں بتقریب کار خیر بخانہ آمد و متاہل شد بعد کدخدائی از خواندن باز ماند و سالی دوسر در خواندن تفرقہ گذارند (ص ۴)

”پھر افضل العصر علم الدہر شیخ نور اللہ انصاری ہروی کی خدمت میں شرح وقایہ مکمل اور حسامی کے چند اجزاء کی تحصیل کی اس کے بعد گھر آئے اور شادی کر لی۔ نکاح کے بعد سلسلہ تعلیمی جاری نہ رکھ سکے اور دو تین سال کا وقفہ ہو گیا۔“

تین سال کے تعلیمی انقطاع کے بعد پھر جون پور تشریف لے گئے اور اس وقت کے مروجہ نصاب فقہ و اصول فقہ کی تعلیم مکمل کر کے دینیات سے فراغت حاصل کی۔ (ص ۴) تعلیم سے فراغت کے بعد مزید ایک سال اور جون پور میں مقیم رہے، شاہ صاحب

(۱) شیخ نور اللہ بن طلحہ جون پوری ہروی علماء جونپور میں شریعت و طریقت کے جامع تھے، علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل اپنے برادر کلاں شیخ عبد الجلیل جونپوری سے کی درس و تدریس اور مطالعہ کتب میں بڑا انہماک تھا، علمی تبحر میں خاص شہرت کے مالک تھے عہد عالمگیری میں متعدد عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ ۱۰۱۲ھ میں وفات ہوئی۔ مزار شہر جونپور میں ہے۔ تجلی نور۔

کا یہ یک سالہ قیام کس مقصد کے تحت تھا اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ شیخ یسین مبہم طور پر لکھتے ہیں کہ: ”بعد ازاں قریب یکسال در جونپور بتقریب بعض امور توقف فرمودہ بود۔“ یعنی تعلیم سے فراغت کے بعد ایک سال مزید بعض امور کے تحت جون پور میں ٹھہرے رہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیام بسلسلہ ملازمت رہا ہوگا۔ کیونکہ اس سے پہلے عقد ہو گیا تھا۔ بیوی کے ساتھ بیوہ والدہ کی کفالت بھی انہیں کے ذمہ تھی۔ اس لئے تحصیل علم سے فراغت کے بعد تحصیل معاش کی غرض سے ملازمت کر لی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

عرفان و طریقت

جون پور کے دوران قیام میں ایک دن کسی خانقاہ میں شیخ تاج الدین جھوسوی سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں بزرگ ایک ہی درسگاہ و استاذ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لئے باہم بڑی یگانگت و محبت تھی، دوران گفتگو شاہ صاحب نے برسبیل تذکرہ شیخ تاج سے عرض کیا کہ ایک عرصہ سے میری خواہش ہے کہ جدا مجد حضرت شیخ حسن بناری قدس سرہ کے سلسلہ کے کوئی بزرگ مل جاتے تو ان سے وابستہ ہو کر جد بزرگوار کے سلسلے میں داخل ہو جاتا۔ یہ سنتے ہی شیخ تاج نے فرمایا یہ آپ کی سعادت اور نیک بختی ہے کہ اس وقت شہر میں مولانا خواجہ کلاں خلیفہ کامل و خلف قابل شیخ نصیر الدین خلیفہ مطلق حضرت شیخ حسن بناری تشریف فرما ہیں۔ یہ مژدہ روح افزاء سنتے ہی شاہ طیب کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا، خود ان کا بیان ہے کہ:

چوں اس حرف گوش بندہ رسید چنان خوش دم کہ گویا جان از سر نو یافتم و باب

حیات رسیدم (ص ۵)

”اس جملہ کو سنتے ہی مجھے اس قدر خوشی ہوئی گویا نئی زندگی مل گئی اور چشمہ آب حیات پر پہنچ گیا۔“

اسی وقت شیخ تاج سے عرض کیا کہ مجھے خواجہ کی مجلس میں پہنچا دیں چنانچہ شیخ تاج انہیں لے کر خواجہ کلاں کی مجلس میں پہنچے۔ خواجہ انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور مصافحہ و

معانقہ کے بعد فرمایا۔

”مگر شہزادہ اولاد حضرت شاہ ہستید کہ بجز دیدن شہزادہ حضرت شاہ در نظر من آمدہ۔“ شاید آپ حضرت شاہ حسن کی اولاد سے ہیں کیونکہ آپ کی صورت دیکھتے ہی شاہ صاحب کا حلیہ یاد آ گیا۔ شاہ طیب نے عرض کیا، حضرت شاہ صاحب بندہ کے جدا مجد تھے۔ یہ سن کر خواجہ نے بڑی شفقت و نوازش فرمائی اور نہایت تواضع و انکساری کے ساتھ کہا ”شہزادہ زادہ ایں عاجز اید مارا نعمت از خاندان شہزادہ است“ آپ تو ہمارے مخدوم زادہ ہیں، اس عاجز کو جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ آپ ہی کے خاندان کا عطیہ ہے۔

اس تعارفی گفتگو کے بعد شاہ صاحب نے بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور اسی مجلس میں خواجہ نے انہیں بیعت فرما کر اوراد و وظائف کی تلقین کی اور ازراہ شفقت و نوازش کلاہ مبارک اپنے سر سے اتار کر ان کے سر پر رکھ دی۔ بیعت ہوتے ہی دنیا بدل گئی اور قلب میں سوز دروں کی کیفیت پیدا ہو گئی، ناچار جون پور کے مشاغل کو خیر باد کہہ کر مکان چلے آئے مگر یہاں بھی سکون نصیب نہ ہو سکا۔ عشق الہی کی سوزش بڑھتی ہی گئی، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بیتابی میں کبھی دشت و بیاباں کی خاک چھانتے اور کبھی گوشہ محراب میں عافیت کی جستجو کرتے۔ اسی عالم حیرانی و پریشانی میں تنگی معاش نے بھی اپنی گرفت سخت کر دی اور اہل خانہ پر فاقے گزرنے لگے، اس لئے مجبوراً اطراف بنارس کے کسی حاکم کی ملازمت کر لی۔ مگر شوریدگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اس سلسلہ کو تا دیر قائم نہ رکھ سکے اور سال کے اندر ہی اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ شاہ صاحب کے گھر والے ان کے ان حالات سے نہایت پریشان و متفکر تھے۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین ترکمان کی خدمت میں جا کر دعاء کی درخواست کی کہ ان کی یہ اضطرابی کیفیت کسی طرح زائل ہو جائے۔ شیخ شہاب الدین روشن ضمیر صاحب دل بزرگ تھے وہ اپنی چشم بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ اس سوز دروں و اضطراب باطنی کی حقیقت کیا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب کے گھر والوں کو مطمئن کرتے ہوئے فرمایا:

ایں فرزند بطلب حق سردر شدہ است خدائے تعالیٰ ہمہ را ایں سعادت

نصیب گرداند مارا ہمت ازوے باید خواست امیدوار باشید کہ حق تعالیٰ خاندان حضرت شاہ را از برکت انفاس ایں فرزند معمور خواہید کرد و از انوار او خانوادہ روشن خواہد شد (مناقب ص ۶)

”یہ فرزند طلب حق میں دیوانہ ہوا ہے، اللہ تعالیٰ سب کو یہ سعادت نصیب فرمائیں ہمیں اس سے دعاء لینی چاہئے تم لوگ امیدوار رہو کہ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ حسن کے خاندان کو اس فرزند کے برکات و انوار سے معمور فرمائیں گے اور خاندان کا نام اس کے ذریعہ روشن ہوگا۔“

بالآخر شاہ صاحب کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ آگ جس نے لگائی ہے وہی اسے بجھائے گا بھی، اس خیال کے آتے ہی والدہ ماجدہ سے اجازت لے کر شیخ پورہ کی راہ لی اور حضرت خواجہ کلاں کی خدمت میں جا کر اپنی باطنی کیفیات اور سوز دروں کا حال بیان کیا۔ خواجہ نے انہیں تسلی دی اور اس خوش آئند کیفیت پر مسرت کا اظہار فرمایا۔ چند دن خواجہ کی صحبت میں رہ کر گھر واپس ہوئے لیکن خواجہ کی روحانی مجلس کے کیف نے رہا سہا سکون بھی زائل کر دیا۔ اس لئے گھر پر صبر و قرار میسر نہ آسکا۔ اس لئے چند ہفتہ کے بعد دوبارہ خواجہ کلاں کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس بار طویل عرصہ تک وہاں قیام کیا، اور عبادت و ریاضت کے ساتھ خواجہ کے فیوض و برکات سے بھرپور استفادہ کیا۔ اسی سفر میں یا اس کے بعد تیسرے سفر میں حضرت خواجہ نے انہیں رمضان کے عشرہ اخیر کے اعتکاف کا حکم دیا اور اعتکاف کے اختتام پر عید کے دن خرقة خلافت سے نوازا اور بعض اذکار و اوراد کی تلقین فرمائی۔ ساتھ ہی حضرت شاہ حسن بناری کے مخصوص وظائف بھی بتائے۔

مناقب میں ہے:

باعتکاف عشرہ اخیرہ رمضان مبارک امر نمودند و روز عید پیراہن حضرت خواجگان چشت با مثال اجازت عطا فرمودند و بعضے اذکار تلقین کردند

و اوراد حضرت شاہ حوالہ نمودند۔ (ص ۷)

”رمضان مبارک کے اخیر عشرہ کے اعتکاف کا حکم دیا اور عید کے دن مشائخ چشت

کے پیراہن کے ساتھ خلافت و اجازت دی اور بعضے اذکار کی تلقین فرمائی، نیز حضرت شاہ حسن کے اور ابھی حوالہ کئے۔“

عطاءے خلافت کے بعد مزید تربیت و تکمیل کی غرض سے شاہ صاحب کو اپنے خلیفہ خاص شیخ تاج الدین جھوسوی کے حوالے کر دیا۔ شیخ تاج سے شاہ صاحب کے دور طالب علم ہی سے معاصرانہ و رفیقانہ تعلقات تھے۔ لیکن اس سپردگی کے بعد انھوں نے شیخ تاج کے ادب و احترام اور انقیاد و اطاعت کا جو نمونہ پیش کیا۔ معاصرین کی باہمی تاریخ میں اس کی مثال کمتر ہی ملے گی۔ شاہ صاحب نے خود اپنے انقیاد و اطاعت کی کیفیت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے:

دل خود بدست ایشاں سپرد و اختیار خود از ایشاں برداشت تا دہ سال ابتداء
گا ہے بخدومت ایشاں ظاہر نکرد کہ مرافلاں وظیفہ یا نماز بفرمائید یا ذکر تلقین
کنید ہر چند سلوک ایشاں باندہ یا راندہ بے تکلف بود اما من خود را از غلامان
ایشاں کمتر دانستہ در خدمت مقید بودم۔ (ص ۷)

”اپنے اختیار و خواہشات کو ان کے حوالہ کر دیا ابتداءً دس سال تک کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے فلاں وظیفہ یا نماز یا ذکر تلقین فرمادیں ہر چند کہ وہ میرے ساتھ دوستانہ اور بے تکلفانہ معاملہ فرماتے تھے لیکن میں اپنے آپ کو ان کے نوکروں سے بھی کمتر تصور کرتے ہوئے خدمت میں لگا رہا۔“

شاہ طیب نے اپنے مربی کے ساتھ گرویدگی و خود سپردگی میں حضرات صوفیاء کے اس اصول پر پورا پورا عمل کیا ”ینبغی للمريد ان يكون بين يدي الشيخ كالميت بين يدي الغسال يقلبه كيف يشاء“ یعنی مرید کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ شیخ کے حضور میں اس طرح رہے جیسے میت غسل کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جس طرف چاہتا ہے اسے الٹا پلٹتا ہے۔

شاہ صاحب کو اس اطاعت شعاری کا پورا پورا نفع بھی حاصل ہوا کہ شیخ تاج نے اپنے عطاء و انعام کو ان پر نچھاور کر دیا اور خلافت و اجازت کے علاوہ متعدد بار اپنی خلعت

خاص سے نوازا اور مرض الموت میں ایک دن انہیں اپنے سینے سے چمٹا کر اپنی محبت و شفقت اور اتحاد و یگانگت کے اظہار کے لئے یہ شعر پڑھا۔

من تو شدم تو من شدي تو جاں شدي من تن شدم
تاکش نکوید بعد ازیں تو دیگرے من دیگرم

الحاصل تقریباً تیس سال کی طویل مدت تک شیخ خواجہ کلاں و شیخ تاج الدین کی صحبت میں رہ کر اصلاح باطن اور تزکیہ و تصفیہ میں مشغول رہے تا آنکہ مرتبہ ارشاد و تکمیل پر فائز ہوئے اور پیر و مرشد کے حکم سے بنارس آ کر عرفان و سلوک کی مسند کو زینت بخشی۔

شاہ صاحب کو ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ سے بھی سلسلہ قادریہ میں اجازت حاصل تھی۔

مناب میں ہے:

دراں زماں کہ بعد وفات ایشاں برائے زیارت پیران خویش بجانب دہلی
رفتہ بود با شیخ الاسلام استاذ المفسرین حاجی الحرمین بندگان میاں شیخ عبدالحق
الدہلوی البخاری کہ دراں وقت مقتدائے سلسلہ قادریہ بود ملاقات واقع شد
و وے را شیخ کامل و مکمل یافت این سلسلہ از وے گرفت و خرقة قادریہ از
دست وے پوشید۔ (ص ۹)

”شیخ تاج کی وفات کے بعد جس وقت شاہ صاحب پیران چشت کی زیارت کیلئے دہلی تشریف لے گئے تھے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بخاری سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس وقت یہ سلسلہ قادریہ کے مقتدا تھے محدث دہلوی کو شیخ کامل و مکمل پایا، چنانچہ ان سے سلسلہ قادریہ کی تحصیل کی اور ان کے دست خاص سے خرقة خلافت زیب تن کیا۔“

بناء شریعت آباد

شیخ تاج الدین نے شاہ صاحب کو بنارس رخصت کرتے وقت فرمایا تھا کہ اب آپ کو یہاں آنے کی حاجت نہیں بنارس میں جم کر خلق خدا کی اصلاح و تربیت کی خدمت

انجام دیجئے۔ میں خود کبھی کبھی وہاں آ کر ملاقات کر آؤں گا۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق اپنے آبائی قیام گاہ منڈواڈیہ میں ارشاد و تلقین کی محفل آراستہ کی، لیکن یہاں خانگی جھمیلوں کی بناء پر دلجمعی و یکسوئی حاصل نہ ہو سکی۔ اس لئے جدا مجد حضرت شاہ حسن کے طریق پر آبادی سے باہر قلعہ راجہ بنارس کے خرابہ کے قریب ایک حجرہ بنا کر چند رفقاء کے ساتھ وہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ خلق کار جوع شروع ہوا۔ طلباء و فقراء کی ایک جماعت آپ کے گرد جمع ہو گئی، جن کی رہائش کے لئے آپ کے قریبی عزیز و مرید باختصاص شیخ طاہر بن شیخ چاندہ نے ایک پختہ مکان حجرہ سے متصل تعمیر کرادیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بہت سے تجار و امراء نے بطی حسن عقیدت میں آپ کے جوار میں اپنے لئے الگ الگ حجرے اور مکانات بنا کر وہیں اقامت اختیار کر لی۔ پھر طلبہ و ارادت مندوں کی کثرت کی بناء پر حجرہ اور مکان ناکافی ہو گیا تو مستقل ایک خانقاہ اور اس سے متعلق ایک مسجد کی تعمیر عمل میں آئی، اس طرح آہستہ آہستہ یہ ویرانہ اچھی خاصی آبادی میں تبدیل ہو گیا، جسے شاہ صاحب نے شریعت آباد کے نام سے موسوم کیا۔

درس و تدریس و ارشاد و تلقین

شاہ صاحب کا قیام مستقل طور سے شریعت آباد ہی میں تھا جہاں وہ سالکین کی اصلاح و تربیت کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ طلبہ کی کثیر جماعت ہر وقت خدمت میں موجود رہتی تھی جن سے شاہ صاحب نہایت شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔

مناقب میں ہے:

اکثر طلبہ در خدمت وے می بودند و این طائفہ را بسیار دوست داشتے و سبق

شان گفتے۔ (مناقب ص ۱۰)

”اکثر طلبہ ان کی خدمت میں موجود رہتے تھے جنہیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور انہیں درس دیتے تھے۔“

سبق کا سلسلہ عام طور سے ظہر کے بعد شروع ہوتا تھا جو عصر تک جاری رہتا، اسی وقت کبھی کبھی کچھ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے۔

مناقب میں ہے:

وبعد نماز ظہر تا عصر جزوے قرآن می خواند بعد ازاں بعضے یاراں سبق گفتے

وگا ہے چیزے می نوشت (ص ۱۴)

”ظہر کے بعد عصر تک کچھ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے پھر بعض لوگوں کو سبق پڑھاتے اور کبھی کبھی کچھ تحریر کرتے تھے۔“

تذکرہ نگار شاہ صاحب کے روحانی کمالات و تصرفات کے بیان و تفصیل میں اس درجہ مٹھو ہو گئے ہیں کہ ان کے علمی کارناموں کی جانب کوئی توجیہ نہیں دی۔ اس معاملہ میں تنہا شاہ صاحب ہی کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہوا ہے بلکہ بالعموم مشائخ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے کہ ان کی کرامات و تصرفات کے انبار میں ان کے علمی کمالات اجاگر نہ ہو سکے اسلئے شاہ صاحب کے تلامذہ اور تصنیفات کے متعلق اب کوئی تحقیقی بات کہنا مشکل ہے۔ انتہائی تلاش و جستجو کے بعد ”اکثر طلبہ در خدمت وے بودند“ میں سے صرف دو کے ناموں کی تصریح مل چکی کہ انہوں نے شاہ صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور علوم ظاہری کی تحصیل کی۔ ان میں ایک شاہ یلین بناری ہیں اور دوسرے شیخ ناصر الدین اور ایک تصنیف ”صلوٰۃ طیبی“ کا پتہ چل سکا جس کا ایک نسخہ مولانا رضا علی بناری متوفی ۱۳۱۲ھ کے کتب خانہ میں تھا۔ مولانا علی رضا صاحب نے اپنے فتاویٰ میں صلوٰۃ طیبی کا حوالہ اکثر مقامات پر دیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں ”قال العالم العارف الفقیہ المحقق المدقق الشیخ طیب بناری“ (تذکرہ مشائخ بناری ص ۲۲)

طریق اصلاح و بیعت

شاہ صاحب بیعت کے سلسلے میں نہایت حزم و احتیاط فرماتے تھے، سلسلہ کو وسیع کرنے کی غرض سے ہر کس و ناکس کو ہاتھ نہیں دیتے تھے۔ جب تک طالب بیعت کے حسن اعتقاد و تقویٰ و تدین کو اچھی طرح جانچ نہیں لیتے، بیعت نہیں کرتے تھے۔ بیعت

کے بعد ابتداء میں صرف ایام بیض کے روزے اور چھ رکعت صلوٰۃِ اوابین پر مداومت کا حکم دیتے۔ اس کے بعد بقدر استعداد و نوافل و وظائف اور دیگر مجاہدات و ریاضت کی اجازت دیتے تھے۔ ابتداء میں اوراد کی پابندی پر بہت تاکید فرماتے تھے۔ ان امور پر مکمل مداومت کے بعد ذکر جہری کی تلقین فرماتے اور اس پر استقامت حاصل ہو جانے پر مراقبہ کا حکم دیتے تھے۔ سالکین و مریدین کی اصلاح و تربیت کا ہمہ وقت خیال رکھتے تھے۔ جس کے اندر صلاحیت و استعداد پاتے اس کی جانب بطور خاص توجہ فرماتے تھے۔ (مناقب ص ۱۷)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بارے میں شاہ صاحب بلا خوف لومت لائم سعی بلیغ فرماتے تھے اور ابتداء میں تو مزاج میں اس قدر شدت تھی کہ خلاف شرع امر کو دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتے تھے۔ اگر کہیں سے ڈھول یا نقارہ کی آواز کان میں پڑ جاتی تو اسے توڑے بغیر قرار نہ ہوتا تھا۔ نماز فجر کے وقت مسجد میں جاتے ہوئے اگر کسی کو سویا ہوا دیکھ لیتے تو اس کے اوپر پانی ڈال دیتے تھے۔ یا عصا سے کرید کر جگا دیتے اور نہ اٹھنے پر کبھی کبھی عصا سے مار بھی دیتے تھے، شادی، بیاہ کے سلسلے میں غیر قوموں کے اختلاط سے مسلمانوں میں اس وقت جو غلط رسمیں جاری ہو گئی تھیں، مثلاً جلوہ، نقارہ وغیرہ اسے اپنی اصلاحی کوششوں سے بالکل ختم کر دیا تھا۔

مناقب میں ہے:

اکثر بدعتیں کہ دریں دیار شائع بود مثل نقارہ و جلوہ و رسوم نکاح ہمہ را دور ساختہ

و رسم جاہلان کہ در خلق پراگندہ بود جملہ را از میاں بر انداخت (ص ۱۳)

”اکثر بدعتیں جو اس دیار میں جاری تھیں جیسے جلوہ و نقارہ اور نکاح کی دیگر رسمیں سب کو ختم کر دیا اور جاہلانہ رسوم جو عوام میں پھیلی ہوئی تھیں ان سب کو بالکل دور کر دیا۔“

اس سلسلہ میں صاحب گنج ارشدی نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے جس سے شاہ صاحب کی ایمانی جرأت و صلابت کا اندازہ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب شہر کی جامع

مسجد میں نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے ایک مرتبہ خطیب نے خطبہ میں شہنشاہ اکبر کا نام لیا۔ اس کا نام سنتے ہی شاہ صاحب کو جلال آ گیا، آگے بڑھ کر خطیب کو نمبر سے کھینچ لیا اور فرمایا خطبہ میں کافر کا نام لیتا ہے۔ اتفاق سے شاہ صاحب کے ہمراہ اس وقت ان کے دونوں شیوخ حضرت مولانا خواجہ کلاں اور شیخ تاج الدین جھوسوی بھی تھے۔ شہر کے قاضی اور حاکم تو شاہ صاحب سے ان کے ہیبت و جلال کی بناء پر کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ ان دونوں بزرگوں سے عرض کیا کہ ہم بادشاہ کے نوکر ہیں اگر بادشاہ کو معلوم ہو جائے گا کہ خطبہ سے اس کے نام کو خارج کر دیا گیا ہے تو ملازمت تو جائے گی ہی ہمارے مکانات بھی مسمار کر دے گا، اس لئے ہم خطبہ میں اس کے نام کو شامل کرنے میں مجبور ہیں۔ خواجہ کلاں نے اس دن سے شاہ صاحب کو ہدایت کر دی کہ نماز جمعہ بجائے جامع مسجد کے منڈ واڈیہ میں ادا کر لیا کریں۔ (گنج ارشدی ص ۱۷۳)

امراء و اغنیاء کے ساتھ اس بارے میں انتہائی تشدد تھے، ان کے ساتھ رفیق و نرمی کا معاملہ کرنا تو گویا جانتے ہی نہ تھے۔

صاحب مناقب لکھتے ہیں:

وے قدس سرہ باجماعت اغنیاء در کلام بسیار شدید بود و سخن ہرگز بر فق نلغفتے

واگر خلاف شرع ازیں جماعت دیدے منع کردے و زجر فرمودے واگر

کسے از ابنائے روزگار باسبلیت دراز خدمت وے رسیدے سبلیت وے

بریدے۔ (ص ۱۲)

”حضرت شاہ صاحب قدس سرہ جماعت اغنیاء کے ساتھ گفتگو بڑی سخت فرماتے تھے، نرمی ہرگز نہ فرماتے، اگر کوئی دراز موچھ والا خدمت میں آجاتا تو اس کی موچھ کٹوا دیتے تھے۔“

امراء و حکام کا شاہ صاحب کے ساتھ برتاؤ

شاہ صاحب امراء و حکام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ کبھی اپنی ضرورت سے

ان کے دربار میں جاتے تھے، البتہ اگر کوئی ضرورت مند، صاحب احتیاج کسی حاکم کے پاس سفارش کی درخواست کرتا تو ”من یشفع شفاعۃ حسنة یکن له نصیب منها“ الآیۃ، کے پیش نظر ان کے پاس جانے میں دریغ نہ فرماتے تھے۔ امراء شاہ صاحب کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ ان کے مجلس میں پہنچتے ہی اگر خلاف شرع کوئی چیز ہوتی تھی مثلاً شطرنج، وغیرہ تو فوراً وہاں سے ہٹا کر کہیں چھپا دیتے تھے۔ بسا اوقات تو ان کے مجلس میں پہلے ہی ان چیزوں سے مجلس کو پاک و صاف کر دیتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر شاہ صاحب کی باتوں کو سنتے اور فوراً اس پر عمل درآمد کرتے تھے۔

مدد معاش کے بارے میں شاہ صاحب کا نظریہ

شاہ صاحب امراء و سلاطین کی عطیات اور جاگیروں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور نہ کبھی اسے قبول کیا۔ اکثر فرماتے تھے کہ ”ایں مدد معاش مدد ممت است“ اپنے متعلقین کو بھی اس سے احتراز کرنے اور بچنے کی سخت تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے خادم خاص و خلیفہ با اختصاص شاہ سلیمان بنارس کو مخاطب کر کے بارہا فرمایا کہ دیکھنا اس مدد معاش کو کبھی قبول نہ کرنا ایک غریب فقر و فاقہ کے باوجود اپنے گھر میں اطمینان و عافیت سے رہتا ہے لیکن جب اسے قبول کر لیتا ہے تو اسے حاکم، فوجدار، صوبہ دار اور دیوان کے دربار میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی نگرانی کے لئے چوکیدار بٹھائے جاتے ہیں اور مقررہ حقوق کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس سے اس کا اطمینان و سکون اور راحت و عافیت غارت ہو جاتا ہے اور انجام کار یہ مدد معاش اس کے حق میں مدد ممت ہو جاتی ہے۔ (مناقب ص ۱۲)

فتوحات کے سلسلہ میں طرز عمل

شریعت آباد کے ابتدائی زمانہ قیام میں معاش کی بڑی تنگی رہی، اکثر ایام فاقے میں گذرتے تھے، ساتھ میں رہنے والے طلبہ و فقراء جنگل کی گھاس یا جنگلی درختوں کے پھل

کھا کھا کر دن کاٹتے تھے، مگر بعد میں خدائی قانون ”من ینقی اللہ یجعلہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب“ کے مطابق فتوحات کے دروازے کھل گئے اور ہدایا و تحائف کثرت سے خدمت میں آنے لگے۔ قبول ہدایا کے بارے میں شاہ صاحب کا اصول یہ تھا کہ غریب ارادتمندوں اور مریدوں کے ہدیے تو بلا چون و چرا قبول کر لیا کرتے تھے اور اسے اپنی ضروریات میں صرف فرماتے تھے مگر امراء و رؤسا کی جانب سے پیش کئے گئے تحائف کو رد فرمادیتے تھے۔ البتہ اگر اس جماعت کا کوئی فرد حلقہ ارادت میں داخل ہو جاتا تو اس کے ہدیہ کو شرف قبولیت عطا ہو جاتا تھا لیکن اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے فقراء و غرباء پر تقسیم کر دیتے تھے۔

مناقب میں ہے:

روش او ہم چنین بود کہ از اغنیاء چیزے نگرفتے تا کہ او داخل مباحا نمی شد و محبت و اعتقاد او محکم نمی گشت بعد ازاں کہ او داخل معتقداں می شد و نیت او معلوم می گشت ہر چہ می فرستاد یا می آورد قبول می فرمود آں را صرف فقراء و مسافراں می نمود و خود ازاں گاہے نمی خورد و نمی پوشد (مناقب ص ۱۱)

” (قبول ہدایا کے بارے میں) شاہ صاحب کی روش یہ تھی کہ اغنیاء کی کوئی چیز قبول نہ کرتے تھے تا وقتیکہ وہ حلقہ مباحا میں داخل نہ ہو جاتے اور ان کی نیت نہ معلوم ہو جائے، اس کے حلقہ مباحا میں شامل ہو جانے کے بعد جو کچھ وہ بھیجتا یا خود لاتا تو قبول فرمایا کرتے تھے لیکن اسے کبھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتے تھے۔“

عطیات و فتوحات کی تقسیم کے سلسلے میں شاہ صاحب کا عمل یہ تھا کہ انہیں دو حصوں پر تقسیم کر کے ایک حصہ اہل خانہ، خدام، اور خانقاہ کے طلبہ اور سالکین پر خرچ فرماتے تھے اور دوسرے حصہ کو شہر کے فقراء، غرباء اور سالکین پر صدقہ کر دیا کرتے تھے۔

مناقب ہی میں شاہ سلیمان لکھتے ہیں:

و طریق وے در باب قسمت فتوح عجیب بود کہ ہر چہ از غیب رسیدے نصف آں بار باب حقوق و فقراء شہر و محتاجان و ہمسایگان دادے و نصف بخادمان

خاص ازجہت فقراء خانقاہ و مہماناں و مسافراں خرچ نمودے۔ (ص ۱۱)
 ”شاہ صاحب کا طریقہ فتوحات کی تقسیم میں عجیب تھا جو کچھ آتا اسے دو حصوں پر
 تقسیم کر کے ایک حصہ ارباب حقوق فقراء شہر، محتاجوں اور ہمسایوں کو دیدیتے تھے اور نصف
 حصہ کو خدام کے حوالہ کر دیتے تھے جسے خانقاہ کے فقراء مہمانوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔“

معمولات

شاہ صاحب کا عام طور سے معمول یہ تھا کہ نماز تہجد کے بعد مراقب ہو جاتے جس کا
 سلسلہ نماز فجر تک جاری رہتا اور کبھی مراقبہ کے بجائے تلاوت قرآن پاک میں مشغول
 ہو جاتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی خاص کیفیت کے تحت مندرج رباعی بار بار پڑھتے اور
 مسجد کے صحن میں بیٹا بانہ چکر لگاتے اور زار و قطار روتے۔ رباعی یہ ہے:

گر صد ہزار قرن ہمہ خلق کائنات فکر کند در صفت و ذات اے خدا
 آخر بعجز معترف آید کہ اے الہ دانستہ شد کہ بیچ ندانستہ ایم ما

نماز فجر کے بعد چاشت تک تلاوت فرماتے اور صلوٰۃ چاشت پڑھ کر مسجد سے باہر
 آتے۔ زوال کے وقت تھوڑی دیر قیلولہ کرنے کا بھی معمول تھا۔ بعد زوال نماز ظہر
 باجماعت ادا کر کے کچھ دیر تلاوت کرتے قرآن کی تلاوت میں بڑا اہتمام تھا بالعموم ہفتہ
 عشرہ میں قرآن ختم کر لیا کرتے تھے، تلاوت کے بعد عصر تک طلبہ کا درس جاری رہتا اور
 کبھی کبھی درس کے بجائے کچھ تصنیف و تالیف کا کام بھی اسی وقت کر لیا کرتے تھے نماز عصر
 کے بعد مغرب تک مسجد ہی میں مراقب رہتے۔ مغرب و عشاء کے درمیان نوافل اور ذکر
 و اذکار میں مشغول رہتے اور عشاء سے کچھ پہلے گھر آ کر کھانا تناول فرماتے، کچھ توقف کے
 بعد نماز عشاء ادا کر کے وظائف پورا کرتے اس سے فارغ ہو کر سو جاتے۔ دو ڈھائی گھنٹہ
 استراحت کرنے کے بعد بیدار ہو جاتے کبھی بستر پر اور کبھی مسجد میں جا کر ذکر و اذکار میں
 منہمک رہتے۔

روزہ کے سلسلے میں معمول یہ تھا کہ ایام بیض، پنجشنبہ، جمعہ اور دو شنبہ کے روزوں کا

خاص طور سے اہتمام کرتے تھے ورنہ عام معمول صوم داؤدی کا تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے
 اور ایک دن افطار کرتے۔ رمضان کے عشرہ اخیرہ کے اعیکاف کا بھی معمول تھا۔ ان
 معمولات میں زندگی کے آخر لمحہ تک فرق نہیں آنے پایا تھا حتیٰ کہ آخر عمر میں استغراق و
 حضور دوام کے باوجود ان میں سرموفرقت نہیں تھا۔ (مناقب ص ۱۴، ۱۵)

غناء و سماع کے بارہ میں رویہ

ابتدائی عہد میں دیگر مشائخ چشت کی طرح شاہ صاحب بھی وجد و سماع سے خاصا
 ذوق رکھتے تھے۔

مناقب میں ہے:

وے قدس سرہ ابتداء وقت شغف بر سماع بسیار داشت و وجد و رقص بسیار نمود
 و بعضے اوقات در جوش سماع در جنگل رفتے دوروز در جنگل ماندے و کسے
 ندانستے کہ کجاست (ص ۱۲)

”شاہ صاحب قدس سرہ ابتداء وقت میں سماع سے بہت شوق رکھتے تھے اور وجد و
 رقص خوب فرماتے تھے، بعض اوقات جوش وجد میں جنگل میں بھاگ جاتے اور دو روز تک
 غائب رہتے تھے۔“

لیکن جب مقام مشیخت پر پہنچے تو اس سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنے لگے تھے
 اور فرماتے تھے۔

دریں زمانہ سرود نباید شنید کہ بر بیچ شرط باقی نماندہ و زمانہ فاسد شدہ و یاراں
 نماندہ موافق و در قوالاں طمع جا گرفتہ دریں وقت سرود شنیدن مناسب طریقہ
 فقراء نیست۔ (مناقب ص ۱۳)

”اس زمانہ میں غناء نہیں سننا چاہئے کیونکہ کوئی شرط اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔ زمانہ
 فاسد ہو چکا ہے یا موافق نہیں رہے اور قوالوں میں لالچ پیدا ہو گئی ہے اس وقت غنا سننا
 فقراء کے طریق کے مناسب نہیں ہے۔“

اس بارے میں آپ کا حال بیچنہ حضرت شیخ عبدالقادر بن محمد حسنی جیلانی ملقب بہ شیخ عبدالقادر ثانی متوفی ۳۹-۹۴۰ھ جیسا تھا کہ وہ جب مقام مشیخت پر پہنچے تو سماع و غناء سے بالکل پرہیز کرنے لگے تھے اور مریدوں کو بھی شدت سے منع کرتے تھے۔

اسرار طریقت کے بیان سے احتراز

شاہ صاحب تصوف کے اسرار و حقائق کے بیان کرنے سے بالکل پرہیز کرتے تھے اور اگر کبھی کوئی شخص اس بارے میں کوئی بات پوچھتا تو فرماتے:

”اِس سخنانِ حالی را اور مرتبہِ قالی آوردن دور از ادب است“

ان حالی باتوں کو قول کے درجے میں لانا بے ادبی ہے۔

شاہ بیسین لکھتے ہیں کہ میں چونکہ بہت بے تکلف تھا، اسلئے کبھی کبھی جرأت و ہمت کر کے بعض اسرار کو دریافت کرتا تو مجھ سے بھی کچھ بیان نہ فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ:

اِس سخن از جملہ واردات است تو در کار خویش مشغول باش نا پر سیدہ بردل تو مثل آئینہ دار نخواہد شد۔

”یہ باتیں منجملہ واردات کے ہیں تم اپنے کام میں لگے رہو بغیر پوچھے قلب پر آئینہ کی طرح اس کا وارد ہو جائیگا۔“

لباس

لباس میں بھی مشائخ و علماء کا اتباع کرتے تھے۔ موٹا اور کردرا گزینہ کا پیرا ہن عام طور سے زیب تن ہوتا اور سر پر پانچ یا سات گز کا عمامہ جس کا رنگ کبھی نیلگوں ہوتا اور کبھی سبز یہ دونوں رنگ شاہ صاحب کے نہایت دل پسند تھے، اس کے برخلاف پیلے رنگ سے بہت نفرت تھی، فرماتے تھے کہ یہ جوگیوں و سناسیوں کا لباس ہے جس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

غرض جملہ امور میں ظاہر شریعت اور کتاب و سنت نمونہ عمل تھے جن سے سرمو

انحراف بھی گوارا نہیں تھا، درحقیقت معیار ولایت کتاب و سنت کی پابندی ہی ہے۔ جیسا کہ بعض اکابر سے منقول ہے جو جتنا پابند سنت ہے اتنا ہی بڑا ولی و بزرگ ہے۔ اس معیار کے اعتبار سے شاہ صاحب ولایت و بزرگی کے مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ کیونکہ اتباع سنت ان کی طبیعت بن چکی تھی۔

شاہ بیسین رقمطراز ہیں:

در اقوال و افعال تابع سیرت نبوی و در حرکات و سکنات تابع سنت مصطفوی بود ہر کارے کہ خواستی کرد اول میزان آں بعمل مسنون کردے اگر موافق آمد اختیاری فرمود والا ازاں حذر می کردد اِس متابعت ملکہ طبیعت اوشده

طریق او طریق اصحاب بود۔ (مناقب ص ۱۵)

”اقوال و افعال میں سیرت نبوی کے اور حرکات و سکنات میں سنت مصطفوی کے تابع تھے جس عمل کو کرنا چاہتے پہلے اسے میزان سنت پر تولتے اگر موافق سنت ہوتا تو اس پر عمل کرتے ورنہ اس سے پرہیز کرتے تھے اور یہ متابعت ان کی طبیعت راسخہ بن چکی تھی، حاصل یہ کہ آپ کا طریقہ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ تھا۔“

وفات اور مدفن

شاہ صاحب کا وصال سلطان شہاب الدین بن محمد شاہجہاں متوفی ۱۶۶۷ھ/ ۱۰۷۶ھ کے دور سلطنت میں شب دوشنبہ ۸ شوال ۱۰۴۲ھ/ ۱۶۳۲ھ کو ماہ پور ضلع غازی پور میں ہوا اور سہ شنبہ شوال کو منڈوا ڈیہہ بنارس میں اپنے آبائی مقبرہ میں سپرد خاک ہوئے۔ شاہ بیسین بنارسی نے وفات کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

شب دوشنبہ کو موضع ماہ پور کی مسجد میں وضو کر رہے تھے کہ اثناء وضو میں اچانک سیدھے کھڑے ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر تحریمہ کے لئے ہاتھ اٹھا کر بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور اسی کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

وفات سے کچھ عرصہ قبل ہی سے دوپہر کا قیلولہ اور شب کی استراحت کو بالکل ترک

کر دیا تھا اور فرماتے تھے ”وقت قیلولہ نبودہ و خفتن نماذہ“ یعنی اب قیلولہ کرنے اور سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ ہمہ وقت ذکر و فکر اور مراقبوں میں مشغول رہتے تھے۔

شریعت آباد سے جب ماہ پور کے لئے روانہ ہونے لگے تو خلاف معمول بیعت کے خواہشمندوں کو شہر سے بلا کر بیعت فرما کر داخل سلسلہ کیا اور فرمایا کہ اس کے بعد ”وقت نحو اہند یافت“ یعنی پھر بیعت کا وقت نہیں پائیں گے۔

شاہ یسین یہ بھی لکھتے ہیں کہ وفات کے بعد حیرت انگیز طور پر نبض چلتی رہی اور جسم بدستور گرم رہا جس سے لوگوں کو حیات کا شبہ ہوا حالانکہ روح نفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ وفات کی اطلاع ملتے ہی شیخ پورہ اور قرب وجوار کے اعزہ اور متعلقین رات ہی کو ماہ پور میں جمع ہو گئے، غسل و کفن کے بعد تدفین کا مسئلہ سامنے آیا۔ شیخ پورہ کے اکثر اصحاب کی رائے یہ تھی کہ جنازہ جھوسی میں دفن کیا جائے لیکن شیخ ناصر الدین خلیفہ حضرت شاہ صاحب کی رائے یہ ہوئی کہ تدفین منڈاؤڈیہ میں ہونی چاہئے۔ بالآخر انہیں کی رائے پر اتفاق ہو گیا اور رات کے آخر حصہ میں جنازہ ماہ پور سے اٹھایا گیا اور سہ شنبہ کو ایک پہر دن چڑھتے چڑھتے منڈاؤڈیہ پہنچ گیا جہاں خاندانی مقبرہ میں تدفین عمل میں آئی۔ (ص ۳۹، ۴۰)

شیخ مسعود اسعدی بنارسی نے یہ تاریخ وصال کہی ہے:

شیخ روشن دل کہ اہل عرش و فرش نام پا کے او بہ پا کی می برند
یافت تاریخ عروجش اسعدی جلوہ گاہ او شدہ عرش بلند

(مناقب ص ۳۱)

وفات کے چند ماہ بعد کسی معتقد نے مزار پر ایک بلند اور وسیع چبوترہ تعمیر کروایا، اور اس کے بارہ سال بعد ۱۰۵۴ھ میں شاہ صاحب کے ایک مرید خواجہ عبدالصمد نے اس پر ایک شاندار گنبد بنوایا جو اسی شان کے ساتھ آج بھی قائم ہے۔ مقبرہ کا احاطہ وسیع ہے جس میں شاہ صاحب کے خاندان اور متعلقین کے مزارات کے علاوہ ایک مسجد بھی ہے جسے شاہ غلام معین الدین جون پوری متوفی ۱۱۲۰ھ نے تعمیر کرائی تھی بعد میں ۱۳۰۵ھ میں اس کی جدید تعمیر ہوئی ہے۔ محراب میں یہ کتبہ نصب ہے جسے مولانا وکیل احمد سکندر پوری

نے نصب کیا ہے:

از سر نو ساخت این مسجد معین دین حق سالہا باشد برائے اہل ایماں یادگار
سال مسعود بنائش عاجز خستہ نوشت مسجد در گاہ شاہ طیب والا تبار

۱۳۰۵

سالانہ ۸ ریشوال کو خانقاہ رشیدیہ جون پور کے زیر اہتمام مزار پر قرآن خوانی ہوتی ہے اور فقراء اور غرباء کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے شاہ صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی، البتہ شاہ یسین کی آپ نے مثل فرزند کے پرورش و تربیت کی تھی۔ یہی آپ کے وصال کے بعد جانشین ہوئے۔

چند مریدین و خلفاء

شاہ صاحب نے تعلیم و تحصیل اور عرفان و سلوک میں تکمیل کے بعد پوری زندگی بنارس میں ارشاد و تلقین میں بسر کی اور ہندوستان کے مشائخ کی طرح آپ نے دیار پورب میں بڑا اصلاحی و تبلیغی کام کیا بقول صاحب مناقب ”اکثر طالبان و مصاحبان وے بدرجہ کمال رسیدہ اند و خلفائے وے بمرتبہ تکمیل دیگران مرتقی شدہ“ یعنی ان کے اکثر متوسلین درجہ کمال کو پہنچے اور خلفاء دوسروں کی اصلاح و تربیت کے مقام پر فائز ہوئے۔ ان اکثر طالبین و خلفاء میں سے جن چند بزرگوں کے حالات مل سکے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) دیوان محمد رشید جو پوری

گیارہویں صدی کے علماء و مشائخ میں دیوان صاحب شریعت و طریقت کے مسلم مقتداء اور امامت و عبقریت کے بلند مقام پر فائز تھے۔ ۱۰۰۰ھ کو موضع برونہ ضلع اعظم گڑھ میں آپ کی ولادت ہوئی، چونکہ آپ کے والد شیخ مصطفیٰ نے اپنے شیخ و مرشد کے حکم سے برونہ سے ترک سکونت کر کے پورنیہ میں اقامت اختیار کر لی تھی، اس لئے دیوان صاحب کی پرورش و تربیت ان کے ماموں شیخ شمس الدین برونوی متوفی ۱۰۴۷ھ نے کی۔

استاذ الملک شیخ محمد افضل جو پوری متوفی ۱۰۶۲ھ مفتی شمس الدین برنوی، شیخ محمد لاہوری، شیخ نور محمد مداری جو پوری وغیرہ سے علوم فنون کی تکمیل کی اور علم حدیث شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے دہلی جا کر حاصل کیا۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد شاہ طیب بناری سے بیعت کی اور احسان و سلوک کے منازل طے کر کے ۱۰۴۰ھ میں شاہ صاحب سے سلسلہ چشتیہ میں خلافت و اجازت پائی اور چند مہینوں کے بعد شاہ صاحب ہی سے سلاسل سہروردیہ و قادریہ کی اجازت سے بھی مشرف ہوئے۔

دیوان صاحب کو شاہ طیب بناری کے علاوہ اس عہد کے دیگر مشائخ سے بھی خلافت و اجازت حاصل تھی، جن میں شیخ تاج الدین جھوسوی متوفی ۱۰۷۳ھ، شیخ عبدالقدوس قلندر جو پوری متوفی ۱۰۵۲ھ، شاہ راجی سید احمد مالک پوری متوفی.... اور شیخ شمس الدین کاپوری متوفی سنہ.... کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دیوان صاحب پوری زندگی ارشاد و تلقین کے ساتھ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ اور تلامذہ و خلفاء کی کثیر جماعت کے علاوہ متعدد اہم تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں مناظرہ رشیدیہ عربی، شرح ہدایت الحکمت عربی، شرح اسرار المخلوقات، حاشیہ شرح مختصر عضدی، اپنے اپنے فن میں نہایت اہم ہیں۔ دیوان صاحب کے ذریعہ شاہ صاحب کے سلسلے کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاہ طیب قدس سرہ کے مفاخر و محاسن کے لئے یہی کافی ہے کہ انھوں نے دیوان رشیدیہ جیسے امام وقت کو اپنی خانقاہ سے پیدا کیا۔

دیوان صاحب کے زیر تربیت رہ کر جن بزرگوں نے درجہ کمال حاصل کیا اور شرف خلافت سے مشرف ہوئے، ان کی تعداد بارہ ہے جن میں آپ کے صاحبزادے شیخ محمد ارشد جو پوری، میر سید جعفر پٹوی، میر سید قیام الدین گھور کھپوری، شیخ عبدالشکور ماہلی، شیخ نور الدین مداری، شیخ محی الدین جو پوری، شیخ حبیب اللہ بہاری، شیخ عبداللہ بنگالی نے بڑی شہرت پائی اور ان کے ذریعہ سلسلہ کی خوب اشاعت ہوئی۔

دیوان صاحب کی وفات یوم جمعہ ۹ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ کو بحالت سجدہ نماز فجر

ہوئی۔ آپ کے تلمیذ خاص و مرید صالح شیخ محمد ماہ دیوگامی نے نماز جنازہ ادا کرائی اور محلہ رشید آباد شہر جو پوری میں ہمیشہ کے لئے یہ گنجینہ علم و دانش اور مخزن رشد و ہدایت مدفون ہو گیا۔

(۲) شیخ ناصر الدین جھوسوی

شیخ ناصر الدین بن خواجہ کلاں ابن اسد العلماء شیخ نصیر الدین جھوسوی اپنے وقت میں کبار مشائخ چشت میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے والد کے ابن عم اور خلیفہ شیخ تاج الدین جھوسوی کے سایہ عاطفت میں بچپن کے ایام گزار کر بنارس آئے اور حضرت شاہ طیب بناری سے صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جو پور گئے اور وہاں کے ممتاز اساتذہ سے فقہ، اصول فقہ اور معانی کی تعلیم مکمل کی۔ بعد ازاں کٹرہ مانک پور جا کر حدیث و تفسیر کی تحصیل کی۔ جملہ علوم مروجہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد اپنے والد مولانا خواجہ کلاں اور شیخ تاج الدین کی صحبت میں رہ کر عرصہ دراز تک اکتساب فیض کرتے رہے، پھر بنارس حضرت شاہ طیب بناری کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ اور انہیں کی خدمت میں رہ کر سلوک کی تکمیل کی اور خرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے، حضرت شاہ صاحب کے علاوہ انہیں شیخ تاج الدین جھوسوی سے بھی خلافت و اجازت حاصل تھی۔

مجاہدہ و ریاضت میں بڑا انہماک تھا، صفائی قلب کی بناء پر دوران ذکر عجیب و غریب امور کا مشاہدہ کرتے تھے، خود انہیں کا بیان ہے کہ ابتدائے وقت میں ایک دن دوران ذکر قلب کی جانب توجہ کی تو دیکھا کہ تمام قلب اسم پاک کے نقش سے مزین ہے یہ حالت دیکھ کر اس درجہ بھجت و مسرت حاصل ہوئی کہ یہ شعر پڑھ کر رقص کرنے لگا۔

دردل نگار دست چناں نقش بستہ اند

اما گذار نیست پاپا بوس کونہم

اسی غلبہ حال میں خیال ہوا کہ شاہ صاحب کی خدمت میں چل کر اس جاں بخش کیفیت سے انہیں مطلع کروں جب چلنے کا قصد کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ زمین کے چپے چپے

پراسم پاک کا نقش ابھرا ہوا ہے۔ شیخ تاج الدین جھوسوی کے وصال کے بعد خانقاہ جھوسوی کے یہی سجادہ نشین ہوئے اور پوری زندگی اپنے بزرگوں کے طریق پر ارشاد و تلقین اور اصلاح و تبلیغ میں بسر کردی تفصیلی حالات اور سن وفات کا علم نہ ہو سکا۔

(۳) شاہ یسین بناری

حضرت شاہ یسین بناری کی ولادت ۱۰۲۰ھ میں جون پور میں ہوئی، نسلاً شیخ صدیقی ہیں۔ شجرہ نسب یہ ہے: شاہ یسین بن شیخ احمد بن شیخ عبدالرحیم بن شیخ اوحید بن شیخ راولہ بن شیخ نجم الدین بن شیخ اسحاق بن صفی الدین ثانی بن عبدالسمیع بن عبدالرشید بن عبدالشہید بن ابوسعید بن ابوالمعالی بن عبدالولی بن عبدالعزیز بن شاہ اسماعیل بن مخدوم صفی الدین کبیر عربی بن عبدالسلام بن ابوالفضل بن ابوعبداللہ بن ابوجعفر بن ابوخیل بن حضرت محمد بن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم (گنج ارشدی ورق ۲۲۳ جلد ۱)

صاحب بحر ذخار نے شاہ یسین کے ذکر میں لکھا ہے کہ ”خلف و خلیفہ شاہ طیب بناری“ (ص ۱۰۰) خلیفہ کی حد تک تو ان کی بات درست ہے لیکن خلف لکھنا صحیح نہیں ہے۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ شاہ یسین بچپن ہی میں شاہ صاحب کی خدمت میں آگئے تھے اور شاہ صاحب نے ان کی اپنے لڑکے کی طرح پرورش اور نگہداشت کی تھی، اس لئے لوگوں کو صحیح بات کا علم نہ ہو سکا۔

چنانچہ گنج ارشدی میں ہے:

ہر چند وے پسر صلیبی حضرت شیخ نبودہ اما وے را از طفلی در حجرہ خود تربیت فرمودہ کہ خاص و عام وے را پسر حضرت شیخ می دانستند کم کسے نام پدر وے

میداند (ورق ۲۲۲ ج ۱)

”ہر چند کہ شاہ یسین حضرت شاہ طیب کے پسر صلیبی تھے لیکن انہیں بچپن ہی سے شاہ صاحب نے اپنی آغوش تربیت میں لے لیا تھا کہ خاص و عام انہیں حضرت کا لڑکا ہی سمجھتے رہے اور بہت کم لوگوں کو ان کے والد کا نام معلوم ہو سکا۔“

شاہ یسین نے ابتدائی صرف و نحو سے لے کر ارشاد (قاضی شہاب الدین دولت آبادی) و کنز الدقائق تک کی تعلیم شاہ صاحب سے ہی حاصل کی اس کے بعد شاہ صاحب کے حکم سے جون پور چلے گئے اور شیخ محمد افضل جو پوری متوفی ۱۰۶۲ھ اور دیوان محمد رشید جو پوری سے بقیہ نحو اور منطق، فلسفہ، فقہ اور اصول فقہ کی تحصیل کی۔ دوران تعلیم ہی میں جب کہ ان کی عمر کا انیسواں سال تھا۔ شاہ صاحب نے انہیں سلسلہ میں داخل فرما کر ذکر و وظائف کی تلقین کی بالخصوص نماز تہجد اور اڈا بین پر مداومت کی تاکید کی اور ایک سال کے بعد یعنی ۱۰۴۰ھ میں عید کے دن خرقہ خلافت سے نوازا۔ اس وقت شاہ یسین اصول بزدوی پڑھ رہے تھے۔ جون پور و بنارس کے درمیان قرب مسافت کی بناء پر بنارس اکثر آنا ہوتا تھا جس کی وجہ سے تعلیمی نقصان ہوتا تھا، اس لئے شاہ صاحب نے جون پور کے بجائے انہیں کٹرہ شیخ جمال اولیاء کٹرہ وی متوفی ۱۰۴۲ھ کی خدمت میں بھیج دیا۔

شاہ یسین نے شیخ جمال سے ہدایہ اور تفسیر بیضاوی کی تعلیم شروع کی لیکن ڈھائی ماہ بھی گزرنے نہیں پایا تھا کہ شاہ صاحب کا قاصد مکتوب لے کر پہنچ گیا جس میں تحریر تھا کہ خط دیکھتے ہی بلاتا خیر بنارس آ جاؤ۔ خط رمضان شریف کی انیسویں تاریخ کو ملا۔ اس لئے ایک دن رک کر نماز عید ادا کر کے کٹرہ سے روانہ ہو گئے راستہ ہی میں جھوسوی سے چند میل آگے پہنچے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کے وصال کی خبر ملی۔ چنانچہ سرگرداں و پریشاں شب و روز قطع مسافت کرتے ہوئے ۱۰ ارشوال المکرم یوم چہار شنبہ کو منڈواڈیہ پہنچے ان کے دو دن بعد دیوان محمد رشید بھی جون پور سے آگئے۔ چونکہ شاہ یسین بچپن ہی سے شاہ صاحب کے آغوش تربیت میں پلے تھے، اس لئے اس سانحہ کا ان پر خاص اثر تھا، ان کی دلجوئی و تسلی کی غرض سے دیوان محمد رشید اور شیخ ناصر الدین ایک ماہ تک منڈواڈیہ میں قیام پذیر رہے اور شاہ یسین کی اچھی طرح دلجوئی و خاطر داری کر کے اپنے اپنے مقام پر واپس لوٹ آئے۔

شاہ صاحب کی وفات کے بعد شاہ یسین نے اپنا اصلاحی تعلق دیوان محمد رشید سے قائم کر لیا اور ان سے بھی خلافت و اجازت حاصل کی بعد میں شاہ یسین صاحب ہی شاہ صاحب کے جانشین ہوئے اور پوری زندگی منڈواڈیہ میں اصلاح و تبلیغ کی خدمت انجام

دیتے رہے۔ عبادت و ریاضت میں بڑا انہماک تھا۔ عام طور سے نصف شب کو بیدار ہو جاتے اور فجر تک نوافل اور اشغال میں مصروف رہتے تھے۔

گنج ارشدی میں ہے:

وقریب نصف شب برمی خاست وضو نموده تا فجر ادائے نوافل و اشغال گذرا بند بعد اذان فجر نماز صبح ادا می فرمود۔ (ص ۲۵۴)

”نصف شب کے قریب بیدار ہو جاتے اور وضو کر کے فجر تک نوافل اور اشغال میں مصروف رہتے اور بعد اذان فجر نماز فجر ادا کرتے تھے۔“

زندگی کے آخری ایام میں جھوسوی تشریف لے گئے تھے وہیں پیام اجل آپہنچا اور ۲۰ ربیع الثانی ۱۰۷۶ھ شب سہ شنبہ کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ جو سی ہی میں اسد العلماء شیخ نصیر الدین جھوسوی کے مقبرہ میں مدفون ہوئے (گنج ارشدی ص ۲۵۴)

مرقع بنارس میں ہے کہ ”مزار منڈ واڈیہ میں ہے“ جو درست نہیں ہے۔

شاہ یلین کی علمی یادگار میں آپ کی گراں قدر اور اہم تصنیف ”مناقب العارفین“ ہے جس کا ایک قلمی نسخہ جامعہ مظہر العلوم بنارس کی ملکیت میں ہے، یہی قلمی نسخہ اس مقالہ کا اصل ماخذ ہے۔ شاہ یلین نے اس تذکرہ کو اپنے شیخ و مربی حضرت شاہ طیب بنارس کی وفات کے دس سال بعد ۱۰۵۴ھ میں مرتب کیا تھا، کل صفحات ۲۴۰ ہیں۔ لیکن کتاب پر ۲۳۸ کی عدد لکھی ہے۔ ابتدائے کتاب سے ۱۲۰ صفحات تک شاہ طیب اور ان کے خاندان کے بزرگوں کے حالات ہیں جسے شاہ یلین نے اپنی ذاتی معلومات اور شاہ صاحب کے اعزہ و متعلقین سے دریافت کر کے لکھا ہے۔ اس کے بعد پھر دوسرے مشائخ چشت کا سلسلہ وارد تذکرہ ہے۔ جس کا ماخذ عام طور سے اخبار الاخیار اور سیر العارفین ہے۔

کتاب کے سرورق پر گوشہ میں یہ عبارت درج ہے:

”چند روزے بعاریت باماست کتبہ فقیر خیر الدین محمد“ اور اس سے پہلے شیخ خیر الدین محمد ہی کے قلم سے ایک مختصر نوٹ ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ کچھ دنوں تک شیخ خیر الدین محمد الہ آبادی کے مطالعہ میں رہ چکا ہے۔

(۴) شیخ عالم بنارسی

شیخ عالم بن شیخ الہ داد بن شیخ داؤد بنارسی شاہ صاحب کے خاندانی بچا تھے۔ صلاح و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں امتیازی شان رکھتے تھے یہ اگرچہ شیخ تاج الدین جھوسوی کے مجاز تھے۔ لیکن زندگی بھر اپنے آپ کو شاہ صاحب کا خادم و مرید شمار کرتے رہے۔ رشتہ میں بچا ہونے کے باوجود شاہ صاحب کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے اور ہمہ وقت خدمت بجالانے کی فکر میں رہتے تھے۔ شاہ صاحب بھی ان کا بہت احترام و لحاظ کرتے تھے۔ ان کا مستقل قیام منڈ واڈیہ میں تھا۔ لیکن بر بنائے عقیدت و محبت اکثر شریعت آباد تشریف لاتے اور شاہ صاحب کے فیض صحبت سے نفع اندوز ہوتے۔ ایک بار شاہ صاحب نے غلبہ حال میں ان سے فرمایا: ”دریں ساعت ہرچہ بخواہی خواہ“ یعنی اس وقت جو مانگنا چاہو مانگ لو۔ انھوں نے عرض کیا صرف اتنی خواہش ہے کہ میری وفات آپ کی موجودگی میں ہو اور آپ اپنے ہاتھوں سے میری تجہیز و تکفین فرمائیں۔ ان کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ شاہ صاحب کے وصال سے ایک سال قبل ۱۰۴۱ھ میں اس حال میں انتقال کیا کہ شاہ صاحب ان کے سر بالیں بیٹھے تھے اور یہ دم توڑ رہے تھے۔ حسب وعدہ شاہ صاحب نے اپنے ہاتھوں غسل دیا اور تجہیز و تکفین کی مزار منڈ واڈیہ میں تالاب کے کنارہ اب بھی موجود ہے۔ (مناقب ص ۲۰)

(۵) شیخ عبدالمومن کشمیری

وطن مالوف کشمیر تھا، بنارس آ کر شاہی ملازمت سے وابستہ ہو گئے، لیکن جب حضرت شاہ صاحب سے عقیدت ہوئی اور ان سے بیعت کر لی تو ملازمت کو خیر باد کہہ کر ہمدن عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے، ان کے مفاخر و محاسن میں اہم ترین چیز یہ ہے کہ شاہ صاحب سے ان کی گرویدگی و محبت و عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب کے ادنیٰ اعراض سے بھی تڑپ اٹھتے تھے اور جب تک ان کی چشم عنایت کو اپنی جانب مائل نہ کر لیتے قرار نہ آتا تھا۔ شاہ صاحب کی خدمات انہیں سے متعلق تھیں جنہیں یہ تاحیات

بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ ۲۸/۲۹ یا ۲۹/۳۰ ذی قعدہ ۱۰۳۰ھ میں وفات پائی، وفات سے کچھ دیر قبل فرمایا کہ قبر تیار کر لو۔ قبر تیار ہو جانے کے بعد تیمار داروں سے کہا پانی گرم کرو، جب پانی گرم ہو گیا تو تکیہ کے نیچے سے کفن نکال کر اوڑھ لیا اور جان مولائے حقیقی کے حوالہ کر دی۔ (مناقب ص ۲۲)

(۶) شیخ فاضل محمد پھلتی

یہ قبضہ ضلع مظفر نگر پھلت کے باشندہ تھے۔ ابتداء میں انہیں کسی سے عشق ہو گیا تھا۔ محبوب کی مفارقت کے غم میں بحالت شوریدگی گھر سے نکل پڑے۔ دیوانہ وار در بدر کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے خوش قسمتی سے شاہ صاحب کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ ان کی دیوانگی و پریشان حالی پر شاہ صاحب کو بڑا رحم آیا۔ بالآخر تصرفات باطنی کے ذریعہ ان کے عشق مجازی کو عشق حقیقی کی جانب پھیر دیا۔ انجام کار جمعیت کے ساتھ عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ شاہ صاحب ان سے بہت محبت کرتے تھے اور یہ بھی شاہ صاحب پر جان چھڑکتے تھے۔ ایک لمحہ کی جدائی بھی برداشت نہیں تھی۔ چونکہ گھر سے بعالم دیوانگی غائب ہوئے تھے، اس لئے گھر والے اسی وقت سے تلاش میں تھے۔ تقریباً پانچ سال کے بعد ایک صاحب تلاش کرتے کرتے بنارس بھی پہنچے۔ شہر میں کسی سے معلوم ہوا کہ فاضل محمد نام کے ایک صاحب شریعت آباد میں شاہ طیب بناری کی خانقاہ میں رہتے ہیں۔ یہ خانقاہ میں حاضر ہوئے اور گھر والوں کی پریشانیاں بیان کر کے انہیں واپس لے جانے کی اجازت طلب کی، شاہ صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔ مگر یہ خود راضی نہ ہوئے۔ شاہ صاحب نے کسی طرح سے راضی کر کے رخصت کیا۔ پھلت میں انہیں خوب مقبولیت حاصل ہوئی اور ایک کثیر جماعت ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئی بالآخر چند سال کے بعد ہزنوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ تاریخ وفات کا علم نہ ہو سکا۔ (مناقب ص ۲۲، ۲۳)

(۷) شیخ حسن

یہ نو مسلم تھے۔ شیخ محمد رہتلی متوفی سنہ... کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے

اور انہیں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد میں شاہ صاحب کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور سلوک کے منازل طے کر کے بلند مقام پر پہنچے۔ شاہ صاحب نے اپنے دست خاص سے انہیں خرقہ پہنایا۔

شاہ صاحب کی رحلت کے بعد شہر کے اکثر لوگوں نے انہیں کی جانب رجوع کر لیا تھا۔ ۱۰۴۹ھ میں انتقال کیا اور شریعت آباد میں اپنی تعمیر کردہ مسجد کے احاطے میں دفن ہوئے۔ (مناقب ص ۲۳)

(۸) شیخ طاہر بناری

شیخ طاہر بن شیخ چاندہ بن شیخ حافظ بن شیخ حبیب اللہ بن شیخ فرید بناری، شاہ صاحب کے خاندانی عزیز اور مرید خاص تھے۔ عرصہ دراز تک شریعت آباد میں حجرہ بنا کر علاقہ دنیوی سے یکسو ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہے، لیکن جب تنگی معاش نے بہت مجبور کر دیا اور فاقے پر فاقے گزرنے لگے تو ناچار شاہی ملازمت کر لی جس میں انہیں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ دنیاوی ثروت و وجاہت کے باوجود فقراء سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور خود بھی ہر وقت ذکر الہی میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ آنکھیں بھی اکثر یاد خداوندی میں اشکبار رہتی تھیں۔ انہیں بھی شاہ صاحب سے خصوصی تعلق و محبت تھی۔ شاہ یسین کا بیان ہے کہ شاہ صاحب کی وفات کے چند دن بعد برائے فاتحہ مزار پر حاضر ہوئے تو فرط غم سے روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں، اسی حال میں سسکیاں لیتے ہوئے کہا کہ بزرگوں کی جدائی کا صدمہ سہا نہیں جاتا۔ چنانچہ اس واقعہ کے تین ماہ کے اندر ہی ۱۰ محرم ۱۰۴۲ھ کو وفات پا کر بزرگوں کے پاس جا پہنچے۔ مزار محلہ بھدوؤں شہر بنارس میں خواجہ مبارک بناری کے خطیرہ میں ہے۔ (مناقب ص ۱۰۱)

شیخ طاہر کی یادگار میں ایک مسجد آج بھی گنگا، برناسنگم پر چندن شہید کے مزار کے متصل موجود ہے (تذکرہ مشائخ بنارس)

قطب الاقطاب دیوان محمد رشید عثمانی جو نیوری

قدرت کا یہ عجیب نظام ہے کہ ایک کی بربادی دوسرے کی آبادی کا سبب ہوتی ہے، ایک جانب ایک شہر اجڑتا ہے تو دوسری طرف دوسرا آباد ہوتا ہے، یہی ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے اسی قانون فطرت کے تحت جب فتنہ تیموری کی ہلاکت خیزیوں سے مغرب میں دلی کی علمی، تمدنی اور معاشرتی دنیا میں باخزناں کے تند جھونکے چل رہے تھے تو دوسری جانب دیار پورب کے شہر جو نیور میں علم و فن اور تمدن و معاشرت کے چمنستان میں بہار آئی ہوئی تھی، تاجدار سلطنت شرفیہ ابراہیم شاہ المتوفی ۱۴۴۰ء کے حسن انتظام علم دوستی، علماء نوازی اور فیاضی سے جو نیور مرجع ارباب کمال بن گیا تھا، یہاں کے مواضعات و قصبات میں علم و فضل کی مسندیں بچھ گئی تھیں، اہل علم و دانش دور دراز مقامات سے کھینچے چلے آ رہے تھے اور شہر جو نیور یاتون من کل فجع عمیق کا مصداق بنا ہوا تھا، ان نو وارد اہل کمال میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی ذات گرامی بھی ہے، قاضی صاحب کے جو نیور میں آتے ہی اس کے گلستان علم میں بہار نو آگئی، درحقیقت جو نیور کی علمی تاریخ کا آغاز قاضی دولت آبادی کی ذات گرامی سے ہوتا ہے، اس میں سلطان الشرق ابراہیم شاہ بھی برابر شریک رہا، سلطنت شرفیہ اگرچہ اسی (۸۰) برس کی قلیل مدت میں ختم ہو گئی لیکن ملک العلماء اور ملک الشرق نے جس گلستان علم کی آبیاری کی تھی وہ تقریباً ساڑھے تین سو سال تک پھولتا پھلتا رہا۔ اور سرزمین جو نیور سے ایسے ایسے باکمال افراد ابھرے جن کے کارناموں پر ملت اسلامیہ کو آج بھی فخر ہے۔

ان ہی باکمال افراد میں زبدۃ الاخیار، عمدۃ الابرار، استاذ العلماء، ملاذ الفضلاء، فرید العصر، وحید الدرہ، صاحب الرشاد والسداد فی مقام الارشاد قدوة اہل العلم والتجربید ابوالبرکات الشیخ دیوان محمد رشید الجونیوری العثماني کی ذات گرامی بھی ہے۔

علمی مقام و مرتبہ

گیارہویں صدی ہجری کے علماء میں دیوان صاحب امامت و عبقریت کے مقام پر فائز اور شریعت و طریقت کے مسلم مقتدا تھے، آپ کے اساتذہ و معاصرین آپ کی جودت طبع، ذہانت، فطانت اور علمی و فنی مہارت کے معترف تھے، آپ کے معاصر اور استاذ بھائی شیخ رکن الدین بحر یا آبادی تلمیذ خاص شیخ مفتی شمس الدین بردنوی المتوفی ۱۰۴۷ھ کو جب کوئی علمی شبہہ وارد ہوتا تو اپنے تبحر علمی کے باوجود دیوان صاحب کی طرف مراجعت فرماتے اور تشفی بخش جواب سے مطمئن ہوتے۔ (۱)

استاذ الملک شیخ محمد افضل بن حمزہ عثمانی جو نیوری المتوفی ۱۰۶۲ھ جو آپ کے استاذ ہیں ایام طالب علمی ہی سے آپ کی قابلیت و فطانت کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ مختصر المعانی کے درس کے وقت ایک صاحب نے عرض کیا کہ یہ ”کان یكون“ کے معنی بھی سمجھتے ہیں یا یوں ہی پڑھ رہے ہیں، استاذ الملک نے برجستہ فرمایا کہ آپ ”کان، یكون“ کے معنی کے متعلق فرماتے ہیں یہ تو ”سیکون“ کے معنی بھی بیان کرتے ہیں، (۲) اسی اعتماد و وثوق کی بنا پر تحصیل و تکمیل سے فراغت کے بعد ایک مرتبہ آپ استاذ الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت استاذ شریفیہ کا جو فن مناظرہ میں اہم متن ہے کسی طالب علم کو درس دے رہے تھے، دیوان صاحب کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا کہ

متن خوب است اگر کسے شرح اس نویسد بہتر است۔ (۳)

یہ ایک بہترین متن ہے اگر کوئی اس کی شرح لکھ دیتا تو اچھا ہوتا۔

دیوان صاحب استاذ الملک کے اشارہ کو سمجھ گئے اور ایک ہفتہ کے بعد جب پھر حاضر خدمت ہوئے تو رشید یہ شرح شریفیہ تالیف فرما کر استاذ عالی مقام کی خدمت میں پیش کر دی استاذ الملک نے بیحد پسند فرمایا اور بہت تحسین فرمائی، رشید یہ جیسی اہم تصنیف اور ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں دیوان صاحب کی خداداد ذہانت و قابلیت ہی کا کرشمہ ہے

(۱) تجارشدی ورق ۱۴۔ (۲) ایضاً ۱۴۔ (۳) ایضاً ۱۴۔

ورنہ ایک ہفتہ میں اس کے مضامین کو حل اور اخذ کرنا بھی غیر معمولی بات ہے، چہ جائیکہ تصنیف کرنا، حاشیہ چلپی کی قرأت کے زمانہ میں دیوان صاحب کا یہ اعلان عام تھا کہ چلپی کے اقوال کو میں رد کر سکتا ہوں جس کا جی چاہے پیش کر کے دیکھ لے، چنانچہ کبھی کبھی ملامحمود جو پوری المتوفی ۱۰۶۲ھ یا کوئی دوسرا رفیق درس چلپی کے قول کو پیش کرتا تو دیوان صاحب اس کی ایسی مدلل تردید فرماتے کہ استاذ الملک بھی داد تحسین دیئے بغیر نہ رہتے۔ (۱)

زمانہ طالب علمی ہی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ملاموہن الہ آبادی جو ایک تبحر عالم اور جید مناظر تھے۔ استاذ الملک کی ملاقات کی غرض سے تشریف لائے، استاذ الملک اس وقت دیوان صاحب کو درس دے رہے تھے، ملاموہن کی خاطر سے درس موقوف کر دینا چاہا، ملاموہن نے کہا کہ سبق جاری رکھا جائے تاکہ ان کی استعداد کا پتہ چلے، چنانچہ درس جاری رہا، دیوان صاحب قرأت کر رہے تھے، ملاموہن نے ایک اعتراض کیا، دیوان صاحب نے جواب دیا اور مباحثہ شروع ہو گیا۔ قریب تھا کہ ملاموہن لاجواب ہو کر خاموش ہو جاتے، یہ صورت دیکھ کر استاذ الملک نے تیز نگاہوں سے دیوان صاحب کی جانب دیکھا، آپ استاذ کا منشا سمجھ کر خاموش ہو گئے۔ (۲)

یوں تو دیوان صاحب جملہ علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن فقہ، اصول اور تصوف میں خاص امتیاز حاصل تھا، (۳) اسلئے استاذ الملک مقدمات اصول و فقہ دیوان صاحب سے پوچھتے تھے اور مبادیات حکمت و فلسفہ ملامحمود جو پوری سے۔ (۴)

۱- دیوان صاحب کے تذکرہ کے مآخذ و مراجع: گنج رشیدی قلمی میں دیوان صاحب اور ان کے خاندان کے بیشتر اصحاب کا تذکرہ ہے یہ کتاب دیوان صاحب کا بیض ملفوظ ہے جس کو آپ کے تلمیذ خاص اور خلیفہ اجل شیخ محمد نصرت جمال عرف شاہ ملتانی نے جمع کیا ہے، اس میں ۱۰۷۲ھ سے ۱۰۸۳ھ تک کے ملفوظات درج ہیں، یہ دیوان صاحب کے حالات کا سب سے قدیم اور مستند ماخذ ہے۔

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۳- (۲) ایضاً ۱۴- (۳) نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۶۷-

(۴) نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۶۷، گنج ارشدی ورق ۱۱۴-

۲- گنج ارشدی قلمی: یہ شیخ محمد راشد بن شیخ محمد رشید دیوان کا ملفوظ ہے، جس کو شیخ ارشد کے خلیفہ شیخ شکر اللہ نے جمع اور شیخ غلام محمد رشید بن شیخ محبت الدین بن شیخ ارشد نے مرتب کیا ہے، یہ کتاب اپنے حسن ترتیب و تفصیل کے اعتبار سے خاندان رشیدیہ کے حالات میں سب سے مفصل اور جامعیت و افادیت کے لحاظ سے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳- مناقب العارفین مولفہ شیخ محمد یلین جانشین شیخ محمد طیب بناری، بزرگان چشتیہ کے ذیل میں مؤلف نے دیوان صاحب کا مفصل و مکمل تذکرہ لکھا ہے۔ اس کتاب پر خود دیوان صاحب کا لکھا ہوا حاشیہ بھی ہے، چونکہ یہ کتاب آپ کی حیات ہی میں مرتب ہوئی ہے، اس لئے یہ بھی قابل اعتماد ہے، یہ تینوں مذکورہ تصدیریں خانقاہ رشیدیہ جو پور میں موجود ہیں۔

۴- بحر ذخار کے نہر دوم کے شعبہ دوم میں بزرگان رشیدیہ کا مکمل تذکرہ ہے، یہ اولیائے کرام کے حالات میں بڑی مشہور کتاب ہے، مگر اپنی ضخامت و طوالت کی وجہ سے آج تک زبور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی، اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا فصیح الدین جو پوری استاذ مسلم انٹر کالج جو پور کے پاس موجود ہے۔ اور ایک نسخہ دائرہ محمدی الہ آباد میں ہے جو اچھی حالت میں ہے، راقم السطور نے اس سے استفادہ کیا ہے، نیز دیگر نسخے بھی ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۵- تجلی نور: مؤلفہ ابوالبشارت نور الدین زیدی ظفر آبادی ص ۲۷۱-۷۱ میں دیوان صاحب کا تذکرہ ہے۔

۶- نزہۃ الخواطر جلد پنجم ص ۳۶۷، میں بھی دیوان صاحب کا مختصر مگر جامع تذکرہ ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ (۷) سمات الاخیار، (۸) سبحة المرجان، (۹) تذکرہ علمائے ہند، (۱۰) حدائق حنفیہ، (۱۱) تحفۃ الابرار، (۱۲) تاریخ شیراز ہند وغیرہ میں بھی دیوان کا ذکر ہے، مگر ان میں کوئی نئی اور مزید باتیں نہیں ہیں۔ سب نے مذکورہ بالا چار کتابوں کی باتوں کو دہرایا ہے، البتہ سمات الاخبار میں دیوان صاحب کی اولاد اور تین خلفاء کا مفصل ذکر ہے، اس مضمون کی ترتیب کے سلسلے میں ان سب کتابوں سے مدد لی گئی ہے، مگر اصل

ماخذ کی حیثیت گنج ارشدی گنج رشیدی ہی رکھتی ہیں۔

دیوان صاحب کے بارے میں اہل باطن کی پیشین گوئیاں

جس دن استاذ الملک شیخ محمد افضل جو پوری کی وفات ہوئی، اسی دن لاہور میں ملا خواجہ نے جو سلسلہ قادریہ کے مشائخ میں ہیں، فرمایا کہ

امر و قطب جو پور وفات یافتہ و بعدے چند شیخ محمد رشید نامی خواہد گشت (۱)
(آج قطب جو پور کی وفات ہوگئی اور چند دن کے بعد اس مقام پر محمد رشید نامی فائز ہوں گے)

۲- شیخ عبدالعزیز جو پوری دہلوی خلیفہ قاضی خاں ظفر آبادی نے اپنی آخری عمر میں فرمایا کہ

بعد ما مردے فقیر پیدا خواہد کہ نام وے محمد رشید خواہد بود۔ (گنج ارشدی ورق ۱۲۳)
(میرے بعد ایک مرد فقیر پیدا ہوگا جس کا نام محمد رشید ہوگا)۔

شیخ عبدالعزیز بڑے باکمال و صاحب حال و قال بزرگ تھے، ۹۷۵ھ میں آیت پاک سبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون کے سماع پر واصل بحق ہو گئے، دیوان صاحب کے ایام طفولیت میں ایک تقریب کے سلسلہ میں شیخ عبدالجلیل لکھنوی برونہ تشریف لائے، حصول برکت کے لئے آپ کو شیخ کی خدمت میں حاضر کیا گیا، شیخ نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا:

عارف کامل عالم و عامل خواہد بود و نیشکر بسیار تناول نمود (ایضاً ورق ۱۳)

(عالم باعمل و عارف اجل ہونگے اور گنا کثرت سے استعمال کریں گے)۔
ان پیشینگوئیوں سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان صاحب کا مقام علم و ولایت کس درجہ کا تھا۔

پیدائش اور نشوونما

آپ دس ذیقعدہ ۱۰۰۰ھ موضع برونہ میں پیدا ہوئے، موضع برونہ شہر جو پور سے

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۲۳۔

تقریباً چھ میل کی مسافت پر مشرق میں واقع ہے اور اس وقت حدوداً عظیم گڈھ میں ہے۔
دیوان صاحب نے چار بادشاہوں کا زمانہ پایا، جلال الدین اکبر ۱۰۰۰ھ کے عہد میں پیدا ہوئے، جب آپ کی عمر چودہویں سال کو پہنچی تو جہانگیر مسند آرائے سلطنت ہوا، آپ کے سینتیسویں سال میں شاہجہان تخت نشین ہوا اور جب آپ چھتر (۶۶) سال کے ہوئے تو اورنگزیب عالمگیر آرائے حکومت ہوئے۔ آپ کے والد شیخ مصطفیٰ جمال نے آپ کی طفولیت ہی کے زمانہ میں اپنے مرشد کے ایماء پر پورنیہ (صوبہ بہار) میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے آپ کی نشوونما اپنے حقیقی ماموں شیخ شمس الدین ابن نور الدین برنوی کے زیر نگرانی ہوئی۔

شیخ شمس الدین بڑے عابد و زاہد اور خوش اوقات بزرگ تھے اور ساتھ ہی زیور علم سے بھی آراستہ تھے اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں گنے جاتے تھے اوائل عمر میں ملازمت شاہی سے منسلک تھے، آخر میں ترک فرما کر عزت گزریں ہو گئے تھے۔ ۱۰۲۷ھ میں وفات پائی آپ کا مزار محلہ مفتی شہر جو پور میں ہے رکن الدین بحر آبادی آپ کے شاگرد رشید تھے۔ (۱)
نام و نسب اور آبائی وطن: محمد رشید نام، شمس الحق، فیاض اور دیوان لقب ہے، ابوالبرکات کنیت ہے، شمسی تخلص، آپ کی بعض تحریروں سے اسم گرامی عبدالرشید بھی ظاہر ہوتا ہے مگر محمد رشید ہی آپ کو پسند و محبوب تھا آپ کے کمالات ظاہری و باطنی کو دیکھ کر مشائخ و اہل اللہ قطب الاقطاب کہا کرتے تھے۔

سلسلہ نسب باختلاف روایت اٹھارہویں یا بیسویں پشت میں شیخ سری بن مفلس سقطی عثمانی سے مل جاتا ہے (۲) آپ کی بارہویں پشت میں ایک بزرگ شیخ بخشی نامی ہیں انہی کے اجداد میں سے کسی نے عرب سے ہجرت کر کے کلدہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، کلدہ ملک روم کا ایک مشہور مقام ہے اسی نسبت سے شیخ بخشی کو شیخ رومی کہا جاتا ہے، شیخ بخشی

(۱) سمات الاخیار۔

(۲) گنج ارشدی ص ۱۲، گنج رشیدی سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سری تک کل اٹھارہ پشتیں ہیں، لیکن گنج ارشدی اور

دوسرے تذکروں سے دو نام اور درمیان میں پائے جاتے ہیں۔

نے مرشد کامل کی تلاش میں ہندوستان کی طرف رخت سفر باندھا، اس وقت دلی میں سلطان المشائخ شیخ نظام الدین دہلوی کے فیوض و برکات کا دریا بہ رہا تھا اس لئے شیخ رومی دہلی پہنچ کر سلطان المشائخ کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور مدت دراز تک شیخ کی صحبت میں رہ کر کسب فیض کرتے رہے، اس سے فراغت کے بعد شیخ کے اشارے سے موضع سکلائی پر گئے ایشی صلیع بارہ بنکی میں خلق خدا کی اصلاح و تربیت کی غرض سے مستقل سکونت اختیار کر لی، شیخ رومی کو سلطان المشائخ کے علاوہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے بھی اجازت و خلافت حاصل تھی، شیخ رومی نے سکلائی ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ شیخ رومی کے بعد ان کی اولاد سکلائی میں مقیم رہی اور آج تک آپ کی نسل وہاں پائی جاتی ہے۔ (۱)

دیوان صاحب کے والد بزرگوار شیخ مصطفیٰ جمال بھی موضع سکلائی ہی میں متولد ہوئے، اور وہیں نشوونما پائی، بڑے ہونے کے بعد انھیں طلب علم کا شوق پیدا ہوا اور وہ حصول علم کے لئے سکلائی سے جوینور آئے اور اپنی زاد یوم کو خیر باد کہہ کر جوینور میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہاں کے اساتذہ و مشائخ سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل فرمائی، شیخ نور الدین بن عبدالقادر برنوی کی صاحبزادی سے نکاح کیا جو آئندہ کے لئے سکلائی کے بجائے برونہ ضلع جوینور کی وطنیت کا سبب (۲) بنا، یہیں آپ کے تینوں صاحبزادے شیخ محمد سعید، شیخ محمد رشید (صاحب الترجمہ) اور شیخ محمد ولید پیدا ہوئے، شیخ مصطفیٰ جمال کا ابتدائی ایام ہی سے تدین و تقویٰ اور اصلاح باطن کی طرف میلان تھا، چنانچہ سکلائی کے قیام کے زمانہ ہی میں شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی، ایٹھوی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے تھے اور وقتاً فوقتاً شیخ کی صحبت میں جا کر اکتساب فیض کرتے رہتے تھے۔

جوینور آنے کے بعد شیخ قیام الدین بن قطب الدین جوینوری کی جانب رجوع کیا اور انھیں سے اجازت و خلافت حاصل ہوئی، شیخ مصطفیٰ میں کمال درجہ کا زہد و تقویٰ، توکل

(۱) سمات الاخیار ص ۱۰۔

(۲) نزہۃ الخواطر کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ مصطفیٰ جوینوری کی سکونت کے زمانہ میں سکلائی بھی جاتے رہتے تھے لیکن گنج رشیدی و ارشدی اس تفصیل سے خاموش ہیں۔

وورع تھا، مشتبہ چیزوں سے انتہائی پرہیز کرتے تھے، اپنے شیخ کے ایماء پر اہل و عیال کو برونہ چھوڑ کر پنڈوہ ضلع پورنیہ میں اقامت فرمائی تھی اور وہیں ۱۰ رذی الحجہ ۷۶۱ھ میں وفات پائی اور پورنیہ محلہ چمنی بازار میں مدفون ہوئے۔

دیوان صاحب نے اپنے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔
چوں یاربہ بنگالہ کند مسکن و ماویٰ سششی بہ بدخشاں نہ رود لعل بہ بنگ است

درس و تدریس

دیوان صاحب کے اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے، جہاں کوئی صاحب کمال ملا، اس کے سامنے زانوے ادب تکر دیا اور اس کے فیوض علمیہ سے استفادہ کیا، ذیل میں ان اساتذہ کی اجمالی فہرست پیش کی جا رہی ہے جن سے دیوان صاحب نے بلا واسطہ استفادہ کیا ہے جس سے اقلیم علم و فن کے تاجدار اور آسمان علم کے آفتاب عالمیتاب کے علمی شغف کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) الشیخ محمد اخوند البرنوی (۲) الشیخ کبیر نور البرنوی (۳) الشیخ محی الدین السدھوری (۴) الشیخ مخدوم عالم السدھوری (۵) الشیخ محمد قاسم (۶) الشیخ مبارک مرتضیٰ (۷) الشیخ نور محمد المداری (۸) الشیخ محمد محی الدین بن عبدالشکور (۹) الشیخ عبدالغفور بن عبدالشکور (۱۰) الشیخ حبیب اسحاق (۱۱) الشیخ محمد لاہوری (۱۲) الشیخ میر سید عبدالعزیز (۱۳) الشیخ میر سید عبداللہ برادر عبدالعزیز (۱۴) الشیخ المفتی شمس الدین البرنوی (۱۵) استاذ الملک الشیخ محمد فضل بن حمزہ الجونپوری العثماني (۱۶) الشیخ المحدث الشاہ نور الحق بن الشاہ عبدالحق المحدث الدہلوی۔ (۱)

جس لائق، ذکی، فطین شاگرد کی علمی تربیت مذکورہ بالا با کمال اور اپنے عہد کے ماہر فنون اساتذہ کے دامن میں ہوئی ہو اس سے اسکے کمالات علم و فضل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ان اساتذہ عظام میں دیوان صاحب کے علمی جوہر کے نکھارنے میں سب سے

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۵ و سمات الاخیار ص ۱۵، گنج ارشدی۔

زیادہ ہاتھ آپ کے حقیقی ماموں علامہ عصر مفتی شیخ شمس الدین برونوی اور فرید دہر استاذ الملک شیخ محمد افضل جو پوری کا ہے، دیوان صاحب نے ان دونوں سے علمی استفادہ زیادہ کیا ہے، اور اکثر کتابیں ان ہی سے پڑھی ہیں۔

علوم متداولہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد بھی شوق طلب کو سیری نہ ہوئی اور عہد شباب گزر جانے کے بعد پیرانہ سالی یعنی ساٹھ سال کی عمر میں کمر ہمت باندھی اور قدوۃ الحدیث شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند و شاگرد شیخ نورالحق دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشکوٰۃ اور بخاری کو شیخ سے پڑھ کر اجازت حاصل کی، شیخ نورالحق نے فراغت کے بعد جو سند اجازت عطا کی ہے اس کے لفظ لفظ سے دیوان صاحب کی علمی جلالت نمایاں ہوتی ہے، قارئین کی دلچسپی کیلئے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

نقل سند اجازت: ان الشيخ الاجل الاوحد الافضل جامع الكمالات اللوہیۃ المتوجہ الی اللہ خلیفۃ قدوۃ المتورعین الشیخ طیب بن معین طلب منی الاجازہ بسنن اہل الحدیث و حفظا لسند السلسلۃ الشریفۃ مع انی لست باہلہا وکان الاعتذار احرى والبق من الاجازۃ ولكن لما کان امتثال امرہ واجبا علی وکان اجرى هذا الطریق مما اوضی بہ الشیوخ اجیبت مسئولہ واجزت، رفعہ اللہ .

اسکے نیچے یہ عبارت دیوان صاحب نے اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے۔

وانا العبد الاحقر المفتقر الی اللہ الوحید المدعو بین الناس محمد رشید بن مصطفی الجونپوری موطننا والعثمانی نسبا والجشتی ارادة والقادری والقلندری والشطاری مشربا المرجو من الشیخ الاوحد ان لاینسانی من صالح دعائہ لعل اللہ یرزقنی صلاحا وکان ذلک فی ذی قعدہ سنۃ ستین والف من ההجرۃ النبویۃ. (۱)

دیوان صاحب کی اس تحریر سے صاحب سمات الاخیار کے اس قول کی پوری تردید

ہو جاتی ہے کہ دیوان صاحب جب دہلی پہنچے تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی ضعیف پیری کی وجہ سے درس دینا بند کر چکے تھے لیکن دیوان صاحب کی درخواست پر یہ منظور فرمایا تھا کہ درس تو نورالحق دیں گے لیکن میں بھی درس میں موجود رہا کروں گا، کیونکہ دیوان صاحب نے ۱۰۶۰ھ میں اجازت حاصل کی ہے اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی وفات خود صاحب سمات الاخیار کی تصریح کے مطابق ۱۰۵۱ھ میں ہو گئی، پھر محدث دہلوی کا درس میں حاضر رہنا چہ معنی دارد۔

دیوان صاحب بحیثیت استاذ

تحصیل و تکمیل کے بعد دیوان صاحب مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے اور تشنگان علوم کو اپنے چشمہ فیض سے سیراب کرنا شروع کر دیا، بیشمار بندگان خدا آپ کے علمی فیوض سے مستفید ہوئے۔ طلبہ کے ساتھ انتہائی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے اور ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہونے دیتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ جس پتھر پر طلبہ جو تیاں اتارتے تھے اس کو میری قبر میں تختہ کے طور پر رکھ دیا جائے۔ (۱)

آپ کے درس و تدریس کو علماء و مشائخ بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس شغل کو باقی رکھنے کی تاکید کرتے رہتے تھے، شیخ طیب بناری اپنے ایک مکتوب میں آپ کو خطاب فرماتے ہیں کہ،

ہموارہ بدرس و تدریس بودہ بررضائے رحمت چشم دارند کہ حق تعالیٰ را در روز شمی ہزار نعمت است کہ بر خلق نازل می شود تسع ملیۃ و تسع تسعون للعلماء والمتعلمین و واحدۃ لجمع الخلق ذلک فضل اللہ یوتیہ مین یشاء انتہی (۲)

ایک دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں۔

بندہ می خواہد کی از برائے شما فرمان بوساطت نواب از بادشاہ طلب نماید کہ

شماردیں بنارس استقامت نمود درس و تدریس فرمائید کہ دریں کان کفر و عروج
اسلام نمود۔ (۱)

دیوان صاحب طلبہ یا مریدین سے خدمت لینا پسند نہ کرتے تھے اور ارادت مندوں کی خواہش کے باوجود اس کا موقع نہ دیتے تھے، ایک مرتبہ آپ کے تلمیذ خاص اور مرید جان نثار میاں شیخ اسماعیل بروہی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا دیوان چیو تو کسی قسم کی خدمت کا موقع ہی نہیں دیتے کہ ہمارے لئے ذریعہ سعادت ہو، حضرت دیوان صاحب نے فرمایا کہ میرے استاذ شیخ محمد افضل بھی خدمت لینا پسند نہیں کرتے تھے، اپنا سارا کام خود ہی انجام دیا کرتے تھے، اسی لئے مجھے بھی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات خود ہی پوری کر لیا کروں، پھر فرمایا:

تا کار بدست خود تو اں میکرد دیگرے گفتن خوب نیست در صحبت یار شاطر
باید نہ بار خاطر۔ (۲)

(جب تک اپنے ہاتھ سے کام ہوتا رہے دوسروں سے لینا بہتر نہیں، دوستوں کی صحبت میں چاق و چوبند رہنا چاہئے نہ کہ بوجھ بنا رہے)۔

دیوان صاحب کو طلبہ کا تعلیمی نقصان گوارا نہیں تھا ان کو مطالعہ اور ہمہ وقت درس کیلئے مستعد رہنے کی تاکید کرتے رہتے تھے اور اپنے آپ کو بھی اس کے لئے فارغ رکھتے تھے، لیکن آخری وقت میں جب عبادت اور ریاضت اور سیرالی اللہ میں انہماک بڑھ گیا اور اکثر جذب اور استغراق کی کیفیت طاری رہنے لگی اور درس میں ناغہ ہونے لگا تو تلامذہ کو اپنے تلمیذ رشید و خلیفہ اجل شیخ نور الدین مداری کے حوالہ کر دیا، اور اس وقت سے تدریس کا کام موقوف ہو گیا۔ (۳)

دیوان صاحب کے اکثر شاگرد علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی میں بھی دیوان صاحب ہی سے استفادہ کرتے تھے، اور ان میں اکثر خلعتِ خلافت سے بھی مشرف ہوئے۔

عرفان و سلوک

دیوان صاحب جس طرح علوم ظاہری میں شہرہ آفاق تھے، اسی طرح علوم باطنی میں بھی طاق تھے، نوبرس کی عمر میں جو کھیلنے کھانے کا زمانہ ہوتا ہے، کسی مرشد سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم کرنا تو درکنار اس کا تصور آنا بھی غیر معمولی بات ہے۔

دیوان صاحب اسی زمانہ میں اپنے والد شیخ مصطفیٰ جمال سے بیعت ہو گئے تھے، اور خرقہٴ خلافت سے بھی مشرف ہوئے، صاحب مناقب العارفین رقمطراز ہیں:

”در مدتِ طفلی کلاہ ارادت بلکہ خرقہٴ اجازت و خلافت از دست والد شریف

خود کہ مرشد ہر شیخ عصر بودند، پوشند، و اثر آن لباس دروکار ہا کرد۔“ اتھی (۱)

لیکن کم سنی اور تعلیم و تحصیل کی مشغولیت سے طریقہٴ صوفیہ کے اخذ و کسب کی جانب پوری توجہ نہ ہو سکی تھی، تکمیل علوم و فنون کے بعد شیخ کامل و مرشد صادق کی تلاش و جستجو ہوئی، اتفاقاً اسی زمانہ میں شیخ طیب بنارس جو نیپور تشریف لائے ہوئے تھے، خبر پاتے ہی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر اس ملاقات میں قلب شیخ کی جانب مائل نہ ہوا، کچھ دنوں کے بعد ایک تقریب کے سلسلے میں شیخ طیب کی قیام گاہ منڈواڈیہہ ضلع بنارس جانا ہوا، اور چند دن کی صحبت بھی اٹھائی، اس صحبت نے اپنا اثر دکھایا، اور قلب میں شیخ طیب کی عقیدت و محبت کا طوفان موجزن ہو گیا، چنانچہ سارے علاقہٴ دنیوی حتیٰ کہ درس و تدریس کے مشغلے کو ترک کر کے مستقل قیام کے ارادہ سے شیخ طیب کی خدمت میں حاضر ہو گئے، مگر شیخ نے تدریس کے التوا کو پسند نہیں فرمایا، اور یہ کہہ کر جو نیپور واپس کر دیا کہ

”بجائے وظیفہٴ صبح درس طلبہ داند، اس ہم عبادت است“ (۲)

منڈواڈیہہ سے واپسی کے بعد حسب ارشاد مرشد پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور وقتاً فوقتاً شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے، دو ایک دن کے بعد واپس آجاتے، رمضان میں چونکہ درس موقوف ہو جاتا تھا اس لئے پورا رمضان شیخ کی خدمت

(۱) مناقب العارفین ص ۱۲۵۔ (۲) گنج ارشدی ص ۱۲۷، ج: اول ایضاً ج: ص ۱۲۷۔

(۱) ایضاً ص ۱۲۸۔ (۲) گنج ارشدی، ۱۲۸، ج: ۱۔ (۳) گنج ارشدی و نزهة الخواطر و مقصود الطالبین۔

میں گزارنے کا ارادہ کیا شیخ نے اخیر عشرے کے اعتکاف کا حکم دیا، آپ نے اعتکاف کیا، عید کے دن ۱۰۴۰ھ میں شیخ طیب نے مجمع عام میں سلسلہ چشتیہ کے خرقہ خلافت سے نوازا اور اس سلسلے کے اوراد و اذکار کی تلقین فرما کر جو نیور رخصت کیا۔

حصول اجازت کے بعد دیوان صاحب نے مجاہدہ اور ریاضت میں اور اضافہ کر دیا اور چند ہی دنوں میں اتنی صلاحیت بہم فرمائی کہ طیب شاہ نے سلاسل قادر یہ اور سہروردیہ کی اجازت و خلافت بھی عطا فرما کر اپنا خلیفہ مطلق بنا دیا۔ (۱)

اس کے بعد دیوان صاحب نے سلسلہ سہروردیہ میں شیخ تاج الدین سے بھی اجازت و خلافت حاصل کی۔ شیخ یلین جانشین طیب شاہ بنا رہے تھے۔

قطب الاقطاب در سلسلہ سہروردیہ بلا واسطہ از قطب المتورعین حضرت شیخ تاج الحق والشرع والدین جھوسی مجاز است۔ (۲)

سلسلہ قادر یہ میں طیب شاہ کے علاوہ شیخ شمس الدین کالپی سے خلافت حاصل ہوئی، حصول خلافت کے واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے، اس واقعہ سے دیوان صاحب کی عظمت و جلالت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے، شیخ شمس الدین بھی ایک مرتبہ جو نیور آئے تو دیوان صاحب کی خانقاہ میں تشریف لائے، دیوان صاحب اس وقت درس میں مصروف تھے، جب درس سے فارغ ہوئے تو شیخ شمس الدین نے اپنے پاس بلا کر فرمایا۔

خدائے تعالیٰ حوالہ نمودن نعمت مراد پریش شفا فرستادہ خدا مفت دادہ است
بگیرید آنچه داشته آہی (۳)

ان سلاسل میں حصول خلافت پر ہی آپ نے قناعت نہیں کی بلکہ اشغال قلندریہ میں استفادہ کی غرض سے شیخ عبدالقدوس جو نیوری نبیرہ شیخ قطب بنیائے دل کی خدمت میں حاضری دینے لگے مگر پورے ایک سال تک نہ شیخ نے آنے کی غرض دریافت کی اور نہ آپ نے از خود بتانا مناسب سمجھا، ایک سال گزرنے کے بعد ایک دن شیخ عبدالقدوس

(۱) گنج ارشدی ۱۲۷۔ (۲) مناقب العارفین۔

(۳) گنج ارشدی ج ۱ ص ۱۲۹۔

نے خود ہی فرمایا کہ نصف شب گزر جانے کے بعد آیا کرو۔

اس زمانہ میں نصف شب کے بعد پل کا دروازہ بند ہو جاتا تھا اور شیخ کی خانقاہ دریا کے اس پار تھی مگر اس سے آپ کے پائے طلب میں لغزش تک نہ آتی اور آپ ہر روز آدھی رات کے بعد تیر کر دریا کے پار جاتے اور شیخ سے کسب فیض کرتے، آخر میں شیخ نے سلسلہ قلندریہ کے ساتھ ساتھ سلسلہ مدار یہ قدوسیہ اور شطاریہ کی خلافت بھی عطا فرمائی، شیخ عبدالقدوس کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب شیخ عبدالقدوس کے پاس کوئی طالب آتا تو فرماتے کہ میں اب ضعیف ہو گیا ہوں میاں محمد رشید بہت اچھا ذکر کرتے ہیں ان کے پاس جاؤ۔ (۱)

ان سلاسل میں تکمیل کے بعد بھی ذوق طلب نے چین نہیں لینے دیا اور خواہش پیدا ہوئی کہ سلسلہ قادر یہ چشتیہ میں شیخ حسام الحق مانکپوری کے خاندان سے نسبت حاصل کر لینا چاہئے، چنانچہ شاہ راہی سید احمد مانکپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ راہی نے بکمال شفقت و محبت چند دن اپنے پاس رکھ کر خلعت خلافت سے مشرف فرمایا۔ (۲)

ان مشائخ کے علاوہ اس دور کے دوسرے مشائخ سے بھی آپ کو اجازت حاصل ہوئی بخوف طوالت ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اب آخر میں مؤلف مناقب العارفین کی رائے جو دیوان صاحب کے متعلق ظاہر کی ہے نقل کی جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

(بحذف القاب) بندگی میاں شیخ عبدالرشید ابد اللہ تعالیٰ ظللال عاطفہ علی
روس المعتقدین والمریدین کہ فرید عصر است دو حید و ہر در شریعت استادہ است
دور طریقت صاحب الرشاد مخزن حقائق است منبع دقائق، طالب مجاہدہ
است وصاحب مشاہدہ، قطب ولایت است و یگانہ زماں، غوث وقت
است و قبلہ جہاں، باوجود ایس ہمہ کمالات اعتقاد و جماعت فقراء و صوفیہ آنقدر
دارد کہ ہر کجا نام فقیرے می شنود بلا توقف پیش وے می رود قصد ملاقات
وے می کند و شدت مجاہدہ کہ وے دارد خارج طوق بشر است نفس امارہ را

(۱) سمات الاخیار ص ۴۰ (۲) گنج ارشدی ۱۲۴ و نزہۃ الخواطر، ج ۵۔

تابع و مطمئن ساختہ وے سلمہ اللہ قبل از اختیار این طریقہ مدتہ در تحصیل علم
می گذارند و بعد از تحصیل کتب متداولہ در درس می ماند۔ انتہی بلطفہ
یہ تحریر دیوان صاحب کی زندگی کا صحیح و کامل مرتع ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان
صاحب کا مقام خود ان کے معاصرین و متعلقین کی نگاہ میں کیا تھا۔

شعر و سخن

دیوان محمد رشید کو شعر و سخن میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا، جس پر انکا دیوان شاہد ہے۔
انکے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

گردشگر دتا گردنہ گردی در راہ کے بدانی کہ در این راہ سوارے باشد
اپنے والد ماجد کے جائے مدفن کے متعلق کتنا عمدہ شعر کہا ہے:
چوں یار بہ بنگالہ کند مسکن و ماویٰ شمس بہ بدخشاں نہ رود لعل بہ بنگ است

غزل کا نمونہ

ہر نگاہ اودعاے دیگر است پیش زلفش بلائے دیگر است
من بیکدم سیر عالم می کنم روح را دستے و پائے دیگر است
بر بدن صد زخم خنجر گر زنی کے بمرم جاں بجائے دیگر است
از دل شمس دے تمکین مجوے ہر دیش چوں ہو وہاے دیگر است (۱)

تصنیف و تالیف

دیوان صاحب درس و تدریس کے علاوہ تالیف و تصنیف میں بھی اپنے معاصرین
میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔

سرعت تالیف میں آپ کے ہمعصروں میں آپ کا کوئی ثانی نہیں، آپ نے بعض

(۱) دیوان شمس قلمی۔

ایسی اہم کتابیں لکھیں جو گیارہویں صدی کی علمی یادگار بن گئیں۔ ان کے ہر تذکرہ نگار نے
ان کے دوسرے کمالات کے ساتھ تصنیفی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے اور اکثر کتابوں کا
تعارف کرایا ہے مگر افسوس کہ ان کتابوں میں دو کے سوا اب تک کوئی کتاب بھی طبع نہ ہو سکی
اور نہ آئندہ اس کی امید ہے۔

تلاش و جستجو سے دیوان صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) رشیدیہ عربی: اس کے متعلق صاحب نزہۃ الخواطر رقمطراز ہیں:

ومن مصنفاته الرشیدیة فی فن المناظرۃ وہی اشہر مصنفاته تلقاها
العلماء بالقبول تعلیقا و تدریسا (۱)

(آپ کی تصانیف میں رشیدیہ بہت مشہور ہے، علماء نے اس کی جانب خاص توجہ
کی ہے اور اس پر حواشی و شروح لکھے ہیں اور درس میں داخل کر لیا ہے)۔

رشیدیہ دیوان صاحب کی حیات ہی میں بہت مشہور ہو گئی تھی اور اسی زمانہ میں
ملا محمود کے ایک شاگرد ملا عبدالباقی جو پنپوری نے اس پر کچھ اعتراضات کئے تھے، اس کے
جواب میں دیوان صاحب کے ایک شاگرد نے رد الباقیہ نامی ایک کتاب لکھی تھی جس میں
ملا عبدالباقی کے اعتراضات کے جواب کے ساتھ رشیدیہ کے مغلقات کو بھی خوبی سے حل
کیا ہے، یہ رشیدیہ کی بہترین شرح ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جو پنپور کے کتب
خانہ میں موجود ہے۔

حافظ امان اللہ بنارس المتوفی ۱۱۲۳ھ نے بھی رشیدیہ کی ایک مختصر شرح لکھی ہے، اس
کے علاوہ اور علماء نے بھی شروح و حواشی سے اس کی اہمیت و افادیت کو دوبالا کر دیا ہے، اس
کتاب کو دیوان صاحب نے ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں تصنیف کیا تھا جس کا واقعہ اوپر
گزر چکا ہے۔

۲- تذکرۃ الخو: یہ مبادیات نحو میں مختصر سا رسالہ ہے، اسے دیوان صاحب نے اپنے
مختلے صاحبزادے شیخ ارشد کے لئے لکھا تھا۔ یہ رسالہ آج کل خلاصہ کے نام سے نحو میر کے

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۵۔

آخر میں شائع ہوتا ہے، تقریباً دو صفحہ میں دیوان صاحب نے نحو کے جملہ عوامل کو بڑے دلنشین انداز میں بیان کر دیا ہے۔

۳- ترجمہ معینیہ: یہ تذکرۃ النحو کی چار ورتی شرح ہے جو اپنے صاحبزادے معین الدین کے لئے لکھی تھی، یہ شرح عصر و عشا کے درمیانی قلیل وقفہ میں تحریر کی تھی۔

۴- ہدایۃ النحو: یہ بھی فن نحو میں ہے جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ خانقاہ رشیدیہ میں نہیں ہے۔

۵- شرح ہدایۃ الحکمۃ (عربی)

۶- شرح اسرار الخلوقات (عربی): صاحب تجلی نور اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔ شرمی بعبی بغایت مستحسن و خوب، عربی میں نہایت عمدہ اور بہتر شرح ہے۔

۷- زاد السالکین: فن تصوف میں مختصر سا مگر جامع رسالہ ہے جس میں تصوف کے مسائل کو سلیس فارسی زبان میں قریب الفہم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

۸- مقصود الطالین: اوراد و اذکار میں مختصر سا رسالہ ہے۔

۹- حاشیہ شرح مختصر عضدی (عربی)۔

۱۰- حاشیہ کافیہ ابن حاجب۔

۱۱- دیوان سمنی۔

۱۲- مکتوبات (۱)

ان کتابوں میں صرف رشیدیہ، تذکرۃ النحو، مکتوبات طبع ہو چکی ہیں، بقیہ کتب میں چند تو خانقاہ میں اب تک موجود ہیں اور اکثر معدوم ہو چکی ہیں، صرف کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

وفات

آپ کو شعبان کی آخری تاریخوں سے بخار آنا شروع ہوا، علاج معالجہ کے باوجود

(۱) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۹ و نزہۃ الخواطر ج ۵، تجلی نور ص ۲۷۲ و سمات الاخیار ص ۵۴۔

حالت دن بدن بگڑتی گئی، نقاہت و ضعف میں اضافہ ہوتا رہا، لیکن معمولات میں فرق نہیں آنے پایا، نماز باجماعت معمول کے مطابق ادا کرتے رہے، مگر رمضان کی آٹھویں تاریخ یوم پنجشنبہ کو کمزوری بے حد بڑھ گئی اور تیمم کر کے پلنگ ہی پر نماز پڑھی رات کو حالت زیادہ خراب ہو گئی، لیکن نصف شب کے بعد کچھ افاقہ ہوا تو آپ نے تیمم کیا اور تہجد میں مشغول ہو گئے، اس سے فراغت کے بعد معمول کے مطابق ذکر بالجہر میں مشغول ہو گئے، آواز اتنی بلند تھی کہ باہر والوں کو سنائی دیتی تھی ذکر پورا کرنے کے بعد فجر کیلئے تحریمہ باندھنا چاہا تو لوگوں نے بتایا کہ ابھی وقت نہیں ہوا ہے، فرمایا کہ میاں ہو گیا ہے اور لیٹ گئے، صبح صادق کے قریب اٹھے تیمم کیا لیکن اس بار شدت ضعف سے تیمم کرنے میں بھی دشواری پیش آئی مگر کسی طرح تیمم کر کے فوراً لیٹ گئے، لوگ نماز پڑھنے مسجد چلے گئے اور آپ بھی تحریمہ باندھ کر نماز میں مصروف ہو گئے، دوسری رکعت کے سجدہ میں تھے کہ نویں رمضان ۱۰۸۳ھ یوم جمعہ کو روح مبارک قفس غضری سے پرواز کر گئی۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر کیا دیوانے نے موت پائی ہے

آپ کے تلمیذ خاص و خلیفہ اجل شیخ محمد ماہ دیو گامی اعظم گدھی نے نماز جنازہ پڑھائی اور رشید آباد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گنجینہ علم و فن اور مخزن رشد و ہدایت کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ (۱)

اخلاق و سیرت

مزاج میں حد درجہ قناعت و استغنا تھا، امراء و سلاطین کے دربار میں جانا قطعاً پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ نواب سعد اللہ خاں جب شاہجہاں کی وزارت سے مستعفی ہوئے تو شاہجہاں نے ان سے کہا کہ اپنا قائم مقام تجویز کر لو، انھوں نے دیوان صاحب کا نام نامی پیش کیا شاہجہاں نے ایک شخص حاجی محمد سعید نامی کے ذریعہ دو ہزار روپے زاد راہ کے لئے

(۱) سمات الاخیار ص ۶۱ تجلی نور ص ۲۷۲ ج ۱، و نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۷۶، تذکرہ علمائے ہند میں ہے کہ تحریمہ کے

وقت وفات ہوئی۔

اور ایک عریضہ دیوان صاحب کی خدمت میں ارسال کیا اور اشتیاق ملاقات ظاہر کیا، دوسرا خط حاکم جو نپور مرزا مکرم خاں کے نام روانہ کیا کہ جس طرح ہو سکے دیوان صاحب کو آمادہ کر کے میرے پاس دہلی بھیج دو لیکن زبردستی نہ کرنا، دیوان صاحب نے شاہجہاں کی پیشکش کو قبول نہیں کیا، بعد میں دو ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کئے مگر اسے بھی قبول نہیں فرمایا۔ (۱)

سنت نبوی کو حتی الوسع ترک نہ فرماتے (۲)، جملہ امراض میں شہد اور کلونجی استعمال فرماتے اور شفا یاب ہوتے، ایک مرتبہ بخارا آیا ملا محمود جو نپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ نے علاج کیا مگر صحت نہ ہوئی تو آپ نے کلونجی اور شہد منگا کر استعمال کیا اور بخار زائل ہو گیا، ملا محمود نے تعجب کے لہجے میں فرمایا ”کہ دوائے گرم درتپ صفاوی چگونہ مفید شد“ دیوان صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ”شمار بر قول حکماء اعتماد است و مرا بر قول خدا و رسول“ (۳)

وضو، نماز اور مصلیٰ کی پاکی میں حد درجہ اہتمام تھا، جب تک دریا کا پانی ملتا کنویں کے پانی سے وضو اور غسل نہیں کرتے تھے۔ (۴)

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

تا کسے جمعیت خاطر با احتیاط وضو کند نماز او ہم جمعیت میسر آید و چوں در وضو احتیاط نمی کند در نماز تفرقہ خاطر آید (۵)

مائے مستعمل اگر کپڑے میں لگ جاتا تو اسے دھوتے اور فرماتے کہ ہر چند موافق فتویٰ آب آن طاہر است اما تقویٰ شستن راجی خواهد۔ (۶)

علمی کمالات کے ساتھ بڑے شجاع و دلیر تھے، تیر اندازی میں مہارت رکھتے تھے،

(۱) گنج ارشدی ج ۱: ۳۰۲ و زہد الخواطر ج ۵ ص ۳۷۶ و سمات الاخیار ص: تذکرہ علمائے ہند ص: ۱۱۹۔

(۲) تجلی نور ص ۷۲ ج ۱۔

(۳) سمات الاخیار، گنج ارشدی و: ۱۴۰۔

(۴) گنج ارشدی و: ۱۳۷۔

(۵) گن ارشدی و: ۱۴۰۔

(۶) تجلی نور ج ۱ ص ۷۲ گنج ارشدی ج ۱: ۱۳۷۔

ایک مرتبہ سیر کو نکلے، آپ کے شاگرد شیخ عبدالشکور منیری بھی ہمراہ تھے، راستے میں نواب شاہ نواز خاں قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، آپ اس کے قریب پہنچے تو ایسے مقام پر بیٹھ گئے جو تیر کی آماجگاہ تھا اور شیخ عبدالشکور منیری سے فرمایا کتاب لاؤ، کچھ پڑھ پڑھا لیا جائے اور درس شروع کر دیا، اثنائے درس میں ایک تیر بالکل چہرے کے پاس سے گذر گیا مگر تقریر میں کسی طرح کا انتشار نہیں پیدا ہوا، نواب آپ کی اس جرأت و شجاعت پر متحیر ہو گیا۔ (۱)

زد و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ بچتہ تعمیر پسند نہ تھی، اگر کسی کو مضبوط عمارت بناتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے کہ یہ کیا بے خبری ہے کہ شئی فانی کو باقی رکھنے کی کوشش میں لگا ہے، خانقاہ کا چھپر بہت معمولی تھا، ایک دفعہ کثرت بارش کی وجہ سے اس قدر پانی ٹپکا کہ گدی میں پانی بھر گیا، ایک صاحب نے کہا کہ عمدہ قسم کا چھپر بنا دیا جائے تو آپ نے منع فرما دیا اور کہا چھپر برائے مانع آب ساختہ برائے منع آفتاب است چرا کہ ایام بارش چہار ماہ است اول و آخر کم بارد و در میان ہم شب و روز باستیعاب بارش نمی شود، اگر کسے حساب نماید پانزدہ شانزدہ روز خواہد بود پس کار عاقل نیست کہ برائے اس قدر ایام خانہ سازد و آفتاب تمام روزی باشد خانہ برائے آنست۔ (۲)

پاکلی کے مقابلہ میں گھوڑے کی سواری پسند تھی، اکثر پیدل چلتے تھے اور بہت تیز، چنانچہ نماز فجر کے بعد جو نپور سے چلتے اور منڈ واڈیہ میں جو جو نپور سے ۳۳ میل کے فاصلہ پر ہے ظہر کی نماز جماعت سے ادا کرتے۔ (۳)

وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ کفن میں عمامہ نہ دیا جائے اور نہ ایصال ثواب کے لئے گوشت وغیرہ دعوت کی صورت میں پکایا جائے اور نہ تین دن سے زیادہ میرا سوگ منایا جائے، نہ قبر کو پختہ بنایا جائے۔ (۴)

(۱) گنج ارشدی ج ۱: ۱۵۰۔

(۲) گنج ارشدی ج ۱، ورق ۱۵۔

(۳) گنج ارشدی و سمات الاخیار۔

(۴) زہد الخواطر ج ۵ ص ۲۷۷۔

اولاد

مبدأ فیاض نے دیوان صاحب کو جملہ نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ آپ کے نو بچے پیدا ہوئے جن میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے ایام رضاعت ہی میں فرط آخرت بن گئے۔ (۱)

چار لڑکے زندہ رہے اور اپنے باپ کے صحیح جانشین ہوئے، سب سے بڑے شیخ محمد حمید تھے اور سب سے چھوٹے شیخ غلام قطب الدین درمیان میں شیخ محمد ارشد و شیخ غلام معین الدین تھے، ان چاروں کے مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) شیخ محمد حمید: یہ ۱۰۳۷ھ میں پیدا ہوئے دیوان صاحب نے تاریخی نام ابو عضد محمد حمید تجویز فرمایا، اور اوائل عمر میں شاہی فوج میں داخل ہوئے اور فن سپہ گری کے جوہر دکھائے، لیکن آخر میں ملازمت ترک کر کے درس و تدریس و افادہ بخلق میں مشغول ہو گئے، چند کتب کے علاوہ جملہ کتابیں دیوان صاحب ہی سے پڑھی تھیں اور اجازت و خلافت بھی دیوان صاحب سے حاصل تھی (۲)، ان کی ذکاوت و فطانت اور مہارت علم پر خود دیوان صاحب کو پورا اعتماد تھا، ایک دفعہ ایک تقریب کے سلسلہ میں دیوان صاحب شیخ پورہ ضلع الہ آباد تشریف لے گئے، ساتھ میں شیخ محمد حمید بھی تھے، قاضی الہ آباد شیخ محمد آصف دیوان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ایک تصنیف (حاشیہ تفسیر بیضاوی) ملاحظہ کیلئے پیش کی، دیوان صاحب نے شیخ حمید کو دیدیا، قاضی کو یہ بات گراں گذری کہ خود نہیں دیکھا اور صاحبزادے کو دے دیا وہ کیا دیکھیں گے، اور شیخ محمد حمید کا امتحان لینے کی غرض سے کہا کہ چند مقامات پر کچھ اشکال ہیں، اگر آپ رفع فرمادیں تو نوازش ہوگی اور چند سخت اشکالات پیش کردئے، شیخ محمد حمید نے سنتے ہی مدلل تفسیری بحث جواب دیا، قاضی صاحب اس حاضر دماغی اور تبحر علمی پر حیرت زدہ ہوئے۔ (۳)

(۱) گنج رشیدی۔

(۲) گنج ارشدی ج ۱، ص ۱۵۔

(۳) گنج ارشدی ج ۱، ص ۱۶۔

سرعت تحریر میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے ایک دفعہ ایک طالب علم نے درخواست کی کہ مجھے حسامی عنایت فرمادیں تو نوازش ہوگی، آپ نے اسی رات کو پوری حسامی لکھ کر اس طالب علم کے حوالہ کر دی۔ (۱)

دیوان صاحب کے مرض الموت میں امامت آپ ہی کے سپرد تھی، دیوان صاحب کی وفات کے بعد شہر کے علماء و مشائخ نے دستار جانشینی آپ کے سر پر باندھ کر آپ کو دیوان صاحب کی جگہ پر بیٹھانا چاہا جس کے آپ مستحق بھی تھے لیکن آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور مجلس کے اختتام پر فرمایا:

عزیزان خواستند کہ درمیان برادران منازعت پیدا نمایند الحمد للہ کہ نشد، (۲)
اپنے جد امجد شیخ محمد مصطفیٰ کے مزار کی زیارت کے لئے پورنیہ تشریف لے گئے، واپسی پر راستے میں بحالت مسافرت ۲۴ رمضان ۱۰۸۶ھ کو بومر ۴۹ سال رحلت کی، نعش جو پور لاکر رشید آباد میں دیوان صاحب کے جوار میں دفن کی گئی۔ (۳)

(۲) شیخ محمد ارشد: ان کی ولادت ۱۰۴۱ھ میں ہوئی، دیوان صاحب نے ابی الکشف محمد ارشد سے تاریخ پیدائش نکالی اور بدرالحق لقب عنایت فرمایا، اکثر کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور چند استاذ الملک سے، بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی کمال حاصل کر لیا اور دیوان صاحب نے خرقہ خلافت سے مشرف فرمایا (۴)، روزانہ کا معمول تھا کہ دوپہر تک درس و تدریس میں رہتے اور ظہر کی نماز اول وقت جماعت کے ساتھ ادا کر کے پھر افادہ طلبہ میں منہمک ہو جاتے، اس مشغولیت کے باوجود وظائف اور اشراق و چاشت کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی تھی، ریاضت شاقہ کے برداشت کرنے میں بالکل دیوان صاحب کے مثیل تھے، سنت نبوی پر شدت کے ساتھ عمل

(۱) ایضاً ورق ۱۶۔

(۲) ایضاً ورق ۱۶۔

(۳) ایضاً ورق ۱۶۔

(۴) گنج ارشدی ج ۱، ص ۱۰۔

(۵) ایضاً ورق ۱۰، گنج ارشدی ج ۱، ص ۱۰۔

تھا، بیماروں کی تیمارداری اور جنازوں میں پیدل شرکت کا خاص اہتمام تھا، توکل اتنا تھا کہ اگر کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تو بھی خوشی کا اظہار فرماتے، دیوان صاحب کو آپ کے زہد و تقویٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ پورنیہ کے سفر میں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت دستور ہے کہ جب دوست دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ تحفہ پیش کرتا ہے آپ جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے تو کیا ہدیہ پیش کریں گے، دیوان صاحب یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ ارشد کو پیش کر دوں گا۔

تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ خاندان رشیدیہ میں شیخ محمد ارشد کا مقام دیوان صاحب کے بعد سب سے بلند ہے، آپ کو ۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ھ کو بخار آنا شروع ہوا خاندانی طبیب کلن مصر اید کا علاج ہوا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا، متعلقین نے دوسرے اطباء کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا، بخار بدستور قائم رہا اور ضعف و نقاہت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، دوران مرض ایک دن مفتی محمد جمیل صاحب عیادت کے لئے تشریف لائے اور حال دریافت کیا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

دل بعشق آں پری بیکر نمی دانم چه شد درد سر باقی بجاؤ سر نمی دانم چه شد
ای کہ میگوی چرا آشفته خاطر گشتہ دل بر نفس بستہ ام دیگر نمی دانم چه شد
غرض مرض بڑھتا گیا نقل و حرکت کی طاقت سلب ہو گئی ۲۴ جمادی الاخریٰ کو عصر کی نماز شروع کی تو کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے ارکان پورے طور سے ادا نہ ہو سکے، یہ حالت دیکھ کر آپ کے جانشین اور خلیفہ شیخ غلام محمد رشید بن محبت الدین بن ارشد رونے لگے اور عرض کی کہ جس ولی کی نماز میں دنیا میں فرق آجائے وہ دنیا میں باقی نہیں رہتا، ایسا ہی ہوا۔ ۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۳ھ کی شب میں کلمہ لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے ہوئے واصل بحق ہو گئے، پسماندگان میں تین صاحب زادے اور ایک صاحبزادی اور تقریباً ۳۰ خلفاء اور بے شمار تلامیذ و ارادتمند چھوڑے۔ (۱)

(۳) شیخ غلام معین الدین: ان کی پیدائش ۲۴ شوال ۱۰۶۳ھ کو ہوئی ان کے اور شیخ

ارشد کے درمیان میں دیوان صاحب کے دولڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں مگر بچپن ہی میں سب کے سب فوت ہو گئے۔

دیوان صاحب نے آپ کا تاریخی نام ابوالواعظ رکھا (۱)، دیوان صاحب کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت انہی سے تھی، ان کی اکثر معروضات کو دیوان صاحب کے دربار میں قبولیت حاصل تھی (۲)، انہوں نے ابتدائی کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور متوسطات کو شیخ ارشد سے، ۲۹ رمضان ۱۰۸۰ھ کو جمعہ کے دن دیوان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور ۱۰۸۳ھ کو ان کی وفات سے چند ماہ پہلے خلعت خلافت سے مشرف ہوئے۔ (۳)

غلام معین الدین نے درس و تدریس کے بجائے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا لیکن اصلاح باطن و تزکیہ نفس سے کبھی غافل نہیں ہوئے، تقویٰ، طہارت، عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا، آپ فرماتے تھے کہ

مراد رسپاہ گری از ہیچ کس شرمندگی نمی آید اما وقتی کہ کمالات قطب الاقطاب

و نام پیرد شگنیر مذکور می شود شرمساری گردم کہ از اں بزرگان نسبت دارم و ہیچ

وصف حضرات ایشان در خود نمی بینم۔ (۴)

شاہ عالم کے ہمراہ حیدرآباد کی مہم پر گئے ہوئے تھے، اثنائے راہ میں ۲۸ رزی قعدہ ۱۱۲۰ھ کو وفات پائی، تابوت جو پنور لایا گیا اور اپنے آبائی قبرستان رشید آباد میں شیخ ارشد کے بائیں فن ہوئے، وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۳ سال ایک ماہ ۳ دن تھی، آپ کے چھوٹے بھائی غلام قطب الدین نے یہ تاریخ وفات لکھی۔

حریف نفس را دولت قریں بس شہید زہد را قصر بریں بس

فتا فی اللہ چوں گشتی رسالت معین الدین ترا ایزد معین بس (۵)

(۱) گنج ارشدی و ۲۱۱۔ (۲) گنج ارشدی ج ۱، و ۲۱۰۔

(۳) ایضاً ۲۵۔ (۴) گنج ارشدی و ۲۱۰۔

(۵) گنج ارشدی و ۲۱، سمات الاخیار۔

(۴) شیخ غلام قطب الدین: ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۶۷ھ کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے، اپنی تاریخ پیدائش آپ نے خود بیان کی ہے۔

روز آدینہ یازدہم ربیع الثانی (۱)

۱۰۶۷

۱۰۷۰ھ میں دیوان صاحب سے بیعت اور مشرف بخلافت ہوئے (۲)، ایک دن شیخ ارشد کی مجلس میں اہل تصوف کا لباس زیب تن کئے بیٹھے تھے، ملا محمد نصیب خلیفہ شیخ محمد ارشد نے عرض کیا کہ آپ درویش ہیں یا سپاہی، برجستہ جواب دیا کہ

نہ سپاہی نہ درویش من طالب علم ام

میں سپاہی ہوں نہ ولی بلکہ ایک طالب علم ہوں۔

شیخ ارشد یہ جواب سن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ سچ کہا۔ (۳)

صبح دو گھنٹہ تلاوت کے بعد ذکر و اذکار میں مشغول ہو جاتے، اس سے فراغت کے بعد مطالعہ کتب میں لگ جاتے فارسی اور ہندی کے اشعار بہت عمدہ کہتے تھے، تاریخ نویسی میں کمال حاصل تھا، جرأت و شجاعت میں یکتا روزگار تھے۔

گنج رشیدی ملفوظات قطب الاقطاب (دیوان صاحب) اکثر مطالعہ میں رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ

از مطالعہ اس خود در مجلس قطب الاقطاب می یایم (۴)

(اس کے مطالعہ سے اپنے آپ کو دیوان صاحب کی مجلس میں پاتا ہوں)۔

اسی (۸۰) برس کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۱۱۴۷ھ کو چہار شنبہ کے دن رحلت فرمائی،

شیخ غلام محمد رشید جانشین شیخ ارشد نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (۵)

(۱) گنج ارشدی ۲۲۰۔

(۲) ایضاً ۲۲۰۔

(۳) گنج ارشدی ۲۲۰۔

(۴) گنج ارشدی ۲۳۰ و سمات الاخیار۔

(۵) سمات الاخیار بحوالہ گنج فیاضی قلمی، گنج ارشدی ۳۲۵۔

دیوان صاحب کے خلفا و مجازین: آپ کے خلفاء کی تعداد تقریباً چالیس ہے، ان میں مشاہیر کے نام یہ ہیں:

(۱) شیخ محمد ارشد: ان کا مفصل ترجمہ گذر چکا ہے۔

(۲) شیخ میر سید قیام الدین: یہ تحصیل سگرڈی ضلع اعظم گڑھ کے باشندہ تھے لیکن گورکھپور میں سکونت اختیار کر لی تھی اسی لئے گورکھپوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

(۳) شیخ میر سید جعفر پٹوی: دیوان صاحب کے خلفاء میں آپ کا مقام بہت بلند ہے، دیوان صاحب فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مجھے جعفر کے طفیل بخش دیں گے، آپ کا اور شیخ میر قیام الدین کا مفصل حال سمات الاخیار میں مذکور ہے۔

(۴) شیخ نصرت جمال عرف ملتان شاہ جامع گنج رشیدی المتوفی ۱۰۹۰ھ

(۵) شیخ نور الدین مداری المتوفی ۱۰۹۳ھ آپ دیوان صاحب کے ارشد تلامذہ

سے ہیں۔

(۶) شیخ عبدالشکور منیری المتوفی ۱۰۹۰ھ آپ کو بھی دیوان صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

(۷) شیخ محمد ماہ دیوگامی دیوان صاحب کے خاص شاگرد ہیں، آپ ہی نے دیوان صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

(۸) شیخ آیت اللہ المتوفی ۱۰۷۷ھ

(۹) شیخ محی الدین متوکل جو پوری۔

(۱۰) قاضی محمد مودود جو پوری تلك عشرة كامله.



مولانا سخاوت علی جوینیوری

آٹھویں صدی ہجری کی ابتداء سے بارہویں صدی تک دیار پورب میں شہر جوینیوری اسلامی تہذیب و ثقافت کا اہم ترین مرکز رہا ہے۔ اس سرزمین سے بیشتار علماء و فضلاء اور صوفیا پیدا ہوئے جنہوں نے مدرسہ اور خانقاہ، دونوں کو اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے آباد کیا۔

حاجی معین الدین ندوی لکھتے ہیں:

وكانت جوینیور من ارق مدن الهند في ايام الدولة الشرقية وخرج منها

خلق من العلماء لا يحصرهم عدد (۱)

سلطنت شرقیہ کے دور میں جوینیور ہندوستان کے شہروں میں بہت باروق

شہر تھا اور اس میں بے شمار علماء پیدا ہوئے۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی ۸۴۸ھ، شیخ ابوالفتح سون

بریس المتوفی ۸۵۸ھ، میر سید عبدالاول محدث المتوفی ۹۶۸ھ، مولانا علاء الدین الہ داد

المتوفی ۹۳۹ھ، استاذ الملک محمد افضل عثمانی متوفی ۱۰۶۸ھ، ملا محمود مصنف شمس بازغہ متوفی

۱۰۶۸ھ، دیوان رشید مصنف مناظرہ رشیدیہ متوفی ۱۰۸۲ھ، ملا محمد جمیل مرتب فتاویٰ

عالمگیریہ متوفی ۱۱۲۳ھ وغیرہ اپنے اپنے عہد میں یہاں کے علمائے فنون اور مشائخ کبار

میں گزرے ہیں۔

ان میں العالم النبیل والفاضل الجلیل مولانا سخاوت علی بن رعایت علی حنفی جوینیوری

اپنے معاصرین میں خاص شہرت اور مقام کے مالک تھے۔

تیرہویں صدی کے علماء مشرق میں مولانا شریعت و طریقت کے مسلم مقتدا

(۱) معجم الامکنہ ج ۶۱۔

اور امامت و عبقریت کے اعلا مقام پر نظر آتے ہیں۔ بالخصوص حدیث و فقہ میں کامل دستگاہ اور خاص مہارت رکھتے تھے۔ صاحب اتحاد نے فقہائے ہند کی فہرست میں آپ کا شمار نہایت شاندار اور پر شوکت الفاظ میں کیا ہے۔ آج کی صحبت میں جوینیور کی تاریخ علمی سے آپ ہی کی داستان زیر عنوان ہے۔

نام و نسب اور خاندانی حالات

سخاوت علی بن رعایت علی بن درویش علی بن نذر علی عمری (۱) اس سے آگے سلسلہ نسب تلاش و تتبع کے باوجود حاصل نہ ہو سکا۔ آپ نسلاً شیخ فاروقی ہیں اور شیخ محمد کوفی کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں مولانا نے خود فرمایا از اولاد شیخ محمد کوفی ہستم پس محمدی نسبت است بہ یکی بطون فاروقی (۲)

خواجہ محمد (۳) نے کوفہ کب اور کن حالات میں چھوڑا۔ ہندوستان کی اقامت کو دوسرے اماکن پر کیوں ترجیح دی؟ اس کی تفصیل سے تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ راقم نے مولانا کے خاندان کے بعض اہل علم سے اس کی تفصیل جاننے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی بس اتنا معلوم ہو سکا کہ شیخ کوفی کوفہ سے ہرات آئے پھر وہاں سے ہندوستان آ کر قصبہ منڈیا ہوں، مضافات جوینیور میں فروکش ہو گئے۔

شیخ کوفی کا ہندوستان کے مشہور شہروں کو چھوڑ کر ایک غیر معروف قصبہ کو جائے اقامت کے لیے انتخاب کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی آمد ہندوستان میں فتنہ تیوری کے لگ بھگ ہے جبکہ دلی کی تمدنی و معاشرتی دنیا میں باختران کے تیز و تند جھونکے چل رہے تھے اور دیار پورب میں شہر جوینیور سلطان ابراہیم شاہ شرقی المتوفی ۸۴۴ھ کے حسن انتظام، علم دوستی اور علماء و فضلاء کے ساتھ داد و دہش اور فیاضانہ سلوک کی وجہ سے

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲۔

(۲) جواب سوالات تسع ص ۱۲۲۔

(۳) خواجہ محمد بن مخدوم شیخ اسد الدین آفتاب ہند کے خلفاء میں تھے اور انھیں کے ہمراہ دہلی سے ظفر آباد تشریف لائے پھر یہاں سے منڈیا ہوں کو شرف و وطنیت سے نوازا۔ (حبیب الرحمن)

مرجع خلاق بنا ہوا تھا اور اطراف عالم سے ارباب کمال دارالخیرہ جو پنپور کی جانب کھینچے چلے آ رہے تھے۔ قرین قیاس ہے کہ انھیں وجوہ کی بناء پر شیخ کوفی نے بھی ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کے بجائے یہاں کی سکونت اختیار کی۔

سن پیدائش و ابتدائی حالات

آپ ۲۶ یا ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے اس وقت آپ کے خاندان میں علم و فضل کا خاص چرچا تھا اور خاندان کے اکثر لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے جس کی وجہ سے علم کے ساتھ گھر میں فراغت و فہمیت بھی تھی اس لیے آپ کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی۔ مبتداءً فیاض نے ذہانت و فطانت سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا جس کے آثار ایام طفولیت ہی سے نمایاں تھے (۱)

سن تمیز کو پہنچے تو خاندان کے طریق کے مطابق اولاً حفظ قرآن شروع کیا اور صرف چھ ماہ کی مدت میں حفظ سے فراغت حاصل کر لی۔ اس کے بعد فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا قدرت علی ردولوی سے پڑھیں اور متوسطات مولانا احمد اللہ تاتا می اور مولانا احمد علی چریا کوٹی کی خدمت میں ختم کیں اور تکمیل وقت کے عدیم المثال محدث اور مجاہد حضرت شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی بڈھانوی کے زیر تربیت کی اور عمر کے مختصر سے حصہ میں آمد روزگار ہو گئے۔ (۲)

تبحر علمی

آپ کے تمام تذکرہ نگاروں نے آپ کے تبحر علمی کا نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ زیدی لکھتے ہیں:

در اندک زمان فاضل جلیل و عالم نبیل گشت شہرہ فضیلت بر سر آسمان رسید و علم

(۱) تجلی نور ص ۱۰۶ و نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۹۲۔

(۲) القول الجلی ص ۱، و تجلی نور ص ۱۰۶، و تذکرہ علمائے ہند۔

تفوق بہ اقران افراشت و سر د بازاری علمائے وقت گردید ملک العلماء وقت و استاذ الملک زمانہ بود در دور آخری زندہ کنند علوم جو پنپور و زیندہ مسند فضلائے گزشتہ شد (۱)

(قلیل مدت میں جلیل القدر عالم ہو گئے اور ان کی فضیلت کا چرچا بام آسمان تک پہنچ گیا۔ معاصرین میں سب سے آگے نکل گئے اور وقت کے ملک العلماء اور استاذ الملک قرار پائے۔ آخری دور میں جو پنپور کے علوم کو زندہ کرنے اور فضلائے گزشتہ کے مسند کو زینت بخشنے کا شرف آپ کی حصہ میں آیا)۔

مولانا سید عبدالحی الحسنی تحریر فرماتے ہیں۔

الشیخ العالم الکبیر المحدث احد العلماء المشہورین (۲)

بیعت و خلافت

تحصیل علوم ظاہری سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے اور مجددین احمدی حضرت سید احمد بریلوی قدس اسرار ہم کی خدمت میں حاضر ہو کر طریقہ مجددیہ نقشبندیہ میں شرف بیعت حاصل کیا۔

نزہۃ الخواطر میں ہے۔

واخذ الطریقة عن السید الامام احمد بن عرفان الشہید البریلوی

ولازمه برہة من الزمان (۳)

حضرت سید احمد بن عرفان شہید بریلوی سے سلوک اخذ کیا اور ایک زمانہ

تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔

علوم ظاہری کی طرح علوم باطنی میں بھی کمال جدوجہد اور مجاہدہ و ریاضت فرمائی

(۱) تجلی نور ص ۱۰۶۔

(۲) نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۹۲۔

(۳) نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۹۲۔

تا آں کہ حضرت سید صاحب نے خلافت سے سرفراز فرما دیا۔
مولانا خود لکھتے ہیں:

اس فقیر کو بیعت طریقہ چشتیہ اور قادریہ اور نقشبندیہ اور مجددیہ اور محمدیہ، ہاتھ پر امیر المؤمنین سبط اکبر مجدد ثالث عشر امام اوحید سید احمد دامت برکاتہم الی یوم التئاد ہے اور اجازت بیعت لینے کی بھی حاصل ہے اٹح (۱)

تعلیم و تدریس

ان جملہ کمالات ظاہری و باطنی کی تحصیل کے بعد آپ نے مسند تدریس کو زینت بخشی اور ہر قسم کے علائق دنیوی سے کنارہ کش ہو کر اشاعت علوم میں مصروف ہو گئے۔ مولانا کی علمی حذاقت و مہارت اور زہد و تقویٰ کا آوازہ چہار سو پھیلا اور طلباء کا اتنا ہجوم ہوا کہ جو نیپوری مجلس علمی میں نئے سرے سے جان آگئی۔

ہزار ہا طلبائے دیار و امصار فیض علوم چیدند و صد ہا فارغ التحصیل گشتند در دور آخری زندہ کنندہ علوم جو نیپور شد (۲)

(دور نزدیک کے ہزاروں طلباء نے آپ کے فیض علم سے استفادہ کیا اور سیکڑوں فارغ التحصیل ہوئے اور اس طرح آخری دور میں جو نیپور کے علوم کو آپ کی ذات سے نئی زندگی ملی)

جو نیپور سے باندہ

شدہ شدہ آپ کے کمالات کی شہرت نواب ذوالفقار بہادر مرحوم باندہ تک پہنچتی۔ نواب مرحوم چونکہ علم دوست، علماء نواز تھے اس لیے بہ ہزار اصرار مولانا کو باندہ بلا دیا۔ مولانا نے نواب کی خواہش کو قبول کر لیا اور کچھ دنوں کے لیے باندہ کی اقامت منظور کر لی۔

(۱) رسالہ وصول ص ۳۶۔

(۲) تجلی نورج، ص ۱۰۶۔

نواب باندہ نے ہر طرح سے آپ کی توقیر و تعظیم کا خیال کیا اور آپ کے فضل و کمال کو دیکھ کر انتظام مدارس اور افسریت علماء کے مناصب آپ کو تفویض کر دیے، اس وقت نواب کے دربار میں بڑے بڑے نامور علماء و فضلاء موجود تھے مگر جو قدر و منزلت نواب کے دل میں مولانا کی تھی وہ کسی کو حاصل نہ تھی۔

اسی زمانہ میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی بھی باندہ میں نواب کے دربار سے منسلک تھے۔ مولانا عبدالحلیم مولانا کی جلالت علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بہت سی کتابیں مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھ کر حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے اور ساتھ ہی درس و تدریس، وعظ و افتاء کی تربیت بھی مولانا سے حاصل کی۔ (۱)

مولانا فطرتاً آزاد منش واقع ہوئے تھے اس لیے باندہ کے قیام کو زیادہ دنوں کے لیے برداشت نہ کر سکے اور بعد عزت و رفعت ایک سال بعد جو نیپور واپس چلے آئے۔

استخلاص الجامع الشرق و قیام مدرسہ قرآنیہ

اس زمانہ میں الجامع الشرق (بڑی مسجد شہر جو نیپور) پر شیعوں کا قبضہ تھا جس میں وہ تعزیر داری اور اس کے سات تاشہ نفاہ وغیرہ بجاتے۔ اس سے بھی آگے کی بات یہ تھی کہ مسجد کو بارات ٹھہرانے کا بنگلہ بنا دیا تھا جس میں باراتی ہر قسم کی رنگ رلیوں کا پروگرام مناتے۔ غرض اسی طرح کی اور بھی بہت سی شنیع حرکات سے مسجد کی عزت و حرمت کو بالکل پامال کر دیا تھا۔ (۲)

مولانا کی غیرت ایمانی خانہ خدا کی اس بربادی کو کب برداشت کر سکتی تھی چنانچہ آپ نے ابتداء میں انھیں لوگوں کو مسجد کی عزت و حرمت کی جانب توجہ دلائی مگر ان لوگوں نے اس کا کچھ اثر نہیں لیا تو آپ نے حاکم وقت کے دربار میں استغاثہ پیش کر دیا اور بڑی جدوجہد اور سعی کوشش کے بعد مولانا کی دلی مراد برآئی اور مسجد کو براءت حاصل ہوئی۔

(۱) القول الجلی ص ۳۔

(۲) القول الجلی ص ۳۔

ہر وقت ادھر ہی لگا رہتا تھا۔ اور ادھر مولانا امیر علی شہید کے واقعہ شہادت نے ہندوستان سے مزید دل برداشتہ کر دیا۔ بالآخر ۱۲۷۲ھ میں آپ نے ہجرت کا عزم مصمم کر لیا اور سفر کی تیاریاں شروع کر دیں اس سلسلے میں آپ نے کسی سے کسی قسم کی کوئی اعانت لینا پسند نہیں فرمایا اس لیے زادراہ کے لیے اپنی والدہ کا وظیفہ جو بنارس کلکٹری میں مقرر تھا، فروخت کر دیا اور متوسلین و معتقدین کے سدراہ ہونے کے باوجود اپنے اہل و عیال کو ہمراہ لے کر بذریعہ کشتی بنارس، غازی پور، بلیا اور عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچ گئے اور چند یوم مولانا بدیع الزماں کے یہاں قیام فرما کر مکہ معظمہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بغایت آرام و اطمینان سے بلدہ امین میں پہنچا دیا۔

صاحب نزہتہ لکھتے ہیں:

ثم سار الى الحرمين الشريفين مع خاله المفتي محمد غوث الجونفوري سنة اربع وستين و مائتين والفرح فحج وزار ورجع الى الهند ودرس وافاد مدة ثم هاجر الى مكة المباركة مع عياله سنة اثنين وسبعين الخ (۱)
بعد ازاں اپنے ماموں مفتی محمد غوث جو پنپوری کی معیت ۱۲۶۲ھ میں فریضہ حج ادا فرما کر ہندوستان مراجعت کی اور درس و افادہ میں لگ گئے۔ پھر ایک مدت کے بعد مکہ معظمہ کی جانب مع اہل و عیال کے ہجرت فرمائی....

وفات

ہجرت کے بعد کے حالات بالکل پردہ خفا میں ہیں کسی تذکرہ نگار نے اس کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا۔ مولانا کے خاندان کے لوگ جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں، ان سے بھی اس سلسلے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

حاصل کلام اسی دار ہجرت میں وقت موعود آ گیا اور ۶ شوال ۱۲۷۴ھ کو جان جان آفریں کو تفویض فرما کر جو اررحمت میں داخل ہو گئے۔ مکہ معظمہ کے مشہور قبرستان جنت

(۱) نزہتہ ج ۷ ص ۱۹۲، والقول الجلی ص ۴، و تجلی نور ج ۱ ص ۱۰۸۔

آپ نے فوراً مسجد کو صاف کرایا اور اس میں نماز پنجگانہ اور جمعہ کا انتظام فرمایا۔ اس کے بعد مولانا کو یہ خیال ہوا کہ اس میں کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے مسجد کی آبادی کا سبب ہو اس خیال کے ماتحت آپ نے حسبہ اللہ مدرسہ قرآنیہ کی بناء ڈالی اور سب سے پہلے حافظ امام الدین لاہوری کو جو ایک خدا رسیدہ اور صاحب حال بزرگ تھے، مدرس مقرر فرمایا اور خود قیام ہندوستان تک مدرسہ کے انتظام و انصرام کی دیکھ رکھ فرماتے رہے اور ہجرت کے وقت اہل جو پنپور اور دیگر مضافات کے علاقہ کے لوگوں کو مدرسہ کی بقاء و ترقی کی وصیت بھی فرمائی۔ بھمد اللہ مدرسہ آج تک جاری ہے اور علوم دینیہ بالخصوص حفظ قرآن کی خدمت انجام دے رہا ہے جس سے بے شمار علماء، فضلاء اور حفاظ نے فیض اٹھایا ہے اور اٹھارے ہیں۔ (۱)

مختصر تاریخ مسجد

ملک الشرق ابراہیم شاہ شرقی المتوفی ۸۴۴ھ کے نقشہ کے مطابق ان کے بڑے لڑکے سلطان محمود شاہ شرقی المتوفی ۸۶۲ھ نے اس مسجد کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کا اندرونی صحن ۲۱۷ × ۲۱۹ فٹ ہے اور پورا احاطہ ۳۲۰ فٹ پورب و پچھم اور ۳۰۷ فٹ اتر دکھن ہے۔ اور بلندی ۲۰۰ فٹ سے زیادہ ہے۔

تاریخ تعمیر کے بارے میں مورخین کی آراء مختلف ہیں لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ۱۴۳۸ ÷ اور ۱۴۷۰ ÷ کی درمیانی مدت میں اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ (۲)

ہجرت مکہ معظمہ

مولانا ۱۲۶۳ھ میں اپنے ماموں مفتی محمد غوث صدر الصدور کی معیت میں فریضہ حج ادا کر چکے تھے اور اپنی نگاہوں سے تجلیات ربانی کے مظہر اتم کو دیکھ آئے تھے اس لیے دل

(۱) تذکرہ علمائے ہند و نزہتہ ج ۷ ص ۱۹۲، والقول الجلی ص ۳۔

(۲) تاریخ شیراز ہند۔

المعلیٰ میں اس گنجینہ علم و فضل کو دفن کیا گیا۔ (۱)

تاریخ وفات:

گفت زیدی از سز تاریخ سال ختم شد شور علوم جون پور

مولانا کا مسلک

مولانا مسلک حنفی تھے اور حنفی ہونے پر آپ کو فخر بھی تھا۔ چنانچہ مولانا نے ہجرت کے وقت جو وصیت نامہ تحریر فرمایا تھا اس میں بصراحت ارقام فرماتے ہیں کہ فقیر اب اس ملک سے سفر کرتا ہے ایسا نہیں کہ کم علم لوگ پیچھے لوگوں کو گمراہ کریں اور فقیر کی طرف نسبت کریں کہ حنفی ہونے کو بد سمجھتے تھے اور حالانکہ فقیر حنفی ہے یا تقلید صحیح کے منکر تھے یا اہل حدیث خواہ فقہ سے انکار تھا اور عمل حدیث (؟) خواہ فقہ پر نہ تھا جس کو شبہ ہو فقیر کے پاس آ کر رفع اشتباہ کر لے اور جس چیز سے غافل ہو ہو شیار ہو جائے اب زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں والسلام (۲)

ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آنچہ اعتراضات متعصبین است بجواب آل پر داختن شان اہل حق نیست اگر فرضاً علماء اعلام حنفی نہ باشند چہ وجہ طعن ست حنفی و شافعی بودن خود واجب نیست چنانچہ در فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت مرقوم است و نسبت فقیر حاجت استفسار نیست حنفی ام و بہ حنفیت... حقہ اتباع امام اعظم را فخر میدانم الخ (۳)

(متعصبین جو اعتراضات کرتے ہیں اس کے جواب کی جانب متوجہ ہونا اہل حق کی شان نہیں ہے۔ بالفرض اگر بڑے بڑے علماء حنفی نہیں تھے تو اس میں وجہ طعن کچھ بھی نہیں کیونکہ حنفی و شافعی ہونا واجب نہیں جیسا کہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں ہے اور فقیر

(۱) تجلی نور ج ۱ ص ۱۰۸۔

(۲) رسالہ نصاب ص ۱۱۔

(۳) جواب سوالات تسعہ ص ۱۵۔

کے بارے میں پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں حنفی ہوا اور حنفیت حقہ کے ساتھ امام اعظم کی اتباع کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہوں)

مولانا کی تحریروں کے بعد کسی کا اس بات پر اصرار کہ مولانا غیر مقلد تھے اور موجودہ اہل حدیث کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے نزدیک کوئی مقام رکھتا ہو لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

تصانیف

مولانا کو درس و تدریس سے فرصت بہت کم ملتی تھی اس لیے تصنیف و تالیف کی جانب چنداں رجحان نہیں ہوا پھر بھی بہت سے رسائل آپ کے قلم فیض رقم سے پیکر تحریر میں آئے جو آپ کے تبحر علمی کی واضح دلیل ہے۔

ان رسائل میں سے اکثر اب ناپید ہیں۔ راقم الحروف کو بڑی تلاش و جستجو کے بعد مندرجہ رسائل دستیاب ہو سکے افادہ عام کے لیے ان کا تعارف درج ہے۔

(۱) رسالہ فقر: فن تصوف پر ایک مختصر سا رسالہ ہے جسے چار فائدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فائدہ اول تقویٰ کے بیان میں ہے۔ دوسرا اہل تصوف کی عادات میں، تیسرا قلوب کی بیماریوں اور اس کے علاج پر مشتمل ہے۔ چوتھے میں انقطاع دنیا و ترک خواہشات کا تذکرہ ہے۔

اس رسالہ کے مضامین خود مصنف کے بیان کے مطابق فتوح الغیب مصنفہ شیخ عبدالقادر جیلانی سے ماخوذ ہیں۔

(۲) رسالہ نصاب: یہ چند ورتی ایک کتابچہ ہے جس میں پندرہ بیش قیمت نصیحتیں نہایت مؤثر انداز میں بیان کی گئی ہیں دراصل مولانا کی پندرہ وصیتیں ہیں جو آپ نے سفر ہجرت کے موقع پر اپنے متعلقین کو تحریر فرمائی تھیں۔

(۳) رسالہ عرفان الاوقات: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ نماز پنج گانہ کے اوقات کے متعلق ہے۔ یہ ایک جامع رسالہ ہے جس میں آیات و احادیث کی روشنی میں

مدل طور پر فرائضِ خمسہ کے اوقات کی تجدید کی گئی ہے۔ اس رسالہ میں ہر قسم کے تعصبات سے الگ ہو کر اوقات مختلفہ میں معتدل فیصلہ کیا گیا ہے۔

(۴) رسالہ وصول: یہ رسالہ بھی فن تصوف میں ہے۔

(۵) رسالہ در بیان کلمات کفر: یہ چھ درتی رسالہ کلمات کفر کے بیان میں ہے اس رسالہ میں مصنف نے کلمات کفر کے ساتھ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کو بھی بالتفصیل بیان کیا ہے اور اصل مقصد کے شروع کرنے سے پہلے ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے، جس میں کلمات کفر اور گناہ کبیرہ و صغیرہ کو بڑے سترے انداز میں تحریر کیا ہے۔

(۶) رسالہ نسخ و منسوخ: یہ رسالہ ایک مقدمہ دو فصل اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں نسخ کی تعریف اور اس کے لغوی و اصطلاحی معنی سے بحث کی گئی ہے اور دو فصلوں میں سے پہلی فصل میں آیات منسوخہ کو بیان کیا ہے اور دوسری فصل میں احادیث منسوخہ کو اور خاتمہ میں مسئلہ تقلید سے بحث کی گئی ہے۔ اثبات تقلید کو ایسے اچھوتے اور دلنشین انداز سے بیان کیا ہے کہ طالب حق کے لیے کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود بہت ہی مفید اور مولانا کی علمی عمق پر بالخصوص قرآن و حدیث پر آپ کی دقت نظر کے لیے کافی ثبوت ہے۔

(۷) رسالہ تقویٰ: اس رسالے میں پانچ فرقوں کا بیان ہے۔ مقدمہ میں مولانا رقمطراز ہیں کہ اس دیار میں پانچ قسم کے کلمہ گو موجود ہیں۔ ایک اہل سنت و جماعت، دوسرے شیعہ امامیہ۔ تیسرے صوفی روش، چوتھے منکر مذاہب۔ پانچویں جاہل تابعدار رسم و عادت و خواہش نفسانی۔ اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ ان فرقوں میں صحیح راستہ پر صرف اہل سنت و الجماعت ہیں۔

(۸) توہم فی احادیث نبی الکریم: مولانا کی یہ سب سے اہم اور نادرہ روزگار تصنیف ہے اس کتاب کو مولانا نے صحاح ستہ کے علاوہ تقریباً چالیس کتب احادیث و رجال کو سامنے رکھ کر مرتب فرمایا ہے۔

کتاب کی ترتیب ابواب فقہی پر ہے اور ہر باب میں احناف کے متدللات کو حوالہ اور

درجہ حدیث کے بیان کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب اس لائق ہے کہ احناف کے ہر ادارہ میں اس کو رکھا جائے اور اہل مدارس اپنے نصاب میں داخل کر لیں تاکہ طلبہ کی نظر سے مسائل کے ساتھ ساتھ دلائل بھی گزرتے جائیں اور تقلید محض کے بجائے تحقیق کا ذوق پیدا ہو۔ راقم کے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ مترجم ہے اور پانچ سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے کتاب الطہارت ہے اور سب سے آخر میں کتاب الفرائض۔

ان رسائل کے علاوہ رسالہ فصیح فی مسئلہ تقلید صحیح، رسالہ اسرار، رسالہ تعداد لغات۔ اسلم فی المنطق، رسالہ علم الفرائض، رسالہ عرض نیک در رد شیعہ بھی آپ کی مشہور تصانیف ہیں مگر انتہائی کوشش کے باوجود یہ رسائل دستیاب نہ ہو سکے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلك امرا۔

اولاد

مبداء فیاض نے مولانا کو علم و فضل کی دولت جاودانی کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی شادمانی عطا فرمائی تھی۔ مولانا کے چھ بچے تھے جن میں دو لڑکیاں مریم، اور جویریہ نامی تھیں اور چار بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے مولانا شیخ محمد اور سب سے چھوٹے مولانا ابوالخیر محمد مکی تھے۔ (۱)

(۱) شیخ محمد: یہ ہمیشہ اپنے والد ماجد کے ساتھ رہے۔ علم فضل، زہد و ورع، درس و افتاء اور تقریر و تحریر میں نادرہ روزگار تھے۔ مولانا سلامت اللہ کانپوری سے ان کا ایک مناظرہ آج بھی اہل علم میں مشہور ہے۔ ایک رسالہ کتاب البیوع میں تحریر فرمایا جو اہل علم کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مگر افسوس کہ اس گنجینہ علم و فضل کا عین شباب میں ۲۷ شوال ۱۲۷۳ھ کو انتقال ہو گیا۔ (۲) مولانا حکیم محمد جنید: سفر ہجرت میں یہ اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ تھے اور ہر طرح کے فیضان علمی و عملی سے اکتساب کرتے رہے۔ مولانا کی وفات کے بعد جو نپور

(۱) از افادہ مولانا علی اعلیٰ نبیرہ مولانا محمد شبلی۔

واپس تشریف لائے اور مولانا عبدالحمید فرنگی محلی استاذ مدرسہ امام بخش سے متوسطات پڑھ کر مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے بقیہ کتابوں کی تکمیل کی۔ پھر طب کی طرف متوجہ ہوئے اور حکیم اولاد علی جوینپوری کے مطب میں کچھ دنوں تک تحصیل کر کے اس فن میں بھی مہارت تامہ حاصل کی۔

یہ بھی ہر قسم کے محاسن صوری و معنوی سے آراستہ تھے۔ افتاء، درس و تدریس، وعظ و نصائح اور انتظام مدرسہ قرآنیہ کے ساتھ طبابت بھی کرتے تھے اور اس طرح سے بندگان خدا کی روحانی و جسمانی دونوں خدمتیں انجام دیتے تھے۔ یہ بھی زندگی کی بہاروں سے زیادہ منتفع نہ ہو سکے اور اپنے برادر کبیر کی طرح عالم شباب ہی میں ۱۲۸۱ھ میں واصل بحق ہو گئے۔ (۱)

(۳) مولانا محمد شبلی: یہ ۲۵ شعبان ۱۲۶۳ھ کو پیدا ہوئے۔ مولانا کے سفر ہجرت کے وقت چونکہ صغیر سن تھے اس لیے ہمراہی کے شرف سے قاصر رہے اور اپنے نانا قاضی ضیاء اللہ صدر الصدور کی زیر نگرانی تعلیم کا آغاز کیا۔ خاندانی روایت کے مطابق سب سے پہلے حافظ نعمت اللہ سرانے میری سے حفظ قرآن کیا۔ پھر کتب فارسیہ متداولہ سے فراغت کے بعد مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے اور انھیں کی خدمت میں درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ مفتی صاحب نے فراغت کے موقع پر جو سند انھیں لکھ کر دی تھی وہ ان کے علمی کمال پر روشن دلیل ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں سند نقل نہیں کر رہے ہیں۔

علوم ظاہری کی تحصیل و تکمیل کے بعد آپ نے علوم باطنی کی جانب توجہ کی اور اپنے والد ماجد کے تلمیذ رشید حضرت سید خواجہ احمد نصیر آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف بیعت حاصل کیا اور مدت تک سید صاحب کی خدمت میں رہ کر فیضان روحانی سے مستفید ہوتے رہے۔ اسی زمانہ میں خواجہ احمد نے آپ کے دل میں حدیث کا شوق پیدا کر دیا چنانچہ اپنے مرشد کے حکم سے مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں صحاح ستہ کے علاوہ دوسری کتب حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ ان جملہ کمالات کے بعد ۱۲۸۶ھ میں اپنے شفیق مربی اور نانا قاضی ضیاء اللہ کی معیت میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔

اس مبارک سفر سے واپسی کے بعد علوم دینیہ کی خدمت میں اپنے اسلاف کی طرح مصروف ہو گئے۔ بالخصوص مدرسہ قرآنیہ کے انتظام و انصرام میں کافی دلچسپی لی اور جو مدرسہ اب تک صرف حفظ قرآن کی خدمت انجام دے رہا تھا اس میں اتنی ترقی ہوئی کہ درس نظامیہ کی مکمل تعلیم ہونے لگی۔

۲۱ رمضان ۱۳۱۱ھ کو پھر ۶۵ سال اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

(۴) مولانا ابوالخیر محمد کی: ان کی ولادت ۱۹ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ کو مکہ معظمہ میں ہوئی والد مرحوم کی وفات کے بعد اپنی والدہ اور علاقائی بھائی مولانا جنید کے ساتھ جوینپور تشریف لائے۔ سن تیز کو پہنچے تو حافظ نعمت اللہ سرانے میری سے حفظ کلام پاک شروع کیا اور حافظ احمد جوینپوری سے تکمیل کی اسی زمانہ میں کتب فارسیہ سے فراغت حاصل کر لی۔ اس کے بعد اپنے برادر بزرگ مولانا محمد شبلی سے عربی کتابیں شروع کیں۔ مختصرات کو ان کی خدمت میں مکمل کر کے ۱۲۹۲ھ میں مولانا حکیم محمد عبداللہ چھراوتی تلمیذ رشید مفتی محمد یوسف سے متوسطات شروع کیں اور کچھ کتابیں مولانا سعادت حسین عظیم آبادی تلمیذ مولانا سخاوت علی اور محمد اکرم آروی سے پڑھیں اور تکمیل ابوحنفیہ وقت حضرت مولانا عبدالرحمن فرنگی محلی کی خدمت میں کی۔

اس کے بعد حضرت سید ضیاء النبی بریلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر سلوک کی راہ میں قدم رکھا اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر اس راہ کی بھی تکمیل فرمائی۔

بعد ازاں درس و تدریس و وعظ و افتاء اور اپنے پیشرو بزرگوں کی طرح مدرسہ قرآنیہ کے انتظام میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔ مولانا کی حیات تک یہ مدرسہ علوم ظاہری و باطنی کا ایک سنگم تھا اور مدرسہ ہر اعتبار سے ترقی پذیر تھا اور ہندوستان کے مشہور مدارس میں اس کا شمار ہوتا تھا مگر مولانا کے بعد مدرسہ میں وہ رونق باقی نہ رہی۔

وہ دھوپ تھی جو سنگ گئی آفتاب کے

آپ نے ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی۔ (۱)

تلامذہ

یوں تو مولانا کے چشمہ علم و فضل سے بے شمار تشنگان علوم سیراب ہوئے مگر ان میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا کرامت علی اور ان کے برادر خورد مولانا رجب علی جو پوری، مولانا شاہ امید علی جو پوری، مولانا غلام جیلانی غازی پوری، مولانا فیض اللہ منوی اعظمی، مولانا شیخ محمد محث مچھلی شہری، مولانا محمد یعقوب بہاری، مولانا رحیم اللہ بستوی ارشد تلامذہ میں ہیں اور ان میں سے ہر ایک آسمان علم و فضل کا مہر درخشاں تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سفر حرمین شریفین کی تفصیلی روداد

یہ روداد امام الہند شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے تلمیذ رشید و خلیفہ اجل شیخ محمد عاشق پھلتی متونی فی حدود ۱۱۸۷ھ نے قلمبند فرمائی ہے جو اس سفر میں حضرت شاہ صاحب کے رفیق سفر تھے اس لئے اس کے مندرجات شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ پر مشتمل ہیں جسے شیخ پھلتی نے اپنی نادرہ روزگار تالیف ”القول الجلی فی ذکر آثار الولی“ میں صفحہ ۳۹ سے صفحہ ۴۹ تک میں تحریر فرمایا ہے چونکہ القول الجلی ایک مدت سے نایاب تھی اس لئے حضرت شاہ صاحب پر کام کرنے والے حضرات اس سے استفادہ نہیں کر سکے حالانکہ یہ روداد اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی علمی و عرفانی منزلت اور عظمت شان نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور ایک ایسے مستند ذریعہ سے جس پر خود شاہ صاحب نے بھی اعتماد کیا ہے۔

مدت ہوئی ایک مرتبہ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمن اعظمی نور اللہ مرقدہ سے سنا تھا کہ تکیہ کاکوری میں القول الجلی کا ایک قلمی نسخہ ہے بعد میں معلوم ہوا کہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی اس کا ایک ناقص مخطوطہ ہے، ان دونوں کے علاوہ اب تک کسی تیسرے نسخہ کا علم نہیں ہو سکا اسی کاکوری نسخہ کا عکس لے کر شاہ ابوالخیر اکاڈمی شاہ ابوالخیر مارگ دہلی۔ ۶ نے ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء میں اس نایاب کتاب کو شائع کر دیا ہے، میرے سامنے یہی مطبوعہ نسخہ ہے جو کاکوری والے نسخہ کا عکس ہے کاتب اس نسخہ کی کتابت سے جمعہ ۲۵ شعبان ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۸۱۳ء کو فارغ ہوئے ہیں، کتابت میں جا بجا غلطیاں ہیں بالخصوص عربی عبارت میں غلطیاں بیکد ہیں جس کی وجہ سے استفادہ میں بڑی دشواری پیش آتی ہے پھر بھی شاہ صاحب پر ایک مستند ترین کتاب اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ گئی جسے ایک نعمت غیر مترقبہ ہی کہا جاسکتا ہے، اسی کتاب مستطاب سے سفر حرمین شریفین کی روداد کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے۔ (حبیب الرحمن قاسمی)

آغاز سفر

جب حرمین شریفین کے سفر اور اس کار کا داعیہ پختہ اور عزم مصمم ہو گیا تو ۸ ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ کو قدوہ اصحاب معرفت و عمدۃ ارباب حقیقت شیخ عبداللہ سلمہ اللہ تعالیٰ (والد ماجد شیخ محمد عاشق پھلتی اور دیگر احباب و اصحاب جن میں ایک شیخ محمد پھلتی مؤلف القول الحلی بھی شامل تھے) کے ہمراہ براہ لاہور (وطن مالوف) دہلی سے کوچ کیا، راستے میں ”پانی پت“ سے گذر ہوا تو شاہ شرف الدین قلندر، شاہ شمس الدین ترک اور شاہ جلال الدین قدس اسرارہم کے مزارات پر برائے فاتحہ گئے، یہاں سے چل کر سرہند پہنچے اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے روضہ کی زیارت کی، اسی طرح لاہور و دہلی تو شیخ علی بھویری کے مزار پر فاتحہ کے لئے گئے، لاہور کے بعد ملتان پہنچے تو شیخ بہاء الدین سہوردی اور شیخ رکن الدین قدس اسرارہم کی تربت پر فاتحہ پڑھا، ملتان میں طلبہ و علماء کی ایک کثیر تعداد نے حضرت شاہ صاحب سے بیعت کی اور اسلوک کے اوراد و اشغال حاصل کئے، یہاں سے روانگی کے وقت بہت سے لوگوں نے سفر میں رفاقت کی خواہش ظاہر کی، مگر حضرت شاہ صاحب نے بہ مصلحت وقت انھیں تسلی دی اور واپس کر دیا۔

جب دیار سندھ سے گذر ہوا تو آپ کی آمد کی خبر سن کر اپنے اپنے مقامات سے لوگ ملاقات کے لئے دوڑ پڑے، جن میں سے ایک جماعت شرف زیارت سے فیض یاب ہوئی اور کچھ لوگ تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے ملاقات سے محروم رہ گئے، شہر ٹھٹھ کے مضافاتی قصبہ نصرپور میں جب قافلہ پہنچا تو بہت سے علماء و فضلاء پانچ پانچ چھ چھ کوس سے مسافت طے کر کے رات کے وقت وہاں پہنچے اور اسی وقت خدمت میں باریابی حاصل کر کے سلسلہ بیعت سے منسلک ہو گئے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے، نصرپور کے بعد شہر ٹھٹھ میں شرف نزول فرمایا وہاں بھی دیگر شہروں کی طرح تمام مقامی علماء اور صوفیاء خدمت میں حاضر ہوئے، جن میں سے ایک بڑی جماعت نے بیعت کی سعادت بھی حاصل کی، یہیں حضرت شاہ صاحب کے تلمیذ مخدوم محمد معین (جو اس دیار

کے علمائے کبار میں شمار ہوتے تھے اور کتاب و سنت و جمیع علوم منقول و معقول میں تبحر تام رکھتے تھے، نیز قوم (یعنی صوفیا) کی اصطلاحات سے پوری واقفیت اور علم حقانی کے ادراک میں ذہن ثاقب کے مالک تھے اور حضرت شاہ صاحب کے جمال و کمال کے گرویدہ تھے) خدمت میں حاضر ہوئے اور اس صحبت کو غنیمت کبریٰ سمجھ کر خوب خوب فیوض و برکات حاصل کئے، اور بیعت و ارشاد کی اجازت سے بہرہ یاب ہوئے۔

بندر سورت سے روانگی

چونکہ ہر مقام پر طلبہ و علماء کے قافلے زیارت و ملاقات کے لئے حاضر خدمت ہوتے رہے جس کی بنا پر راستے میں بہت زیادہ توقف ہوا، اور جہازوں کی روانگی کا وقت بالکل قریب آ گیا، اس لئے ہم خدام کو اضطراب اور پریشانی لاحق ہوئی کہ مبادا ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی جہاز روانہ ہو جائیں اور ہم حج کی دولت سے محروم رہ جائیں، ہمارے اس اضطراب و بے چینی کو محسوس کر کے حضرت شاہ صاحب نے ہمیں اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا (گھبراؤ نہیں) انشاء اللہ اسی سال حج سے مشرف ہوں گے، الحاصل ہمارا قافلہ بندر سورت پر پہنچا جب کہ جہازوں کی روانگی کا وقت تقریباً گذر چکا تھا اور سارے جہاز مسافروں کو لے کر روانہ ہو چکے تھے، صرف ایک جہاز باقی رہ گیا تھا مگر وہ بھی مسافروں سے بھر چکا تھا، اس بنا پر بہت سارے لوگ واپس لوٹ رہے تھے مگر بفضل الہی ہمیں جگہ مل گئی، حضرت شاہ صاحب نے اس جہاز پر سوار ہونے کا ارادہ فرمایا تو اکثر احباب نے عرض کیا کہ جہازوں کے سفر کا وقت ختم ہو گیا ہے (اس لئے اب سفر مخدوش ہوگا) پھر یہ جہاز بھی نہایت خستہ حال ہے اور سست رفتار بھی ہے، خود جہاز رانوں کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں بھی اس جہاز پر اطمینان نہیں ہے اس لئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ توقف کیا جائے، احباب کے ان خدشات کو حضرت شاہ صاحب نے کوئی اہمیت نہیں دی اور قافلہ کو لے کر جہاز میں سوار ہو گئے اور فرمایا ”انشاء اللہ امسال حج خواہم کرد“ انشاء اللہ ہم اسی سال حج کریں گے، بہر حال جیسے ہی لنگر اٹھا اور جہاز روانہ ہوا

(بفضلہ تعالیٰ) بادموافق چل پڑی (اور اپنی خستہ حالی و سست رفتاری کے باوجود) ۲۵ دن میں یہ جہاز جدہ پہنچ کر لنگر انداز ہو گیا، جہاز کی اس تیز رفتاری اور اس قدر جلد منزل مقصود پر پہنچ جانے سے دیگر جہاز رانوں کو حیرت ہوئی۔

مکہ معظمہ میں حاضری اور وہاں کے علماء و فضلاء سے ملاقات

۱۵/۱۲/۱۱۳۳ھ کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور عمرہ تمتع ادا فرمایا، پھر ذی الحجہ میں ادائیگی حج سے بہرہ یاب ہوئے، مکہ معظمہ میں اقامت کے دوران وہاں کے علماء و فضلاء سے علمی مذاکرے اور تبادلہ خیالات ہوتے رہے۔

بعض علماء نے حضرت شاہ صاحب کے علمی مقام و مرتبہ کو معلوم کرنے کی غرض سے کچھ اہم علمی سوالات بھی کئے، حضرت شاہ صاحب نے ان کا نہایت شافی جواب دیا جس سے وہ سمجھ گئے کہ یہ جمیع علوم منقول و معقول میں سب پر فائق ہیں، تو ان کی جانب سے درس و افادہ کا اصرار ہوا، چنانچہ ان کے سوال و اصرار پر حضرت شاہ صاحب نے مسجد حرام میں حنفی مصلیٰ کے قریب درس دینا شروع کر دیا، مستفیدین کی اس قدر کثرت ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب کا سارا وقت درس و افادہ میں مشغول ہو گیا، اور حل دقات و کشف مغلفات میں آپ کی اس قدر شہرت ہوئی کہ وہاں کے علماء کبار علمی مشکلات میں آپ سے رجوع کرنے لگے، اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں کے علمی حلقوں میں آپ کی علمی عظمت و مرتبت کا سکہ ایسا بیٹھ گیا کہ وہاں کے اکابر علماء آپ کی صحبت کو غنیمت شمار کرنے لگے اور آپ کے ساتھ انتہائی توقیر و تعظیم کا معاملہ کرتے اور باہم کہتے کہ واللہ باللہ تمام اہل مکہ میں آپ کی علمی شان و مرتبہ کا کوئی نہیں ہے، بہت سے حضرات نے آپ سے گزارش کی کہ اب واپسی کا ارادہ فرمائیے، اس وقت کے گورنر پاشا نے قیام کی ساری ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری پر آمادگی کا اظہار بھی کیا مگر حضرت شاہ صاحب نے اسے قبول نہیں کیا، تو وہاں کے اکابر نے آخر میں یہاں تک فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ اہل مکہ کے ساتھ خیر کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو اسی جگہ مقیم کر دیں گے۔

مکہ معظمہ کے دوران قیام میں ایک سوڈانی عالم نے جو ایک عرصہ سے مکہ میں مجاور تھے خواب دیکھا کہ ایک عزیز ان سے کہہ رہے ہیں کہ اگر عقیدہ اقطاب سیکھنا چاہتے ہو تو شیخ ولی اللہ سے استفادہ کرو، اس خواب کے بعد وہ سوڈانی عالم حضرت شاہ صاحب سے بیعت ہو گئے، اور سلوک کی تعلیم حاصل کر کے بعض اسرار سے ہم کنار ہوئے، بعد ازاں حرمین کے بہت سے حضرات نے آپ سے بیعت کی اور طریقت کے اوراد و اشغال کی تعلیم حاصل کی۔

مدینہ منورہ کی حاضری

فریضہ حج سے فراغت کے بعد دو ماہ مکہ معظمہ میں قیام رہا، بعد ازاں زیارت نبوی کی غرض سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے، اس بابرکت سفر میں بہت سارے اسرار آپ پر منکشف ہوئے، اور جب مدینہ منورہ پہنچ کر روضہ اقدس علی صاحبہا افضل الصلوٰات و اہم التسلیمات کی زیارت سے مشرف ہوئے تو اپنی جانب آنحضرت کی بے غایت عنایات و کرامات مبذول پائی، روزانہ جب مواجہہ شریف میں مراقب ہوتے تو اسرار جدیدہ سے ہم کنار ہوتے، کوئی مجلس بھی اس فیضان سے خالی نہیں رہی۔

ایک بزرگ کا خواب

مدینہ منورہ حاضری سے پہلے ہی شیخ عبدالکریم انصاری نے (جو خادم رسول انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے اور اہل مدینہ کے اکابر میں شمار ہوتے تھے) حضرت شاہ صاحب کو خواب میں دیکھا، علاوہ بریں مواجہہ شریفہ علی صاحبہا افضل الصلوٰات و تسلیمات اکملہا میں بھی آپ کی کرامت و بزرگی معلوم کی تھی، اسی بناء پر وہ آپ کے منتظر تھے، چنانچہ جب آپ مدینہ پہنچ گئے تو قافلہ والوں سے معلومات کر کے آپ کی خدمت میں تشریف لائے اور اپنے خواب کا ذکر کیا اور اسی کے ساتھ اپنی سند سے حدیث مسلسل بالاولیٰ کی اجازت بھی روضہ نبوی علی صاحبہا الصلوٰة و التسلیم کے قریب مقام اصحاب صفہ میں عطا فرمائی۔

ایک عالم کی جانب سے دعوت طعام اور علمی سوالات

مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مدرسین میں سے شیخ طیب نے جن کا فضلاء مدینہ میں شمار تھا حضرت شاہ صاحب کی دعوت کی اور اس مناسبت سے شہر کے دیگر علماء و فضلاء کو بھی بلا رکھا تھا، چنانچہ حضرت شاہ صاحب وقت پر پہنچے شیخ طیب نے دوران گفتگو حضرت شاہ صاحب سے دریافت کیا، آنجناب عربی میں تقریر پر قابو یافتہ ہیں، شاہ صاحب نے ازراہ تواضع فرمایا ہاں ٹوٹے پھوٹے انداز میں کچھ بول لیتا ہوں اس کے بعد انہوں نے کہا بہت سے علماء علمی تبحر اور حل دقائل کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن بعض معقولی مسائل کی تشریح اچھی طرح نہیں کر پاتے کہ اعتراض اپنی جگہ باقی رہتا ہے، جیسے کہ ”مسئلہ تجرد امثال“ ہے کہ اشاعرہ اعراض میں اس کے قائل ہیں مگر جوہر میں اس کو جائز نہیں سمجھتے اس مسئلہ کی تحقیق اور دونوں صورتوں میں وجہ فرق کیا ہے؟

حضرت شاہ صاحب نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ عربی میں اس مسئلہ پر تقریر فرمائی جسے سن کر مجلس میں موجود فضلاء عرب دنگ رہ گئے اور مسئلہ زیر گفتگو کی تحقیق میں ایسے دقیق نکات اور عمیق تدقیقات بیان فرمائیں کہ شیخ طیب نے اسے غنیمت کبریٰ خیال فرمایا۔ اور اس کے بعد پھر کبھی حضرت شاہ صاحب کے سامنے کسی علمی مسئلہ کو نہیں چھیڑا۔

ایک اور علمی سوال اور اس کا حل

مدینہ منورہ کے زمانہ قیام میں ایک عالم نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی تصنیف غنیۃ الطالبین کی ایک عبارت پر جو حنفیہ سے متعلق ہے اشکال پیش کیا اور اس کے حل کے طالب ہوئے، حضرت شاہ صاحب نے تحریری طور پر اس کا ایسا جواب دیا جسے وہاں کے سارے علماء نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا شاہ صاحب نے اس مسئلہ سے متعلق تحریر فرمایا:

تفصیل اشکال

ایک صاحب نے حضرت امام الطریقہ قطب الحقیقہ شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے قول کے بارے میں سوال کیا کہ شیخ جیلانی قدس سرہ نے غنیۃ الطالبین میں فرقہ غیر ناجیہ کی قسمیں بیان کرتے ہوئے مرجیہ کے بارہ فرقوں کا ذکر کیا ہے جن میں احناف کو بھی شمار کیا ہے، پھر مرجیہ کے ان بارہ فرقوں کی تفصیل کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ حنفیہ ابوحنیفہ نعمان کے متبع ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان اقرار و تصدیق ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول..... اور رسول جو کچھ منجانب اللہ لاتے ہیں کو ماننا اور زبان سے اس کا اقرار کرنا جیسا کہ برہوتی نے کتاب الشجرہ میں لکھا ہے۔

حضرت شیخ جیلانی قدس سرہ کی اس عبارت پر دو اشکال وارد ہوتا ہے، اول یہ کہ جن حضرات علماء کے قول پر اعتماد کیا جاتا ہے ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حنفیہ اہل سنت میں سے ہیں، لہذا انہیں فرقہ مرجیہ میں شامل کرنا اور ان کی تصلیل و عدم نجات کا قائل ہونا کیونکر درست ہے؟

دوسرا اشکال یہ ہے کہ جس عقیدہ کی بنا پر فرقہ مرجیہ کو مرجیہ کہا جاتا ہے اسے بیان کرنے کے بعد شیخ نے احناف کو بھی مرجیہ کے زمرہ میں شمار کیا ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ حنفیہ بھی اسی عقیدہ کو مانتے ہیں جس کے مرجیہ قائل ہیں جبکہ واقعہ ایسا نہیں ہے، چنانچہ خود شیخ جیلانی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ مرجیہ کا خیال ہے کہ جس مکلف نے بھی لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لیا اسے کوئی بھی گناہ ضرر نہیں پہنچا سکتا اور نہ وہ دوزخ میں جائے گا اور بلا ریب حنفیہ اس عقیدہ سے بری اور پاک ہیں۔

جواب اشکال

اس کے جواب میں ہم نے عرض کیا کہ ارجاء کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم کے ارجاء کا قائل اہل سنت سے خارج ہو جاتا ہے، دوسری قسم کے قائل ہونے سے اہل سنت سے خروج

نہیں ہوتا، پہلے ارجاء کی تعریف یہ ہے کہ اس بات کا اعتقاد رکھنا کہ جس نے بھی زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کر لی اسے کبھی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا، دوسرے ارجاء کی تعریف یہ ہے کہ اس بات کا معتقد ہونا کہ عمل داخل ایمان نہیں ہے البتہ ثواب و عقاب اعمال پر مرتب ہونگے، اول ارجاء والوں کی تخطیہ و تصلیل پر صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے، اور ارجاء ثانی کے تخطیہ پر سلف کا اجماع ظاہر نہیں ہوا، بلکہ اس باب میں دلائل متعارض ہیں بہت سی آیات و احادیث اور آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایمان عمل سے الگ ایک شئی ہے اور بہت سے دلائل میں قول و عمل کے مجموعہ پر ایمان کا اطلاق ہوا ہے۔

اور درحقیقت یہ ایک لفظی نزاع ہے کیونکہ (جو حضرات عمل کو ایمان میں داخل نہیں مانتے اور جو حضرات قول و عمل کے مجموعہ کو ایمان کہتے ہیں) دونوں فریق کا اس پر اتفاق ہے کہ گناہ گار ایمان سے خارج نہیں ہوتا ہاں عقاب و عذاب کا مستحق ہے، پھر جن دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان قول و عمل کا مجموعہ ہے، انہی توجہ سے انہیں ظاہر معنی سے پھیرا جا سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ اسی دوسری قسم کے ارجاء کے قائل ہیں اور کبار اہل سنت میں ہیں بلکہ امام اہل سنت ہیں، البتہ ان کے تابعین اور اہل مذہب میں مختلف رائے کے لوگ پیدا ہوئے، بعض ان میں معتزلی عقیدہ کے تھے جیسے جبائی، ابوہاشم، زحشری وغیرہ اور بعض مرجئیہ تھے اور بعض ان کے علاوہ اور یہ سب صرف فروع میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے تابع تھے اصول اعتقاد یہ میں ان سے الگ تھے لیکن اپنے فاسد عقیدہ کو (اس کی تشہیر و تائید کی غرض سے) امام صاحب کی جانب منسوب کرتے تھے، نیز امام صاحب کے بعض اقوال سے (غلط طور پر) تمسک کرتے تھے جب حنفیہ میں سے اہل حق مثلاً طحاوی وغیرہ کو اس فتنہ کا ادراک ہوا تو انہوں نے اصول اعتقاد یہ میں امام صاحب کے مذہب کو واضح کیا، اور مبتدعین نے جو غلط باتیں (تلیساً) ان کی جانب منسوب کر دی تھیں انہیں دفع کیا، ان امور سے وہ علماء واقف ہیں جن کے مطالعہ سے تمام مذاہب کی مصنفات گذر چکی ہیں۔

ان مقدمات کی تمہید کے بعد عرض ہے کہ شیخ جیلانی رحمہ اللہ نے فرقہ ضالہ میں

(گمراہ فرقہ) ان اہل ارجاء کا ذکر کیا ہے جو اہل سنت سے خارج ہیں، اسی بناء پر ان کی وجہ تسمیہ میں ان کے عقائد کو بیان کیا ہے اور اس فرقہ میں حنفیہ میں سے ان لوگوں کو داخل کیا ہے جو فروع میں امام ابوحنیفہ کی اتباع کرتے ہیں اور (غلط) دعویٰ کرتے ہیں کہ امام صاحب ان کے ہم عقیدہ ہیں، اس کے بعد امام صاحب کے اقوال میں سے اس قول کو نقل کیا ہے جس سے یہ گمراہ لوگ (امام صاحب سے عقیدہ میں اپنی موافقت پر) استدلال اور تمسک کرتے ہیں، یعنی امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایمان نام اقرار کا ہے۔

اس تقریر سے شیخ جیلانی پر وارد دونوں اعتراض پادر ہوا ہو گئے اور واضح ہو گیا کہ شیخ جیلانی نے امام ابوحنیفہ کو (عقیدہ مرجئیہ سے) مہتم نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے اس کی نسبت ان مرجیوں کی جانب کی ہے جو فروع میں اپنے آپ کو امام صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور ان کے ظاہر اقوال سے اپنے فاسد عقیدہ پر تمسک کرتے ہیں اور امام صاحب کے اقوال کو غلط معنی پہناتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

روایت حدیث کی اجازت

آغاز تعلیم و تحصیل ہی سے حضرت شاہ صاحب کو علم حدیث سے قلبی تعلق تھا، چونکہ مدینہ طیبہ حدیث پاک کا منبع و مرکز ہے اس لئے آپ کا ارادہ ہوا کہ کسی عالی سند شیخ سے کتب حدیث کی روایت اور سند حاصل کی جائے (اس وقت) شیخ ابوطاہر کردی مدنی (جو ایک معمر اور جامع علوم صوفی و محدث تھے) سے عالی سند مشائخ حریمین میں سے کوئی نہیں تھا اس لئے شاہ صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی طلب و خواہش کا اظہار کیا اور مکمل صحیح بخاری پچاس مجلسوں میں کچھ قرآن اور کچھ سماعاً پوری کر لی اور کامل مسند دارمی مسجد نبوی میں محراب عثمانی کے قریب آٹھ مجلسوں میں سماعاً پڑھی اور بقیہ کتب حدیث کے اوائل پڑھ کر اجازت لی، اثناء درس میں (کبھی کبھی) شیخ مشکل و غامض احادیث کے معانی کی تحقیق شاہ صاحب سے دریافت کرتے تو بلا تامل فوراً شاہ صاحب ایسی عمدہ تحقیق بیان کرتے کہ شیخ حیرت میں پڑ جاتے کہ اس نوعمری میں یہ علوم و معارف کس طرح سے حاصل ہو گئے۔

ختم بخاری کے دن شیخ نے خوشی میں اپنی جانب سے دعوت کا اہتمام کیا اور اس موقع پر شیخ نے شاہ صاحب کی بجد عزت افزائی اور توقیر فرمائی، آخر میں جب شاہ صاحب کے بعض اسرار باطنی ان پر ظاہر ہو گئے تو اس وقت سے شاہ صاحب کے عقیدت مند ہو گئے اور استاذ و شیخ ہوتے ہوئے شاہ صاحب کے ساتھ شاگردوں جیسا معاملہ فرماتے اور تصوف وغیرہ کے بعض اشکالات جو ان کے والد سے (حالانکہ وہ یکے از علماء محققین تھے) بھی حل نہ ہو سکے تھے شیخ صاحب نے ان کے حل و کشف کی فرمائش کی جنہیں شاہ صاحب نے تشفی بخش طور پر حل کر دیا (شاہ صاحب کے ان علمی و احسانی کمالات کے مشاہدہ اور تجربہ کی بناء پر شیخ غایت درجہ شاہ صاحب کا اکرام کرتے تھے) اور جب شاہ صاحب شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان پر نظر پڑتے ہی سرو قامت کھڑے ہو جاتے خود اپنے ہاتھ سے فرش درست کر کے تکیہ رکھتے اور پورے جذبہ توقیر و تعظیم کے ساتھ شاہ صاحب کو بٹھاتے اور خود شاگردوں کی طرح سامنے بیٹھتے۔

اظہار تواضع و اعترافِ کمال

آخر میں جب شاہ صاحب نے شیخ سے تحریری اجازت نامہ کی درخواست کی تو فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کو اجازت نامہ تحریر کروں، میں نے تو خود آپ سے استفادہ کیا ہے، لیکن جب شاہ صاحب کی شدت اشتیاق کو محسوس فرمایا تو اجازت نامہ تحریر فرما دیا اور اس میں بھی واضح طور پر اسی پہلی بات کا اعتراف و اظہار فرمایا، چنانچہ اجازت نامہ میں رقم بعض اشعار جو اس بات کے مظہر ہیں درج کئے جاتے ہیں:

- | | |
|---------------------------------|--|
| (۱) اجزتک لکن مثلکم من یحیزنی | ولم تستفد منی ولکن تغیدنی |
| (۲) واكثرما استفادنی انت فی غنی | عنه بل فی جلّه انت فقنتی |
| (۳) فکم حکمة منکم تلقنتھا ولم | تستفد معسار ما قد افدتنی |
| (۴) وما کنت اهلا ان اجیزک انما | دعوت فلبیت النداء اذ دعوتنی ^(۱) |

(۱) ان اشعار کی کتابت میں بے پناہ غلطیاں ہیں غور و فکر کے بعد صحیح نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، واللہ اعلم وعلّمہ اتم۔

ترجمہ: (۱) میں نے آپ کو اجازت دی لیکن آپ جیسے (صاحب کمال) تو وہ ہیں جو مجھے اجازت دیتے ہیں، آپ نے مجھ سے استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ مجھے فائدہ پہنچایا ہے۔
(۲) اکثر وہ علوم و آداب جو آپ نے مجھ سے حاصل کئے ہیں آپ کو ان کی چنداں احتیاج نہیں بلکہ ان کے اکثر میں آپ مجھ پر فائق ہیں۔
(۳) بہت ساری حکمتیں ہیں جنہیں میں نے آپ سے سیکھیں، آپ نے اس کا دسواں حصہ بھی مجھ سے حاصل نہیں کیا جس قدر فائدہ آپ نے مجھے پہنچایا۔
(۴) میں آپ کو اجازت دینے کا اہل نہیں تھا، بات تو صرف اتنی ہے کہ آپ نے مجھ کو آواز دی تو میں نے آپ کی آواز پر لبیک کہا۔

مختلف سلاسل تصوف کی اجازت

شیخ ابوطاہر کردی نے متعدد سلسلہ تصوف یعنی شطاریہ، سہروردیہ، شاذلیہ، رفاعیہ، حدادیہ وغیرہ کی اجازت سے بھی شاہ صاحب کو مشرف فرمایا (ان جملہ سلاسل میں شیخ اپنے والد شیخ ابراہیم کردی قدس سرہ سے مجاز تھے، شیخ ابراہیم کردی اپنے زمانہ کے مشاہیر صوفیا اور محدثین میں سے تھے) اور منبر نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قریب اپنے ہاتھوں سے شاہ صاحب کو خرقہ کلاہ پہنایا۔

ایک رسالہ کی تالیف

(قیام مدینہ کے زمانہ میں ایک دن شاہ صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی کے رسالہ رد روافض فارسی کا تذکرہ اپنے شیخ حدیث شیخ ابوطاہر جمال الدین محمد مدنی کردی کورانی سے کیا تو شیخ نے اس کی تعریف کا حکم دیا) چنانچہ شیخ کی حسب مرضی شاہ صاحب نے ترجمہ کر کے مزید فوائد کا اضافہ کر کے ایک رسالہ بنام المقدمہ السنیة فی الانتصار للفرقة السنیة مرتب کر دیا، جس کی فصاحت و بلاغت کو دیکھ کر علماء عرب متحیر رہ گئے، شیخ نے وہ رسالہ کاتب حروف (شیخ محمد عاشق پھلتی) سے نقل کرا کر اپنے پاس رکھ لیا۔

شاہ صاحب کا ایک دوسرا رسالہ بنام ”القول الجلیل فی بیان سواء السبیل“ جو سلسلہ قادریہ، نقشبندیہ اور چشتیہ کے اشغال کے بیان میں ہے، علاوہ ازیں شاہ صاحب کو اس زمانہ میں حضرت رسالت مآب..... کی جانب سے جو اسرار و مشاہدات حاصل ہوئے تھے، اور شاہ صاحب نے انھیں قلم بند کر لیا تھا، یہ دونوں رسالے شیخ نے خود اپنے قلم سے نقل کر کے حضرت کو سنایا۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کو واپسی اور بوقت واپسی شیخ کا اکرام

جب شاہ صاحب شیخ سے رخصت ہو کر عازم مکہ معظمہ ہوئے تو شیخ نے گھر سے نکل کر کافی دور تک مشایعت فرمائی، شیخ کے فرزند اور دیگر اعزہ تین کوس تک حضرت شاہ صاحب کے ہم رکاب رہے، راستے میں شاہ صاحب جب کسی جگہ (برائے استراحت) بیٹھتے تو یہ حضرات اپنے کپڑے حضرت کے پیر پر ڈال دیتے اور بوقت رخصت فیض صحبت سے محرومی پر اظہار تاسف کیا۔

مکہ معظمہ میں دوبارہ حاضری

مدینہ منورہ سے چل کر ۱۵ شعبان ۱۱۴۴ھ کو دوبارہ مکہ معظمہ پہنچے، سب سے پہلے عمرہ فرمایا، ماہ رمضان میں بھی متعدد عمرے کئے اور ماہ رمضان کے اخیر عشرہ میں مسجد حرام میں بمواجہ بیت اللہ اعتکاف فرمایا، مکہ معظمہ میں جب تک قیام رہا وہاں کے لوگ آپ سے فیوض ظاہری و باطنی حاصل کرتے رہے، اسی وقفہ قیام میں رسالہ فیوض الحرمین تالیف فرمایا اور الحرمین شریفین میں جو حقائق و دقائق اور غوامض و اسرار منکشف ہوئے تھے سب اس رسالہ میں درج کیا۔

بعض تصانیف کی شہرت و مقبولیت

شاہ صاحب دو رسالے ”القول الجلیل فی بیان سواء السبیل“

اور ”المقدمة السنیہ فی الانتصار للفرقة السنیہ“ الحرمین شریفین میں خوب مشہور ہوئے، القول الجلیل کو دیار مغرب اور بصرہ مصر، فلان وغیرہ کے علماء نقل کر کے لے گئے اور شاہ صاحب سے اس کی اجازت بھی لی، المقدمة السنیہ تا تارتک پہنچا، رسالہ فیوض الحرمین بھی بعض مخصوص حضرات کو عنایت ہوا۔

شاہ صاحب کی والدہ محترمہ کی وفات

مجاورت بیت اللہ کے زمانہ میں بندہ سے کئی بار فرمایا کہ جب کبھی گھر کی جانب توجہ ہوتی ہے تو یک گونہ غم و اندوہ کی تیرگی اور خانگی انتظام میں انتشار کی کیفیت محسوس ہوتی (اس گفتگو پر) چند ہی دن گزرے تھے کہ شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ کی وفات کی خبر پہنچی، اس موقع پر اکابر مکہ نے مراسم تعزیت ادا کئے، بعد میں شاہ صاحب نے فرمایا وہ تیرگی جو محسوس ہو رہی تھی اس کا سبب یہی (والدہ کی وفات) تھا۔

وطن کی واپسی

(چودہ ماہ الحرمین شریفین میں گزار کر وہاں کے فیوض ظاہری و باطنی سے مالا مال ہو کر) وطن واپسی کا ارادہ ہوا، جہاز پر سوار ہوئے تو پھر بفضلہ تعالیٰ ہوا موافق و سازگار رہی، اور صرف ۲۳ دن میں جدہ سے چل کر بندر سورت پر پہنچ گئے، چند دن سورت میں قیام فرما کر براہ دکن سوئے وطن روانہ ہوئے، راہ میں جس شہر سے بھی گذر ہوا وہاں کے علماء و مشائخ نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔

گو الیاء پہنچے تو شیخ خانون اور شیخ محمد غوث قدس سرہما کے مزارات پر گئے، اور ایصال ثواب کیا، اسی طرح جب اکبر آباد پہنچے تو شیخ امیر ابوالعلا کے مزار پر حاضر ہوئے اور ان کے برکات و حسنات کا تذکرہ فرمایا، وہاں سے چل کر ۱۴/۱۱۳۵ھ کو باخیر و خوبی دارالخلافہ شاہ جہاں آباد (دہلی) میں شرف نزول فرمایا، وطن سے روانگی اور واپسی دونوں کی تاریخیں خود شاہ صاحب نے یوں نظم کی ہے۔

قافلہ فضل و کمال یعنی

حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی

صدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند کے

مشاہیر تلامذہ

مولانا کی مختصر سوانح

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بن مولانا مملوک علی ۱۳ صفر ۱۲۳۹ھ کو نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ قرآن کریم وطن ہی میں حفظ کیا محرم ۱۲۶۰ھ میں حضرت مولانا مملوک علی انھیں اور حضرت حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کو بغرض تعلیم و تحصیل دہلی لے گئے۔ دہلی کالج اور گھر پر اپنے والد بزرگوار سے علوم و فنون کی تحصیل کی اور حدیث حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجتہد دی رحمہما اللہ سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد بھی ایک سال تک دہلی میں قیام رہا بعد ازاں بمشاہرہ چالیس روپے ماہانہ گورنمنٹ کالج جمیر میں ملازمت کر لی اور ۵ سال تک وہاں رہے۔ اس کے بعد سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز ہوئے، لیکن انقلاب ۱۸۵۷ء کی بنا پر جلد ہی اس عہدہ سے مستعفی ہو کر میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں ملازمت کر لی۔ جب ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو مولانا اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ ۱۹ سال تک یہ خدمت جلیلہ انجام دیتے رہے۔ اس مدت میں تقریباً ۱۵۱ طلبہ نے آپ سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔

تاریخ روانگی:

ز دہلی برآمد ولی بہر حج ☆ بہشتم صبح از ربیع دوم
ہزار و صد و چہل و سہ سال بود ☆ کہ اس داعیہ گشت بالفعل ضم

تاریخ واپسی:

ولی چون پس از حج بدہلی رسیدہ ☆ سرآمد سفر منقطع گشت رنج
بتاریخ رابع عشر از رجب ☆ نہ سال ہزار و صد و چہل و پنج
آپ کے برادر خورد شاہ اہل اللہ دہلوی نے پہلے حج کی تاریخ یوں نظم کی ہے۔

بدل می داشتہم عمرے کہ در احرام حج کوشم

بجہ اللہ والتمہ بدار مقصد ہم آغوشم

ز ہاتف سال تاریخش نخستین طوف می جستم

قبلت منک طاعاتک رسید از غیب در گوشم

☆ ☆ ☆

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے اور سلوک و تصوف کی راہیں انھیں کی زیر نگرانی طے کیں۔ مولانا پر بالعموم جذب و کیف کی حالت طاری رہتی تھی۔ سراپا عجز و انکسار تھے۔ دنیا اور علاقہ دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔

حضرت تھانوی قدس سرہ نے مولانا کے حلقہ درس کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

حلقہ درس کیا ہوتا تھا حلقہ توجہ ہوتا تھا یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے۔ آیت کا مطلب بیان کر رہے ہیں اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں۔ (اشرف السوانح ج ۳ ص ۳۳) اسباق میں عجیب و غریب مضامین اور لطائف بیان ہوتے تھے حضرت تھانوی نے زیادہ تر علوم عجیبہ و غریبہ مولانا محمد یعقوب نانوٹوی ہی سے اخذ کئے تھے اور نہایت لطف لے لے کر انھیں مولانا کے حوالہ سے بیان کرتے تھے۔

۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۱ دسمبر ۱۸۸۴ء کو بمعرض ہریضہ وطن مالوف نانوٹوی میں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے (۱)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے ۱۵۱ تلامذہ کی فہرست میں جن حضرات کے حالات اس وقت تک دستیاب ہو سکے ہیں۔ سن وفات کی ترتیب کے ساتھ ہدیہ ناظرین ہیں۔ اور اہل علم و نظر سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی معلومات سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

(۱) حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی

حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کا وطن گنگوہ تھا ۱۲۸۴ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۹۰ھ میں حضرت مولانا احمد حسن امر وہی کی رفاقت میں تکمیل کی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے علاوہ انھوں نے حضرت حمید الاسلام مولانا نانوٹوی سے بطور خاص استفادہ کیا۔ اور بالعموم سفر و حضر میں حضرت کے ساتھ رہتے تھے۔ مناظرہ سے خاص دلچسپی تھی۔ تقریر دلچسپ اور شیریں ہوتی تھی مزاج میں ظرافت تھی اس کے باوجود حق گوئی کا

(۱) مولانا محمد الحسن نانوٹوی ص ۱۸۸، تاریخ دیوبند ص ۴۴۴۔

دامن ہاتھ سے کبھی نہ جانے دیتے تھے۔ حکیم محمود خاں سے دہلی میں طب کی تحصیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد خورجہ کے مدرسہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ پھر مدرسہ عبدالرب دہلی میں منتقل ہو گئے۔ آخر میں کانپور میں سکونت اختیار کر لی تھی وہیں ۱۳۱۵ھ میں وفات پائی۔

مولانا فخر الحسن صاحب مطب کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی رکھتے تھے۔ مباحثہ شاہجہانپور کے علاوہ التعلیق المحمود حاشیہ سنن ابی داؤد، حاشیہ ابن ماجہ، حاشیہ تلخیص المفتاح آپ کی علمی یادگار ہیں۔ آپ نے حضرت حمید الاسلام مولانا نانوٹوی کی ایک مفصل سوانح حیات بھی لکھی تھی مگر وہ کانپور میں نذر آتش ہو گئی۔ (۱)

(۲) مولانا فتح محمد تھانوی

قیام دارالعلوم کے پہلے سال ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۲۸۵ھ میں فارغ ہوئے۔ مولانا دارالعلوم میں تعلیم و تحصیل کے ساتھ تدریس کا خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد اپنے وطن مالوف میں مدرسہ حوض والی مسجد میں مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا فتح محمد فضلاء دارالعلوم کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی سے بھی حظ وافر رکھتے تھے اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی جیسا یگانہ روزگار عالم و مجدد آپ کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہے۔ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی کی شرح حزب التحریر فارسی کا آپ نے سلیس اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۲)

(۳) مولانا امیر باز خاں مظفر نگری

۱۷ جمادی الآخر ۱۲۵۸ھ کو بھونچ پور ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے ۱۲۸۳ھ کی ابتداء میں داخل ہوئے۔ سال اول میں شرح وقایہ، نور الانوار، مسلم شریف، میبذی، شرح عقائد نسفی، مقامات حریری اور سببہ معلقہ کی تحصیل کی۔

(۱) تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۸ مطبوعہ ساہیوال پاکستان، نزہۃ النوا طرج ص ۸ ص ۳۵۴۔

(۲) نزہۃ النوا طرج ص ۸ ص ۵۳۔

تعلیم کے ساتھ دارالعلوم میں ابتدائی کتابوں کا درس بھی دیتے رہے۔
 شیخ عبدالرحیم سہارنپوری خلیفہ شیخ عبدالغفور صواتی المعروف بہ اخوند صاحب سے بیعت کا شرف حاصل تھا استدراک الامیر من الاسرار اللطیف الجبیر کے نام سے اپنے مکاشفات کو جمع کیا تھا جو ہلاکی پریس ساڈھورہ میں طبع ہوا ہے۔ جامعہ سہارنپور میں بحیثیت واعظ کے مولانا کا تقرر ہو گیا تھا۔ حضرت مولانا محمد مظہر صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور کے زمانہ صدارت میں دو مرتبہ قائم مقام صدر مدرس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۹ ربیع الآخر ۱۳۲۵ھ کو راہی عالم جاودانی ہوئے۔ (۱)

(۴) مولانا منفعت علی دیوبندی

مولانا منفعت علی بن بلند بخش دیوبندی کی ولادت اور نشوونما دیوبند میں ہوئی ۱۲۸۴ھ میں دارالعلوم میں داخل ہو کر ۸ رسال میں تمام علوم متداولہ کی تحصیل کر کے ۱۲۹۲ھ میں سند فراغ حاصل کی حضرت مولانا یعقوب نانوتوی کے علاوہ مولانا سید احمد دہلوی اور دیگر اساتذہ دارالعلوم سے بھی تحصیل علم کی۔ فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں مدرس ہو گئے اور ۱۳۱۸ھ تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دے کر مدرسہ فتح پوری دہلی میں چلے گئے پھر وہاں سے مدرسہ جامع العلوم کانپور میں منتقل ہو گئے۔ ہیئت، ہندسہ، حساب، فقہ اور فرائض میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ فن فرائض میں بزبان اردو آپ کا ایک مفصل رسالہ ہے۔ ۷ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ کو کانپور میں فوت ہوئے۔ (۲)

(۵) مولانا احمد حسن امرہوی

امرہوہ کے مشہور خاندان سادات سے تعلق تھا۔ ۱۲۶۷ھ میں ولادت ہوئی۔ عربی کی ابتدائی تعلیم امرہوہ ہی میں حاصل کی اور طب بھی امرہوہ ہی میں حکیم امجد علی خاں سے پڑھی پھر دارالعلوم میں داخلہ لیا اور مولانا یعقوب صاحب وغیرہ اساتذہ دارالعلوم کے علاوہ خصوصی طور پر حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی سے بھی استفادہ کیا۔ درس و تقریر

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۷۴ و تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۴۔

(۲) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۲۸۴ و مختصر تاریخ دارالعلوم ص ۱۰۸ و تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۴۔

میں حضرت نانوتوی کے علوم و معارف نہایت دلنشین انداز میں بیان کرتے تھے۔ فراغت کے بعد اولاً خورجہ کے مدرسہ میں درس دیا پھر سنبھل اور دہلی کے مختلف مدارس میں صدر مدرس رہے اور جب ۱۲۹۶ھ میں مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد قائم ہوا تو اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۳۰۳ھ میں مدرسہ شاہی سے الگ ہو کر اپنے وطن امرہوہ کے ایک قدیم مدرسہ جامع مسجد امرہوہ کی نشاۃ ثانیہ کی اور اس سے اس درجہ تعلق خاطر ہوا کہ مرنے کے بعد بھی اس سے جدا نہیں ہوئے (۱)

مولانا امرہوی کی درسی تقریر نہایت جامع، سلیس اور پُر مغز ہوتی تھی۔ قاسمی علوم کے امین اور مجسم تصویر تھے۔ سینکڑوں تشنگان علوم نبوی آپ کے چشمہ علم سے سیراب ہوئے۔ مولانا امرہوی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم الادیان کے ساتھ علم الابدان کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ یوں تو مولانا تمام علوم مروجہ میں کامل مہارت رکھتے تھے لیکن حدیث، تفسیر اور فقہ کی جانب رجحان طبع زیادہ تھا۔ ۱۳۲۹ھ میں مؤتمر الانصار (تنظیم فضلاء قدیم دارالعلوم) کا جو پہلا جلسہ مراد آباد میں ہوا وہ مولانا امرہوی ہی کی صدارت میں ہوا تھا۔ ۲۸ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کی درمیانی شب میں بمرض طاعون انتقال فرمایا اور اپنے لگائے ہوئے چمنستان علم مدرسہ جامع امرہوہ کے صحن کے جنوبی گوشے میں آسودہ خواب ہیں۔ حضرت مولانا امرہوی کے قلمی آثار میں صرف مضامین کا مجموعہ افادات احمدی کے نام سے شائع ہو سکا ہے بقیہ تصانیف زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں۔

(۶) مولانا احمد ہزاروی

حضرت مولانا احمد بن مولانا عبداللہ بن شاہ ولی کالچر تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے تاریخ پیدائش کا علم باوجود تلاش و جستجو کے نہ ہو سکا۔ درس نظامی کی اکثر کتابیں اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں۔ اعلیٰ تعلیم کیلئے دیوبند حاضر ہوئے اور یہاں داخلہ لے کر ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی و دیگر اساتذہ دارالعلوم سے دورہ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ مسجد چھتہ میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۱، تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۸۹۔

صاحب نانوتوی صاحب سے بھی قدرے استفادہ کیا۔ ۱۷ شوال ۱۲۹۸ھ کو حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن عثمانی دیوبندی کے ساتھ آپ کی دستار بندی ہوئی۔

اساتذہ دارالعلوم کے علاوہ مولانا احمد صاحب نے حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے بھی کسب فیض کیا۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد تدریسی مشغلہ شروع کیا اولاً دارالعلوم دیوبند میں تقریباً چھ سال درس دیا، اس کے بعد وطن مالوف کی جانب مراجعت کی اور سکندر پور ضلع ہزارہ میں احمد المدارس کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی اور تادم العمر اپنے لگائے اسی چنستان علم کی آبیاری کرتے رہے ہزارہ کے اکثر قدیم علماء آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔

۱۷ صفر المظفر ۱۳۳۱ھ یوم کیشنبہ کو آپ کا وصال ہوا۔ اولاد میں ایک فرزند مولانا عبدالسلام صاحب اور تین صاحبزادیاں چھوڑیں (۱)

(۷) مولانا محمد مراد فاروقی مظفرنگری

حضرت مولانا محمد مراد فاروقی ۱۲۶۲ھ/۱۸۲۵ء میں پاک پٹن کے ایک قریبی گاؤں امب میں پیدا ہوئے سلسلہ نسب اٹھارہویں پشت میں حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر سے مل جاتا ہے۔ عمر کے ابھی صرف چار سال گذرے تھے کہ والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے، ماموں نے یتیم بھانجے کو ان کی والدہ کے ساتھ اپنے گھر لے جا کر اپنی نگرانی اور کفالت میں رکھا۔ سن شعور کو پہنچے تو ایک دن تعلیم کی جانب سے بے توجہی پر ماموں کی سرزنش سے دلگیر ہو کر چپکے سے لاہور چلے آئے اور وہیں اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر یہاں سے دہلی پہنچے اور حافظ غلام رسول ویراں سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں علی گڈھ جا کر حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ پھر رام پور جا کر مولانا ارشاد حسین مجددی سے بھی بعض کتابوں کی تحصیل کی۔ آخر میں دارالعلوم آئے اور یہاں پانچ سال رہ کر علوم مروجہ کی تکمیل کر کے ۱۲۸۸ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

(۱) مشاہیر علماء دیوبند ص ۳۲ و ۳۳ و ۳۴ و ۳۵ و ۳۶ ج ۸۔

مولانا محمد مراد صاحب اپنی خداداد ذہانت و صلاحیت کی بنا پر اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی سے بیعت و خلافت سے بھی مشرف تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں جب جامع مسجد حوض والی مظفرنگر میں مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے صدر مدرس منتخب ہوئے۔ اور اپنی پوری زندگی مدرسہ کی ترقی اور سر بلندی کے لئے وقف کردی اور تقریباً ۴۰ سال تک مسلسل اسی مدرسہ میں درس و تدریس اور طلبہ کی تعلیم و تربیت میں گزار کر ۳ رجب ۱۳۳۲ھ کو عین جمعہ کی اذان کے وقت راہی ملک بقاء ہوئے۔ (۱)

(۸) مولانا سید محمد عرفان ٹونکی

مولانا سید محمد عرفان بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم حسنی بریلوی ثم ٹونکی امام الجہادین سید احمد شہید بریلوی کے نواسے تھے۔ ۱۲۶۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی ابتدائی کتابیں اپنے دیار کے علماء مولانا عبدالغفور شیخ عبدالملک، شیخ عبدالملک، اور قاضی امام الدین وغیرہ سے پڑھیں۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے حلقہ درس میں شامل ہو کر اکتساب فیض کیا حدیث کی تحصیل مولانا مفتی عبدالقیوم بن عبدالحی بڑھانوی سے کی۔ مولانا عامل بالحدیث تھے۔ لایعنی باتوں سے کلیتہً احتراز کرتے تھے۔ تلاوت قرآن حکیم سے خاص شغف تھا، ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ میں وفات پائی (۲)

(۹) مولانا منصور علی خان مرادآبادی

حضرت مولانا منصور علی بن مولانا حسن علی بن مولوی عبداللہ بن امان اللہ خاں مرادآبادی ہندوستان کے مشہور علماء میں سے تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے زمانہ صدارت ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند کے علاوہ ایک عرصہ تک حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی کے ساتھ سفر و حضر میں رہ کر

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۸۶۔

(۲) مشاہیر دیوبند ص ۵۴۰، ج ۲۔

اکتساب فیض کرتے رہے۔ مولانا کا شمار حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ میں ہوتا ہے۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد جامعہ طیبہ حیدرآباد میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور ایک مدت تک نہایت حسن و خوبی سے اس خدمت کو انجام دیا۔ آخر میں مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور وہیں ۱۳۳۷ھ میں وفات پائی۔ قلمی آثار میں مذہب منصور ۲ جلدیں، فتح المؤمنین اور معیار الادویہ آپ کی یادگار ہیں۔ (۱)

(۱۰) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن بن مولانا ذوالفقار علی دیوبندی قدس سرہما کی ولادت ۱۲۶۸ھ/۱۸۱۵ء میں بریلی میں ہوئی۔ یہاں آپ کے والد ماجد سرکاری محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ چھ برس کی عمر سے تعلیم و تحصیل کی ابتداء ہوئی۔ میاں جی منگلوری، اور میاں جی عبداللطیف سے قرآن پاک اور فارسی کی کتابیں پڑھ کر اپنے چچا اور دیوبند کے مشہور معلم مولانا مہتاب علیؒ کے حلقہٴ درس میں شامل ہو گئے۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو دارالعلوم میں داخل ہو گئے اور تین سال دارالعلوم میں رہ کر ملا محمود اور مولانا یعقوب نانوتوی سے فقہ، اصول فقہ، ادب، بلاغت، منطق، فلسفہ وغیرہ پڑھ کر ۱۲۸۶ھ میں صحاح ستہ اور بعض دیگر کتابیں حضرت جتہ الاسلام مولانا نانوتویؒ سے شروع کیں اور سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہ کر دو سال میں تعلیم کو مکمل کیا۔

زمانہٴ تعلیم ہی سے حضرت شیخ الہند کا شمار حضرت نانوتوی کے ممتاز تلامذہ میں ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ان کی اعلیٰ علمی و فکری صلاحیتوں کے پیش نظر ۱۲۹۱ھ میں مدرس چہارم کی حیثیت سے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہو گیا اور بتدریج ترقی کر کے ۱۳۰۸ھ میں شیخ الحدیث و صدارت تدریس کے منصب پر فائز ہوئے اور مسلسل ۱۳۳۳ھ تک حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تدریس و ترویج کی مبارک خدمت انجام دی اس مدت میں ۸۶۰ طلبہ نے آپ سے حدیث کی تحصیل کر کے سند و اجازت حاصل کی۔

حضرت شیخ الہند کو تدریس سے انتہائی شغف تھا۔ صحت و سہولت سے بے نیاز ہو کر نہایت جانفشانی اور تندہی کے ساتھ درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے اور حلقہٴ درس کیا ہوتا تھا سلف صالحین و اکابر محدثین کا نمونہ ہوتا تھا۔

چونکہ ہوش سنبھالتے ہی آپ اس تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے جس کی ضرورت کا احساس ۱۸۵۷ء کی جنگ شامی کے بعد اکابر دیوبند کے قلوب میں منجانب اللہ پیدا ہو چکا تھا اور جس کا مظہر اتم دارالعلوم دیوبند کی صورت میں منصہ شہود پر جلوہ آرا ہوا تھا۔ اس لئے انھیں تعلیم و تدریس کی مصروفیات کے ساتھ تحریک احياء ملت کی قیادت کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے جس کے لئے کبھی آپ نے ثمرۃ الترابیت قائم کی اور کبھی اپنے شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ جمعیت الانصار کی داغ بیل ڈالی۔ اور کبھی تحریک ریشمی رومال کے ذریعہ سامراجی طاقتوں کی صف میں بالچل مچادی۔ یہ سرگرمیاں اس قدر دقت طلب بنیں کہ حضرت شیخ الہند اطمینان و یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ نہ ہو سکے پھر بھی سیکڑوں تلامذہ اور یادگار زمانہ ملی و سیاسی خدمات کے علاوہ تقریباً ایک درجن تالیفات بھی اپنی یادگار چھوڑیں جو یہ ہیں۔

(۱) ادلہ کاملہ (۲) ایضاح الادلہ (۳) احسن القرئی (۴) الحجہ المقل (۵) افادات محمودیہ (۶) الابواب والترجم (۷) کلیات شیخ الہند (۸) حاشیہ مختصر المعانی (۹) تصحیح ابی داؤد شریف (۱۰) ترجمہ قرآن پاک و حواشی (۱۱) تقریر ترمذی (۱۲) فتاویٰ (۱)

(۱۱) مولانا ناظر حسن دیوبندی

مولانا ناظر حسن ابن امیر بخش بن ظہور عالم دیوبندی اپنے عہد کے مشہور علماء میں سے تھے۔ آپ کی ولادت اور نشوونما دیوبند میں ہوئی دارالعلوم کے اساتذہ مولانا محمد یعقوب وغیرہ سے پڑھ کر ۱۲۹۶ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے بھی کسب فیض کیا۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ

(۱) حضرت شیخ الہند کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے حیات شیخ الہند، شیخ الہند حیات و کارنامے، اسیران مالٹا،

میں ایک مدت تک تدریسی خدمات انجام دیں اس کے بعد ۱۳۳۸ھ میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں آپ کا تقرر ہوا اور چند سال وہاں پڑھانے کے بعد مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے پرنسپل مقرر ہوئے ڈھاکہ ہی میں ۱۳۴۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ تصانیف میں الفرقان فی قرآۃ ام القرآن اور کشف النطاء عن مسئلۃ الربو، آپ کی علمی یادگار ہیں (۱)

(۱۲) مولانا عبدالحق پور قاضی

پور قاضی مظفرنگر کے شمال میں شرفاء کی ایک قدیم بستی ہے وہیں تقریباً ۱۲۵۸ھ میں مولانا کی ولادت ہوئی ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور تین سال یہاں زیر تعلیم رہ کر ۱۲۸۶ھ میں فراغت حاصل کی ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم کے سب سے پہلے جلسہ دستار بندی میں حضرت شیخ الہند وغیرہ ممتاز فضلاء کے ساتھ آپ کی دستار بندی ہوئی۔ فراغتِ تعلیم کے بعد ریاست رتلام میں کاؤٹینٹ جنرل مقرر ہوئے اور تادم واپس اسی عہدے پر فائز رہے۔ مولانا والی ریاست کی نظر میں ہمیشہ معتمد اور قابل ستائش رہے، علماء سلف کا نمونہ تھے۔ آپ کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور سے ہوئی تھی۔ صاحبزادی صاحبہ کو مولانا نے جو قیمتی نصیحتیں لکھ کر دی تھیں انھیں بعد میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے بہترین ”جہیز“ کے نام سے اپنی مشہور تالیف ”بہشتی زیور“ میں شائع فرمادیا۔ ۸ صفر ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء کو رتلام میں وفات پائی (۲)

(۱۳) مولانا عبداللہ انبٹھوی

مولانا عبداللہ صاحب انبٹھہ ضلع سہارنپور کے باشندہ تھے تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو سکی ۱۲۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ اور اپنے وقت کے جلیل القدر عالم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ وغیرہ سے پڑھ کر ۱۲۸۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد ایک مدت تک سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی قدس

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۹۱۔

(۲) تاریخ دارالعلوم ص ۱۸۵، ج ۲۔

سرہ کی خدمت میں رہ کر روحانی فیوض و برکات حاصل کئے اور خلافت پائی۔
قصبہ گلاوٹھی ضلع بلندشہر میں جب منشی مہربان علی مرحوم نے مدرسہ منج العلوم قائم کیا تو اس کے صدر مدرس منتخب ہوئے پھر ۱۳۱۱ھ میں سرسید مرحوم نے انھیں ایم، اے، او کالج (مسلم یونیورسٹی) میں کام کرنے کی دعوت دی جہاں وہ آخر عمر تک ناظم دینیات کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا کا صحیح سن وفات معلوم نہیں۔ البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ ۱۳۴۴ھ سے پہلے آپ کی وفات ہو چکی تھی۔ حضرت مولانا عبدالحمیٰ حسنیؒ نے نزہۃ الخواطر میں جو سن وفات تحریر فرمایا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اپنے آبائی قبرستان انبٹھہ میں آسودہ خواب ہیں حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کی بڑی صاحبزادی اکرام النساء انھیں سے منسوب تھیں (۱)

(۱۴) مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی

مولانا حکیم محمد حسن بن ذوالفقار علی دیوبندی حضرت شیخ الہند کے برادر خورد تھے شروع سے آخر تک جملہ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کر کے حضرت مولانا یعقوب صاحب کے زمانہ صدارت ۱۲۹۶ھ میں فراغت پائی۔ دینیات کی تحصیل کے بعد دہلی جا کر حکیم عبدالحمید خاں صاحب سے طب و حکمت کی تعلیم حاصل کی۔ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت کا بھی شرف حاصل تھا۔ ۱۳۰۲ھ میں بحیثیت مدرس عربی و طبیب آپ کا دارالعلوم میں تقرر ہوا۔ اور طب کی تعلیم کے ساتھ تفسیر و حدیث وغیرہ کی اعلیٰ کتابیں بھی پڑھاتے تھے۔ دارالعلوم میں ۴۳ سال تک علمی و طبی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو سفر آخرت فرمایا۔

(۱۵) حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری

حضرت الحاج الحافظ المحمّد مولانا خلیل احمد قدس سرہ کا آبائی وطن انبٹھہ تھا جو ضلع سہارنپور کا ایک تاریخی قصبہ ہے اور سہارنپور کے جنوب میں گنگوہی جانے والی سڑک پر واقع ہے ۱۲۶۹ھ/۱۵۵۲ء میں آپ کی ولادت ہوئی پانچ سال کی عمر میں اپنے نانا حضرت

(۱) تاریخ دارالعلوم ص ۱۸۵، ج ۲۔

استاذ الکل مولانا مملوک علی سے بسم اللہ کی۔ قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم وطن انیٹھ اور نانہمال نانوتہ میں پائی۔ صرف نحو کی ابتدائی کتابیں اپنے چچا مولانا انصار علی سے گوالیار میں پڑھیں پھر یہاں سے واپس آکر مولانا سخاوت علی انیٹھوی سے کافیہ تک نصاب مروجہ کی تحصیل کی بعد ازاں ۱۲۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ حضرت مولانا کو دارالعلوم دیوبند سے جو سند دی گئی ہے اس میں ہے۔

”مولانا خلیل احمد ساکن انیٹھ نبیہ جناب مولانا مملوک علی صاحب مرحوم ۱۲۸۵ھ میں اس مدرسہ میں داخل ہوئے اس وقت کافیہ پڑھتے تھے قریب ایک سال کے عرصہ میں کتب مفصلہ ذیل تحصیل کیں، کافیہ، شرح ملا جامی، ایسا نحو جی، قال اقول، میزان منطق، مرقات، شرح تہذیب بعد اس کے بضرورت قرب وطن مدرسہ سہارنپور میں کتب درسیہ، حدیث، فقہ، تفسیر و اصول و عقائد معانی و منطق تکمیل کو پہنچائیں آخر ۱۲۸۹ھ میں پھر اسی مدرسہ میں آکر رسالہ میرزا ہدیش باغ، مقامات حریری، دیوان مثنوی، حماسہ، و تاریخ یمنی میں کچھ پڑھا، استعداد درست اور ذہن و ذکا خوب اور مناسب ہے۔

اخلاق و اوضاع پسندیدہ اور مزاج سنجیدہ ہے الخ (۲۳ جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ)

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد درس و افاضہ کی بزم سجاوی اور منگلور، بھوپال، سکندر آباد، بھاول پور، بریلی، دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اپنے شیخ و مرشد قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایماء پر مظاہر علوم سہارنپور تشریف لائے اور صدارت تدریس کے منصب پر فائز رہتے ہوئے پورے ۳۱ سال تدریس و تصنیف کے ذریعہ علوم دینیہ بالخصوص حدیث پاک کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اس ۳۱ سالہ مدت میں ۳۹۱ طلبہ نے آپ سے حدیث کا درس لے کر سند و اجازت حاصل کی جن میں مولانا عبدالرحمن صاحب سابق صدر مدرس مظاہر علوم، مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مولانا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی وغیرہ

خاص شہرت و اہمیت کے حامل ہیں۔

محدث سہارنپوری کا حافظہ نہایت قوی تھا ہزاروں حدیثیں مع سند کے آپ کو زبانی یاد تھیں درس میں کسی مسئلہ سے متعلق تمام علمی و مذہبی معلومات اپنے حافظہ سے فراہم کر دیا کرتے تھے۔

علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطن میں بھی آپ کو کامل دستگاہ حاصل تھی سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی اور حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی دونوں اکابر سے خلافت و اجازت سے مشرف تھے۔ اور طالبین کی تزکیہ و تلقین میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ ان خدمات کے ساتھ تصنیف، تالیف کا بھی نہایت سہرا ذوق رکھتے تھے۔ اور وقت کے اہم مسائل پر متعدد رسائل اور کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جن کی فہرست یہ ہے۔

(۱) ہدایات الرشیدی افہام العنید (۲) مطرقتہ الکرامہ علی مرآة الامامہ (دو حصے)
(۳) تنشیط الاذان فی تحقیق محل الاذان (۴) المہند علی المفہم (۵) براہین قاطعہ علی ظلام الانوار الساطعہ (۶) اتمام النعم (۷) بذل الجہود فی شرح سنن ابی داؤد، محدث سہارنپوری کی یہ شہرہ آفاق تصنیف ہے جس کی ابتداء ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اور تکمیل حدیث کے منبع و مرکز مدینہ الرسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہوئی۔ پوری کتاب پانچ جلدوں میں ہے جن کے صفحات ۱۹۳۸ ہیں۔ اس ضخیم کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ آخر عمر میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور تقریباً دو سال جو ار رسول میں رہ کر ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو دار دنیا سے دار آخرت کو رحلت فرمایا اور دیرینہ خواہش کے مطابق جنت البقیع میں دفن کئے گئے (۱)

(۱۶) مولانا عبدالقدیر دیوبندی

مولانا عبدالقدیر صاحب کی ولادت اور نشوونما دیوبند میں ہوئی۔ دیوبند کے مشہور

(۱) علماء دیوبند اور علم حدیث و تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۸۶ وغیرہ تفصیلی حالات کے لئے تذکرۃ الخلیل

ملاحظہ ہو۔

بزرگ حضرت شاہ رمزالدین متوفی ۱۱۲۲ھ کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۲۸۷ھ میں بغرض تعلیم دارالعلوم میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت مولانا سید احمد دہلوی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی وغیرہ اساتذہ دارالعلوم سے تعلیم حاصل کر کے ۱۲۹۳ھ میں فارغ ہوئے۔ پھر علم حدیث میں اختصار پیدا کرنے کی غرض سے مظاہر علوم پینچے اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ سہارنپور میں آپ کے رفقاء درس میں حضرت مولانا منصور علی مراد آبادی اور حضرت مولانا محمد علی موگیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالقدیر صاحب کی پوری زندگی دین اور علوم دین کی خدمات میں گزری۔ ۱۳۰۷ھ سے ۱۳۰۹ھ تک آپ دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم بھی رہے۔ آخر میں منشی نولکشور لکھنؤ کے مطبع سے متعلق ہو گئے تھے جہاں کتابوں کے ایڈیٹ کرنے کے ساتھ عربی و فارسی کی اہم کتابوں کے ترجمہ کا کام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ علم الحیوانات میں علامہ کمال الدین دمیری کی مشہور تالیف حیات الحیوان کا دو جلدوں میں ترجمہ اسی زمانہ کی آپ کی علمی یادگار ہے۔ لکھنؤ ہی کے قیام میں پیمانہ عمر لبریز ہو گیا اور ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء میں راہی ملک بقا ہوئے^(۱)

(۱۷) مولانا عبدالؤمن دیوبندی

قصہ دیوبند کے مشہور علمی خاندان شیوخ عثمانی کے رکن رکیں اور حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے برادر نسبتی تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۹ سال زیر تعلیم رہ کر ۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی سے دورہ حدیث پڑھا اور سند و اجازت حاصل کی، چوتھے جلسہ دستار بندی ۱۳۰۱ھ کے موقع پر حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کے ساتھ حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہی کے دست مبارک سے آپ کو دستار فضیلت حاصل ہوئی۔

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد اہل میرٹھ کی طلب پر آپ میرٹھ تشریف لے گئے

(۱) تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۸۸ اوینادور کاشی نولکشور نمبر۔

پھر یہ سرزمین اتنی پسند آئی کہ پوری زندگی وہیں گزار دی۔ کچھ دنوں مدرسہ قومیہ میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دے کر دارالعلوم صدر میرٹھ کی مسند صدارت کو زینت بخشی۔

مولانا عبدالؤمن صاحب مرحوم بڑے ذکی، ذہین اور وسیع النظر عالم تھے، تفسیر وحدیث اور فقہ کی اکثر کتابیں آپ کو از بر تھیں۔ اپنے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کے طرز پر درس کی تقریر مختصر مگر جامع اور دلنشین فرماتے تھے۔ بایں ہمہ جلالت علمی زندگی نہایت متوکلانہ گزارتے تھے، سلوک و تصوف میں بھی مولانا کو درجہ کمال حاصل تھا۔

میرٹھ میں آپ سے علمی فیض خوب جاری ہوا، حضرت مولانا عاشق الہی میرٹھی مشہور عالم و مصنف نے از اول تا آخر مولانا عبدالؤمن ہی سے اکتساب کیا تھا۔ حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی اور مولانا سراج احمد میرٹھی بھی آپ ہی کے شاگرد تھے۔ مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی ناظم اعلیٰ عالمی مؤتمراہنشاء قدیم دارالعلوم دیوبند کو بھی مولانا مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ۱۳۳۷ھ میں دہلی میں جہاں بغرض علاج مقیم تھے وفات پائی اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔

(۱۸) مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی بن حضرت مولانا فضل الرحمن دیوبندی ۱۲۷۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے ۹ سال کی عمر میں دارالعلوم کے شعبہ تحفیظ القرآن میں داخل ہو کر حفظ کا آغاز کیا جس سے ۱۲۸۷ھ کو فراغت ہوئی اس کے بعد اردو، فارسی وغیرہ کی تحصیل کر کے عربی تعلیم شروع کی اور از ابتداء تا انتہا دارالعلوم میں پڑھ کر ۱۲۹۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس، حضرت مولانا سید احمد دہلوی، حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا عبدالعلی رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۲۹۸ھ کے جلسہ دستار بندی میں حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی نے دستار فضیلت سے مشرف کیا۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد مدرسہ دارالعلوم میں معین مدرس مقرر ہو گئے اور

اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی نگرانی میں فتویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے دارالعلوم میں چند ماہ قیام کے بعد حضرات اساتذہ کی تجویز پر مدرسہ اسلامیہ اندر کوٹ ضلع میرٹھ تشریف لے گئے اور کئی سال تک وہاں تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۳۰۹ھ میں دوبارہ دارالعلوم آئے اور نیابت اہتمام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ایک سال تک کارہائے نیابت انجام دینے کے بعد آپ کو شعبہ تدریس میں لے لیا گیا اور اسی کے ساتھ افتاء کی ذمہ داری بھی آپ ہی سے متعلق تھی۔ اس وقت سے مسلسل ۱۳۴۷ھ تک دارالعلوم میں رہ کر درس و افتاء کی خدمات انجام دیتے رہے۔

حضرت مفتی صاحب کو فتویٰ نویسی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ بڑے بڑے معرکتہ الآراء، سوالوں کا جواب قلم برداشتہ لکھ دیا کرتے تھے۔ سفر میں بھی دارالافتاء کی ڈاک ساتھ رکھتے تھے اور بلا مراجعت کتب محض اپنی حذاقت و مہارت پر بے تکلف فتاویٰ تحریر فرماتے رہتے تھے۔ آپ کے فتاویٰ کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہوتی تھی کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھ لیتے تھے۔ اس خصوصیت میں حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی اور مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی کے علاوہ کوئی شریک نہیں ہے۔

حضرت مفتی صاحب ایک عالم اور فقیہ ہی نہ تھے بلکہ عارف باللہ اور صاحب باطن بزرگ بھی تھے حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند کے خلیفہ خاص تھے۔ اور خود بھی بیعت و ارشاد کا شغل رکھتے تھے۔ ہزار ہا طالب خدا آپ کی تلقین و تربیت سے منزل مقصود تک پہنچے۔

۱۳۴۶ھ کی مشہور اصلاحی تحریک کے موقع پر حضرت محدث عصر مولانا انور شاہ کشمیری کے ہمراہ آپ بھی بہت سے دیگر اساتذہ دارالعلوم کی طرح اس وقت کے نظام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے تھے۔ ۱۳۴۷ھ میں جب حضرت محدث کشمیری علالت کی بناء پر ڈابھیل سے دیوبند چلے آئے تو ارباب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے اصرار پر حضرت مفتی صاحب و سطر بیچ الثانی میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور بخاری شریف کے باقی ماندہ حصہ کی تکمیل کرائی۔ وہاں سے واپسی پر راستے میں

طبیعت علیل ہو گئی۔ دیوبند پہنچنے پر علاج شروع ہوا مگر افاقہ نہ ہوا اور ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء کی شب میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا اصغر حسین محدث دیوبندی نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبرستان قاسمی میں سپرد خاک ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب کو مستقل تصانیف کا موقع کم ملا۔ جلالین شریف کا ترجمہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ایک رسالہ میزان البلاغۃ کے حاشیہ کے علاوہ آپ کے لکھے ہوئے وہ فتاویٰ جو فتاویٰ دارالعلوم کے نام سے اب تک ۱۷ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں آپ کے قلمی آثار ہیں۔

(۱۹) مولانا حافظ محمد احمد فاسمی دیوبندی

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کے فرزند تھے ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ حفظ قرآن کے بعد والد ماجد نے گلاٹھی مدرسہ منبع العلوم میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ یہاں کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوئے اور حضرت نانوتوی کے تلمیذ رشید حضرت مولانا احمد حسن امر وہی سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں اس کے بعد دیوبند تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب و حضرت شیخ الہند وغیرہ سے کتب حدیث کی تحصیل کی بعد ازاں گنگوہا حاضر ہو کر حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی سے دورہ حدیث کی تحصیل و تکمیل کے بعد سند و اجازت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں بحیثیت مدرس کے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوا ۱۳۱۳ھ میں اہتمام کی ذمہ داری آپ کو تفویض ہوئی۔ جو آخر عمر تک قائم رہی۔ حضرت حافظ صاحب کے دور اہتمام میں دارالعلوم نے خوب ترقی کی اور بقول مصنف تاریخ دارالعلوم ”ہر چند دارالعلوم معنوی حیثیت سے دارالعلوم بن چکا تھا مگر اپنی عمارتوں اور ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے آپ ہی کے زمانہ اہتمام میں مدرسہ سے دارالعلوم بنا“ کا اہتمام کے ساتھ تدریس کا مشغلہ بھی آخر تک قائم رکھا بالعموم مشکوٰۃ شریف، جلالین، ابن ماجہ وغیرہ زیر درس رہتی تھیں۔ دینی و نسبی شرافت و وجاہت کے

ساتھ حافظ صاحب کو دنیاوی شان و شوکت بھی حاصل تھی۔ اور برطانوی گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو شمس العلماء کا خطاب حاصل تھا۔ علاوہ ازیں ریاست حیدرآباد کے تقریباً تین برس تک مفتی اعظم بھی رہے جس کے صلہ میں حافظ صاحب کے ساتھ پورے خاندان کو ریاست کی جانب سے وظیفہ ملتا تھا۔

۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء میں نظام حیدرآباد دہلی آرہے تھے حافظ صاحب اس موقع پر انھیں دارالعلوم لانا چاہتے تھے چنانچہ اسی غرض سے حیدرآباد کا سفر کیا۔ سفر سے پہلے ہی سے طبیعت کچھ نامسا زھی حیدرآباد پہنچنے پر مرض شدت اختیار کر گیا اور نظام سے ملاقات کئے بغیر حالت کی نزاکت کے پیش نظر دیوبند واپسی کے ارادے سے وہاں سے چل پڑے مگر ابھی ٹرین حیدرآباد کے حدود ہی میں تھی کہ نظام آباد اسٹیشن پر حافظ صاحب دیوبند کے بجائے سفر آخرت کو سدھا ر گئے۔ ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء کو یہ حادثہ پیش آیا۔ اسٹیشن پر میت اتار لی گئی متعلقین اور نظام دکن کو بذریعہ تار حادثہ کی اطلاع دی گئی۔ اور نظام ہی کے حکم پر جنازہ دیوبند کے بجائے حیدرآباد لے جایا گیا۔ اور وہیں ایک مخصوص قبرستان ”حطہ صالحین“ میں سرکاری مصارف پر تجہیز و تکفین علم میں آئی۔ حافظ صاحب نے کل ۳۵ سال اہتمام کے فرائض انجام دیئے۔

(۲۰) مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی

حضرت مولانا محمد صدیق بن مولانا محمد امین الدین صدیقی مرادآباد کے ایک علمی خانوادہ کے گل سرسبد تھے ۱۲۶۳ھ کے حدود میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار اور مولانا میر بشارت علی سنبھلی و مولانا محبوب علی سنبھلی سے حاصل کی اور فن طب کی تحصیل اپنے نانا حکیم محمد عطا حسین سے کی جو اپنے عہد کے نامور اطباء میں سے تھے۔

فارسی دینیات کی تکمیل کے بعد اپنے برادر خورد مولانا شمس الدین کے ہمراہ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی کی خدمت میں میرٹھ پہنچے اور چندے استفادہ کے بعد واپس مرادآباد آگئے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا سید احمد دہلوی وغیرہ سے حلقہ درس میں شامل ہو کر

مروجہ کتابیں پڑھیں۔

تحصیل و تکمیل کے بعد ۱۴ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ کو میرٹھ میں حضرت حجۃ الاسلام قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور ذکر و شغل کے ساتھ علمی استفادہ بھی کرتے رہے۔ تکمیل سلوک کے بعد حضرت نانوتوی نے انھیں خلافت سے مشرف فرمایا۔ حضرت نانوتوی کے علاوہ حضرت قطب ارشاد مولانا لنگوہی اور حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجرکی سے بھی آپ کو خلافت و اجازت حاصل تھی۔ مولانا محمد صدیق صاحب علوم ظاہری و باطنی میں کمال کے ساتھ اردو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر بھی تھے قاسمی اور صدیق تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

بے چوں قاسم دیوانہ رافرزانہ می سازد بہ بیں صدیق! فیض قاسم فرزانہ مارا

فیوض قاسم اخیر ات را صدیق می نازم رود دیوانہ گردر بزم اوفرزانہ می آید، روحانی علاج کے ساتھ جسمانی علاج میں بھی مولانا کو ید طولی حاصل تھا۔ نبض شناسی اور تشخیص امراض میں آپ کو حیرت انگیز کمال حاصل تھا۔

۳ شوال ۱۳۴۷ھ کو شب جمعہ میں بمر ۸۴ سال آپ کا وصال ہوا نماز جنازہ تلمیذ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نواب محی الدین خاں فاروقی نے پڑھائی (۱)

(۲۱) مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری

مولانا حکیم رحیم اللہ بن مولانا علیم اللہ بجنور کے ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کے والد مولانا علیم اللہ صاحب حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی کے رفقاء درس میں سے تھے۔

حکیم صاحب نے منطق، فلسفہ، کلام اور ریاضی کی کتابیں مولانا عبدالعلی رام پوری سے پڑھیں پھر دارالعلوم میں داخل ہو کر بقیہ کتب درس کی تکمیل کی اور ۱۲۹۵ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے دورہ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ فن

(۱) الفرقان لکھنؤ شمارہ مارچ ۱۹۷۷ء۔

طب کی کتابیں حکیم ابراہیم لکھنوی سے پڑھیں اور طویل مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر عملی تجربات کئے۔ حضرت جتہ الاسلام مولانا نانوتوی سے بھی ان کی آخری عمر میں استفادہ کیا۔

حکیم صاحب کو عقائد و کلام اور مناظرے میں خاص دسترس حاصل تھی اور ان علوم میں ایک درجن سے زائد کتابیں اپنی تصنیفی یادگار چھوڑیں جن میں بعض یہ ہیں۔
(۱) الکانی للاعتقاد الصافی (۲) تہدید المنکرین بقدرۃ رب العالمین (۳) اظہار الحقیقہ (۴) ابطال اصول الشیعہ بدلائل العقلیہ والنقلیہ (۵) احسن الکلام فی اصول عقائد الاسلام (۶) اثبات القدرۃ الالہیہ باقامۃ الحجۃ الالہامیہ۔

حکیم صاحب خدمتِ خلق کے طور پر گھر پر مطب کرتے تھے اور ادو وظائف کے پابند اور بڑے با وضع بزرگ تھے۔ سفر حج کے موقع پر حضرت سیدۃ الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجرکتی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے۔ آخر عمر میں ہجوم امراض کی بناء پر نہایت کمزور ہو گئے تھے۔ ۱۴ اگست ۱۹۲۹ء مطابق ۱۳۴۷ھ کو ظہر کی نماز شدتِ نقاہت سے بیٹھ کر ادا کی اور جیسے ہی سلام پھیرا روحِ نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

مولانا مرغوب الرحمن صاحب بجنوری موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند جو بجنور کے ہر دل عزیز قومی رہنما اور بااثر شخصیت ہیں حکیم صاحب کے نواسے ہیں۔

(۲۲) مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا حبیب الرحمن بن مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی ایک تبحر عالم اور عربی کے بہترین ادیب تھے، آپ کا تدبیر، سیاست، فراست، انتظام اور دوراندیشی حلقہٴ دیوبند میں آج بھی ضرب المثل ہے از ابتداء تا انتہاء آپ نے دارالعلوم ہی میں پڑھا اور ۱۳۰۰ھ میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی ۱۳۲۵ھ میں حضرت حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کے کثرت مشاغل و اسفار کے پیش نظر مجلس شوریٰ دارالعلوم نے دارالعلوم کے انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے ایک منتظم اور لائق شخص کی ضرورت محسوس کی چنانچہ اس اہم خدمت کے لئے مجلس کی نگاہ انتخاب آپ ہی پر پڑی اور باوجود انکار کے آپ کو نیابت

اہتمام کا منصب سپرد کر دیا۔

مولانا عثمانی علیہ الرحمہ اگرچہ نجیف الجثہ اور پیدائشی طور پر کمزور تھے لیکن قدرت نے ضعف و کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت عطا کی تھی امور اہتمام میں شب و روز انہماک کے ساتھ مطالعہ کتب کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ کتب بینی کے شوق نے آپ کی معلومات میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کر دی تھی عربی ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا آپ کی علمی یادگار میں عربی قضائد اور متعدد اہم علمی و تحقیقی تصنیفات ہیں جن میں درج ذیل مصنفات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) حاشیہ مقامات حریری (۲) قصیدہ لامیۃ المعجزات (۳) اشاعت اسلام (۴) تعلیمات اسلام (۵) حاشیہ تفسیر جلالین۔

دارالعلوم کے معاملات میں آپ مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کے ہمیشہ دست راست بلکہ مختار مطلق رہے اور حضرت حافظ صاحب کے زمانہ کے دارالعلوم کی ترقیات و تحقیقات مولانا عثمانی کی رفاقت ہی کا نتیجہ ہیں حافظ صاحب مرحوم کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قرار پائے مگر افسوس کہ عمر نے وفائیں کی اور اس منصب پر فائز ہونے کے ٹھیک چودہ ماہ بعد ۴ رجب ۱۳۴۸ھ کی شب میں اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔

نوٹ: تدریسی مصروفیت کی وجہ سے مضمون مکمل نہیں ہو سکا۔



حضرت شیخ الاسلام کے تین امتیازات

(۱) حضرت شیخ الہند سے کثرت استفادہ

(۲) مسجد نبوی میں تدریس

(۳) الجزائر کے جہاد آزادی میں رہنمائی

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی بظاہر ایک شخصیت کا نام ہے، لیکن باطن وہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے ”ان ابراہیم کان امة“ کی تفسیر تھے، کیونکہ وہ بیک وقت علوم و معارف کے امام، مجلس ارشاد کے صدر نشین، عزیمت و استقامت کے جبل عظیم، فقر و تواضع کے بحر عظیم، بصائر و حکم کے سرچشمہ، زہد و قناعت کے مجسمہ، اخلاص و ایثار کے پیکر، سخاوت و شجاعت کے مخزن، میدان صبر و رضا کے شہسوار، قافلہ جہد و عمل کے تاجدار اور سلف صالحین کی مکمل و متحرک یادگار تھے ”کثر اللہ امثالہ“

آپ نے سیاست کے بحر مواج میں اپنے سفینہ کی تختہ بندی کی، مگر اس بصیرت کے ساتھ کہ اس کی پھینٹیں آپ کے دامن حیات کو نمناک نہ کر سکیں آپ نے مذہب و سیاست کے جام و سندان کو باہم آمیز کر دیا، مگر اس کمال فراست کے ساتھ کہ دونوں کی نزاکتوں سے ایک لمحہ کیلئے بھی صرف نظر نہیں کیا۔

خدمات اور کارناموں پر ایک اجمالی نظر

۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ کو آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۱۵ دسمبر ۱۹۵۷ء) کو ساڑھے اکیسویں سال کی عمر میں اس جہان فانی کو چھوڑ کر رہ گئے عالم جاودانی ہو گئے، اس اکیسویں سالہ حیات کے ۲۰ سال تعلیم و تحصیل میں بسر ہوئے اور

تقریباً ۸ رسال سے کچھ کم و بیش قید فرنگ کی نذر ہو گئے، زندگی کے باقی ۵۳ سال میں سے اگر کم از کم ۱۰ برس خواب و خور اور دیگر حوائج بشریہ کی تکمیل کے لئے نکال دیئے جائیں تو کارکردگی کی مدت صرف ۴۳ سال رہ جاتی ہے، ان ۴۳ سال کے محدود ایام کو پیش نظر رکھ کر حضرت شیخ الاسلام کی تعلیمی تربیتی، تصنیفی اور سیاسی خدمات اور کارناموں کا جائزہ لیجئے کہ مدینۃ الرسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، مدرسہ عالیہ کلکتہ، اور آسام کے علاوہ صرف دارالعلوم دیوبند میں چار ہزار سے زائد وہ تلامذہ ہیں جنہوں نے آپ کے شمع علم سے اکتساب نور کیا۔ لاکھوں سے زیادہ وہ طالبین حق ہیں جنہوں نے تربیت گاہ مدنی سے تصحیح عقائد، تحسین اخلاق و تزکیہ باطن کا درس لیا جن میں ڈیڑھ سو سے اوپر وہ خوش بخت اور جوان ہمت بھی ہیں جو احسان و سلوک کی منزلیں طے کر کے سندا اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے، اصلاح معاشرہ اور تبلیغ دین کیلئے اس وسیع و عریض ملک کے چپے چپے کا دورہ، اسلامی عنوانات پر ہزاروں سے زائد خطبات و تقریریں، استخلاص وطن، حریت قومی اور ملت کی سر بلندی اور اپنے عصر کی سب سے بڑی استعماری طاقت سے محاذ آرائی، علوم اسلامی کی اشاعت کی غرض سے ہزاروں مکاتیب دینیہ و مدارس اسلامیہ کی سرپرستی و نگرانی، پھر ان ہمہ جہت و مختلف النوع مشاغل کے ساتھ مختلف دینی، علمی، سیاسی اور تاریخی موضوعات پر کتب و رسائل کی تالیف و تصنیف، نیز ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ان مکاتیب کی تحریر جن میں تفسیر آیات، تشریح احادیث، تفصیل عقائد، توضیح مسائل فقہیہ، رموز احسان اور تاریخ و سیاست سے متعلق بیش بہا نادر معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس کے متعلق پورے اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ مکتوبات و ملفوظات کی طویل فہرست میں مخدوم شرف الدین احمد منیری متوفی ۸۲ھ اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ اور شیخ حسام الدین مانک پوری کے مجموعہ مکاتیب کے بعد شیخ الاسلام کے مکتوبات اپنی افادیت، اپنی اثر آفرینی، کثیر معلومات اور جامعیت میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ مکتوبات قلم برداشتہ اور بالعموم اسفار یا قید و بند کی حالت میں لکھے گئے ہیں جس سے حضرت شیخ الاسلام کے علمی استحضار و عبقریت کا کسی

قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے پھر تکمیل ذات کیلئے آہ نیم شبی کا مشغلہ اور رب کریم و آقائے بے نیاز سے عرض و نیاز جو زندگی کا ایک جز بن گیا تھا، بسا اوقات پورا دن ٹرین، تانگہ اور بیل گاڑیوں کے تکلیف دہ سفر میں گذر جاتا، اور رات کا بیشتر حصہ جلسہ اور وعظ میں، لیکن کیا مجال کہ رات کے اس محبوب معمول میں ذرا بھی فرق آجائے، الحاصل آپ کی زندگی فی اللیل رہبان و فی النہار فرسان کا مکمل نمونہ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسی جامع کمالات اور گونا گوں صفات کی حامل شخصیت پر قلم اٹھانے والا محامد و محاسن کے ہجوم میں متحیر ہو کر رہ جاتا ہے، وہ اگر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور دارالعلوم دیوبند میں آپ کے درس و تدریس، اصحاب عمل اور مردان کار کی تعلیم و تربیت کو موضوع تخیل بنانا چاہتا ہے تو اسی لمحہ میدان جہاد میں آپ کے میر العقول کارنامے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں، وہ اگر آپ کے صدارت، جمعیت کے عہد پر لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسی آن عرفان و احسان کی وہ کیف آگئیں بزم جس کے آپ صدر نشین تھے اس کے رہوار تخیل کی زمام اپنی سمت موڑ لیتی ہے، وہ اگر آپ کے تبلیغی مواعظ اور اصلاحی مکاتیب کے سلسلے میں اپنے تاثر بیان کرنا چاہتا ہے تو آپ کے خطبات صدارت اور کراچی کی عدالت میں سنگینوں کے زیر سایہ اعلان حق، تاریخ عزیمت کا ایک نیا باب اس کی نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں وہ اگر آپ کے محاسن اخلاق اور بلندی کردار کو اپنی بحث و تحقیق کا عنوان بنانا چاہتا ہے تو آپ کے بحر علم سے اسرار و حکم و علوم و معارف کی اٹھتی ہوئی موجیں اس کے اشہب فکر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں اور بالآخر فضائل و کمالات کی ان مسلسل اور بے پناہ جلوہ طرازیوں سے مہبوت ہو کر وہ پکاراٹھتا ہے۔

دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار

گلچیں تو ز تنگی داماں گلہ دارد

یقین جانے یہ شاعری یا عقیدت کی کرشمہ کاری نہیں ہے بلکہ ان مشکلات و کیفیات کا صحیح اظہار ہے جن سے ان سطور کو سپرد قلم کرتے ہوئے گذرنا پڑا ہے، ظاہر ہے اس پریشان خیالی میں کسی مرتب و مفصل تحریر کی ہوس بے سود تھی اس لئے یوسف کے خریداروں

میں نام لکھوانے کی غرض سے یہ بضاعہ مزاجاً بعنوان ”تین امتیازات“ لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔ گر قبول افتدز ہے عز و شرف۔

امتیاز (۱) شیخ الہند سے طویل استفادہ

حضرت شیخ الاسلام ماہ صفر ۱۳۰۹ھ میں بغرض تحصیل علم دیوبند پہنچے اور آخر شعبان ۱۳۱۶ھ تک یہاں آپ کا قیام رہا، ساڑھے چھ سال کی اس مدت میں سترہ فنون پر مشتمل سرسٹھ درسی کتابیں اساتذہ دارالعلوم سے پڑھیں جن میں ۲۴ کتابیں خود حضرت شیخ الہند نے پڑھائیں، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا، اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

(۱) حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے دستور المبتدی، زراذی، زنجانی، مراح الارواح، قال اقول، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصورات، قطبی تصدیقات، میر قطبی، مفید الطالبین، نخبہ الیسین، مطول، ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد شریف، تفسیر بیضاوی شریف، نخبہ الفکر، شرح عقائد نسفی حاشیہ خیالی، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ۔

(۲) مولانا ذوالفقار علی (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہا) = فصول اکبری۔

(۳) مولانا عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس دوم دارالعلوم =

مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، سبغہ معلقہ، حمد اللہ، صدرہ، شمس بازغہ، توضیح تلوتح۔

(۴) مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = تلخیص المفتاح۔

(۵) مولانا حکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = پنج گنج، صرف

میر، مختصر المعانی، سلم العلوم، ملاحسن، جلالین شریف، ہدایہ اولین۔

(۶) مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = شرح جامی

بحث نفل، کافیہ، ہدایۃ النجو، منیۃ المصلی، کنز الدقائق، شرح وقایہ، مائتہ عامل، اصول الشاشی (۷) مولانا غلام رسول صاحب مرحوم بغوی، مدرس دارالعلوم دیوبند = نور الانوار، حسامی، قاضی مبارک، شمائل ترمذی۔

(۸) مولانا منفع علی صاحب مرحوم = میرزا ہد رسالہ، میرزا ہد ملاجلال، میبذی، خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی۔

(۹) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم = شرح جامی بحث اسم۔

(۱۰) مولانا حبیب الرحمن صاحب = مقامات حریری، دیوان متنبتی۔

(۱۱) بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا سید محمد صدیق صاحب) منشعب،

ایسا نجوبی^(۱)

(۱) تعلیم و تحصیل کا یہ ساڑھے چھ سالہ دور حضرت شیخ الہند کے زیر سایہ اور ملازمت میں بسر ہوا، کیونکہ اس پوری مدت میں آپ کا قیام حضرت کے مکان کے متصل ایک کوٹھی میں رہا، اس قربت مکانی کے علاوہ آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب حضرت شیخ الہند کے خدام میں سے تھے، اس تقریب سے ابتدا ہی سے آپ کو حضرت شیخ الہند کا تقرب حاصل ہو گیا۔

(۲) فراغت تعلیم اور مدینہ منورہ میں اقامت پذیر ہو جانے کی بعد ۱۳۲۷ھ میں جب عارضی طور پر ہندوستان تشریف لائے تو تقریباً ایک سال مزید حضرت شیخ الہند کی خدمت میں رہ کر ترمذی و بخاری کو دوبارہ بحث و تحقیق سے پڑھا۔ لکھتے ہیں ۱۳۲۶ھ کے آخر میں (مدینہ منورہ) سے روانہ ہو کر ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہنچا اور ترمذی، بخاری میں شریک ہو گیا اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پڑھا مسائل پر پوری بحث کرتا تھا، حضرت رحمۃ اللہ بھی اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلاف عادت تحقیقی جواب نہایت وضاحت سے دیتے تھے^(۱)

(۳) علاوہ ازیں اسارت مالٹا کا پورا زمانہ حضرت شیخ الہند کی معیت و صحبت میں

گزرا، اور اس کج تنہائی میں حضرت شیخ کے آفتاب فیض سے باطمینان خاطر علم و فکر کی روشنی اخذ کرتے رہے، اس طرح مجموعی طور پر دس گیارہ سال تک آپ کو حضرت شیخ الہند کی صحبت و ملازمت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایسا امتیاز ہے جس میں ان کے رفقاء و معاصرین میں کوئی بھی ان کا شریک و سہم نہیں، علم و فکر کی پختگی میں شیخ سے طول ملازمت کا جو مقام ہے، اہل نظر سے مخفی نہیں، سچ پوچھے تو اسی اتصال و یک نفسی نے حضرت شیخ الاسلام کی ذات کو ایک ایسا آئینہ بنا دیا تھا جس میں شیخ الہند کے سراپا کو نجوبی دیکھا جاسکتا تھا۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

امتیاز (۲) مسجد نبوی..... میں حلقہ درس

شعبان ۱۳۱۶ھ میں آپ کو تعلیم و تحصیل سے فراغت حاصل ہوئی اور اسی سال ماہ شعبان میں آپ کے والد ماجد نے مدینہ طیبہ زاد ہا شرفاً و تعظیماً کی جانب ہجرت کے ارادہ سے رخت سفر باندھا، والد محترم کے حکم سے حضرت شیخ الاسلام نے بھی انھیں کی معیت میں ہندوستان کے بجائے ارض رسول..... کو اپنا مسکن و ماویٰ بنا لیا، جیسا کہ خود رقم طراز ہیں:

”محرم ۱۳۱۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرف حضور حاصل

ہوا، حرم نبوی کے باب النساء کے قریب زقاق المبدور کے کنارے پر ایک

مکان کرایہ پر لے کر قیام کیا گیا۔“ (۱)

مدینہ منورہ میں پہنچ کر رہائش وغیرہ کے معاملات سے مطمئن ہو جانے کے بعد آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کی زبانی سماعت کیجئے۔ فرماتے ہیں:

”درس و تدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اوائل شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں

بھائی (حضرت شیخ الاسلام، مولانا صدیق صاحب و مولانا سید احمد صاحب)

دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے، تو من جملہ رخصت کرنے والوں کے حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک تشریف لائے تھے، راستہ میں پر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ ”پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے دو ایک طالب علم ہی ہوں“ اس لئے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہو گیا تھا مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض طلبہ ہندوستان اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے (اور حسب ہدایت حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز اس کام کو شروع کر دیا۔) (۱)

چونکہ حضرت شیخ الاسلام کی عمر بھی کم تھی اور یہاں کے نو وارد بھی تھے اور بقول سعدیؒ
تا مرد سخن گلفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آپ کے علمی مقام و مرتبہ اور صلاحیتوں پر اجنبیت اور عدم واقفیت کا پردہ پڑا ہوا تھا اس لئے ابتدا میں تقریباً ایک سال تک طلبہ کا رجوع آپ کی طرف کم رہا، لیکن دو سال گذرتے گذرتے آپ کا نہال علم ایک تناور درخت ہو گیا جس کے سائے میں حجاز، ترکستان، بخاری، ہندوستان، کابل، الجزائر، قازان، مصر وغیرہ دور و نزدیک سے مسافران علم کے قافلے در قافلے اترنے لگے اور آپ کے تبحر علمی کے غلغلے سے مدینۃ الرسول..... کے گلی کوچے پر شور ہو گئے، آپ کے درس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ قدیم اساتذہ مسجد نبوی کے حلقہ ہائے درس سونے پڑ گئے اور ان کی ساری رونق سمٹ کر حضرت شیخ الاسلام کے قدموں میں نچھاور ہونے لگی۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی ایک نو وارد اور وہ بھی ایک نوعمر کا اس قدر جلد شہرت و مقبولیت کے بام عروج پر پہنچ جانا عام حالات میں بڑے بڑے وسیع ظرف اور سیر چشموں کیلئے بھی رشک و رقابت اور حسد کا سبب ہو جاتا ہے کچھ اسی طرح کا معاملہ حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ بھی پیش آیا کہ آپ کا علمی عروج دیکھ کر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قدیم اساتذہ کی رگ حسد بھڑک

اٹھی، جس کی بنا پر آپ کو چندے مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جس آقائے کریم نے سر پر مقبولیت کا تاج رکھ کر آپ کو سرفراز فرمایا تھا اسی نے ان مشکلات کا مداوی بھی کر دیا، اور آپ کی نیک نامی دن دوئی رات چوگنی بڑھتی ہی رہی خود حضرت شیخ الاسلام نے مدینہ منورہ میں اپنے مشاغل علمیہ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

”۱۳۱۸ھ شوال تک... میں ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علم کو پڑھاتا رہا ۱۳۱۸ھ ذی قعدہ میں قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق گنگوہہ کا سفر کیا۔ اور ۱۳۲۰ھ محرم میں مدینہ منورہ واپس ہوا، یہاں پہنچنے کے بعد مدرسہ شمسہ باغ معروف بہ توطیہ کے مدرسہ میں بچہ مدرسہ ۳۵ روپے ماہوار ملازم ہو گیا چونکہ طلبہ کا ہجوم ہوا اس لئے خارج از مدرسہ اوقات میں حرم محترم میں کتابیں شروع کرادیں، سمجھدار اور جدوجہد کرنے والے طلبہ کا اجتماع میرے پاس بہت زیادہ ہو گیا جس سے مدرسین حرم محترم کو حسد اور رقابت پیدا ہو گئی، طلبہ صرف اہل مدینہ نہ تھے بلکہ ترک، بخاری، قازانی، قزق، ترکستان، کابل، مصری وغیرہ بھی تھے (اس حسد کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ).... ناظر مدرسہ شمسہ باغ کو اصرار ہوا کہ خارج از اوقات مدرسہ میں کہیں نہ پڑھایا جائے اس قسم کی چند باتیں اور پیش آئیں جن کی وجہ سے بہ مجبوری مدرسہ کی ملازمت سے استعفا دینا پڑا اور یہ ارادہ کر لیا گیا کہ لوجه اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو اس کے کفیل جناب باری عز اسمہ کی کفالت پر رکھا جائے، چنانچہ کتب درسیہ کا میدان وسیع کر دیا گیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی... (کہ) طلبہ علوم کا اصرار بہت زیادہ ہے مجبور ہو کر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں صرف کر رکھا ہے، جواب میں حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا ”پڑھاؤ خوب پڑھاؤ، اس سے ہمت زیادہ بڑھ گئی، روزانہ چودہ اسباق پڑھاتا تھا،

پانچ صبح کو تین یا چار ظہر کے بعد دو عصر کے بعد، دو مغرب کے بعد ایک
عشاء کے بعد۔ (۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

”۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر میرا مشغلہ علمی مدینہ منورہ میں
جاری رہا... چونکہ مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے، تو ان
تعطیل کے ایام میں بھی خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے... علوم میں
جدو جہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر ہوا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے
درس میں اس کی مثال نہیں تھی۔ (۲)

۱۳۲۷ھ میں آپ پھر ہندوستان وارد ہوئے اور ۱۳۲۹ھ تک ہندوستان ہی میں
قیام پذیر رہے اسی سفر میں آپ نے حضرت شیخ الہند سے ترمذی و بخاری دوبارہ پڑھی جس
کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ نیز اس عارضی قیام کے زمانہ میں آپ کو اکابر دارالعلوم نے
باقاعدہ طور پر دارالعلوم کا استاذ بھی منتخب کر لیا تھا اور اس تصریح کے ساتھ کہ یہ انتخاب دوامی
ہے، درمیان میں وقفہ کے بعد جدید تقرر کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ یہی تجویز تقرر کافی سمجھی
جائے گی، یہ حضرات اکابر رحمہم اللہ کی جانب سے آپ کی علمی لیاقت پر اعتماد اور وثوق کی
ایسی گرانقدر سند ہے جو فضلاء دارالعلوم میں سب سے پہلے آپ ہی کو مرحمت ہوئی اور
غالباً آپ ہی پر اس کا آخر بھی ہو گیا۔ ذلک فضل اللہ یعطیہ من یشاء۔

حضرت شیخ الاسلام نے بھی اس یادگار تجویز کا تذکرہ فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

۱۳۲۷ھ شوال میں اکابر نے مجھ کو تدریس کا حکم دیا جلسہ اہل شوریٰ نے
حضرات مہتممین رحمہم اللہ تعالیٰ کی خواہش پر تجویز پاس کر دیا کہ حسین احمد کو
بالفعل بمشاہدہ ۳۲ روپے ماہوار مدرس کر دیا جائے اور اس کے بعد جب
بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس

(۱) نقش حیات ج ۱ ص ۶۳ تا ۵۷ باختصار۔

(۲) ایضاً ج ۱ ص ۹۶ تا ۹۹ باختصار۔

شوریٰ مدرس کیا جائے۔ (۱)

۱۳۲۹ھ میں آپ مدینہ منورہ واپس حاضر ہو گئے۔ ۱۳۳۱ھ میں چند مہینوں کے لئے
پھر ہندوستان آنا ہوا اس کے بعد مسلسل محرم ۱۳۳۵ھ تک آپ کا قیام مدینہ ہی میں رہا اور
مشاغل درس و تدریس برابر جاری رہے تا آنکہ صفر ۱۳۳۵ھ میں حکومت برطانیہ کی سازش
اور ایماء پر حضرت شیخ الہند (جو اس وقت حجاز مقدس ہی میں تھے) اور دیگر رفقاء کے ساتھ
آپ کو گرفتار کر کے مالٹا جیل میں پہنچا دیا گیا، اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے
اپنی سترہ سالہ اقامت مدینہ کے دوران باستثناء وقفہ قیام ہند کم و بیش ۱۲-۱۳ سال مسجد
نبوی میں خود صاحب وحی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے زیر نظر کتاب و سنت اور دیگر فنون
اسلامیہ کا کامیاب درس دیا، مجدد و شرف کا یہ تاج جو حضرت شیخ الاسلام کے سر پر رکھا گیا
بارگاہ صمدیت کا ایسا پیش بہا اور عظیم عطیہ ہے جو بندگان خاص ہی کو عطا کیا جاتا ہے، بغیر
کسی خوف و تردید کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایسا طرہ امتیاز ہے
جس میں وہ اپنے تمام ہم عصر علماء میں بالکل منفرد و ممتاز ہیں،

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا“

اس خصوصی تربیت گاہ مدنی کے افق سے علم و فکر اور جہد و عمل کے کیسے کیسے ماہ و اختر
طلوع ہوئے افسوس کہ آپ کے سوانح نگاروں نے اپنی سہل انگاری اور سہولت پسندی کی
بنا پر اس کی جانب کوئی توجہ ہی نہ کی، اس طرح حیات مدنی کا یہ زریں و روشن باب ہماری
نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اب اس پر ماہ و سال کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ
انھیں ہٹا کر حقیقت حال کو واضح کرنا غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، لیکن اس مشکل کی وجہ
سے اس اہم ترین موضوع سے آنکھ بند کر کے گذر جانا کسی طرح مناسب نہیں، اس لئے
اس کی طرف مختصر طور پر ہی سہی کچھ اشارات ضروری ہیں، ممکن ہے آگے آنے والے مورخ
کو انھیں اشاروں کی روشنی میں بحث و نظر کیلئے کوئی واضح شاہراہ مل جائے اور وہ اپنی تحقیق
کے دائرے کو وسیع کر سکے۔ وما توفیق الا باللہ علیہ تو کلت والیہ انیب۔

(۱) ایضاً ج ۱ ص ۱۳۲

”طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اسکی مثال نہیں تھی۔“ حضرت شیخ الاسلام کا یہ اشارہ بتا رہا ہے کہ شیعہ مدنی کے گرد اکٹھا ہونے والے پروانوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں رہی ہوگی، پھر خود حضرت ہی یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ ”یہ طلبہ علم صرف مدینہ منورہ ہی کے نہیں تھے بلکہ اس ہجوم میں ہندوستان، ترک، بخارا، قازان، قزق، ترکستان، کابل، مصر وغیرہ کے طالبان علم بھی تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ درس و دائرہ تربیت نہایت وسیع تھا۔ مجلہ المنہل مدینہ منورہ کے بیان سے بعض تلامذہ کے ناموں کی تعیین بھی ہو جاتی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ضروری اقتباس اس موقع پر پیش کر دیا جائے، مجلہ المنہل نے حضرت شیخ الاسلام کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مضمون شائع کیا تھا یہ اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے:

فتلقى عليه العلم الناس كثيرون وانتفع الطلاب من تعليمه وكان من تلاميذه مدرسون وقضاة وحكام مديرون وروساء يذكرون منهم المرحومين المشائخ عبدالحفيظ الكردي الكوراني عضو المحكمة الكبرى بالمدينة واحمد البساطي نائب القاضى بها سابقا ومفتى الاحناف بها ومحمود عبدالجواد رئيس بلدية المدينة المنورة وكذلك الشيخ محمد البشير الابراهيمي العالم الجزائري المجاهد فى سبيل التطويح ببغاة الاستعمار من الجزائر العربية العريقة (۱)

بہت سے لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا اور کثیر طلبہ آپ کی تعلیم و تدریس سے منفعہ ہوئے آپ کے تلامذہ میں مدرسین، قاضی و حکام، سرکاری محکموں کے سکریٹری اور رؤسا تھے ان میں حسب ذیل مرحومین مشائخ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) الشیخ عبدالحفیظ الکردی الکورانی رکن محکمہ کبریٰ، مدینہ منورہ (۲) الشیخ احمد البساطی نائب قاضی و مفتی احناف مدینہ منورہ (۳) الشیخ محمود عبدالجواد صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ (۴) محمد البشیر الابرہیمی الجزائری، جنہوں نے الجزائر سے استعماری باغیوں کو دور

کرنے میں زبردست جہاد کیا۔

مجلہ الوعی الاسلامی کویت سے مزید ایک اور الجزائری مجاہد کے نام کی تعیین ہوتی ہے الامام عبدالحمید بن بادیس اصح الجزائری المعاصر کے عنوان سے الوعی الاسلامی نے ڈاکٹر محمود بن محمد قاسم کا ایک مقالہ شائع کیا ہے اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف شیخ عبدالحمید بن بادیس کے سفر جاز کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ثم سافر الی مکة لاداء فريضة الحج فى سنة ۱۹۱۳م وفى الحجاز لقي عددا من علماء مصر والشام وتلمذ على الشيخ حسين احمد الهندى الذى نصحه بالمعودة الى الجزائر، اذ لاخير فى علم ليس بعده عمل.

پھر شیخ عبدالحمید بن بادیس نے فریضہ حج کی ادائیگی کی غرض سے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور حجاز میں متعدد علماء مصر و شام سے ملاقات کی اور شیخ حسین احمد ہندی سے (شرف) تلمذ حاصل کیا جنہوں نے شیخ عبدالحمید کو الجزائر واپس جانے کی نصیحت کی کیونکہ اس علم میں کوئی خوبی نہیں جس کے بعد عمل نہ ہو۔

ان مراجع سے درج ذیل تلامذہ کی نشاندہی ہوتی ہے جنہوں نے آپ سے قیام مدینہ منورہ کے زمانہ میں اخذ فیض کیا۔ شیخ عبدالحفیظ کردی کورانی (رکن محکمہ کبریٰ مدینہ منورہ)، شیخ احمد بساطی نائب قاضی و مفتی احناف مدینہ منورہ، شیخ محمود عبدالجواد (صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ) شیخ محمد البشیر الابرہیمی الجزائری، شیخ عبدالحمید بن بادیس الجزائری، آخر الذکر دونوں الجزائری تلامذہ کے سلسلے میں ہم قدرے تفصیلی گفتگو کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے موضوع کے آخری جز سے انہیں ہر دو حضرات کی خدمات و کارنامے متعلق ہیں اور آج تک اس پر کچھ لکھا بھی نہیں گیا ہے۔

امتیاز (۳) الجزائری کے جہاد حریت میں حضرت شیخ الاسلام کا حصہ

تفصیلات میں جانے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ الجزائری میں شیخ ابن بادیس اور محمد بشیر ابراہیمی کو کیا مقام حاصل ہے تو مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ ہندوستان

میں حکومت اور عوام کے نزدیک جو حیثیت گاندھی جی اور جواہر لال کی ہے علی الترتیب یہی درجہ و مرتبہ شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ محمد بشیر الابرہیمی کا الجزائر میں ہے۔

ایک الجزائر مصنف لکھتے ہیں ۱۹۴۰ء میں جس تاریخ کو شیخ ابن بادیس کی وفات ہوئی اس وقت میری عمر صرف دس سال کی تھی اور میں ایک مکتب (مدرسہ حیات الشباب) میں زیر تعلیم تھا، ہم درجے میں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ہمارے درجہ کے استاذ نے آکر کہا ”اب سبق نہیں ہوگا شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہو گیا ہے“ ہم بچوں کو شیخ کے مقام و مرتبہ کی کیا خبر ہمیں تو اس غیر متوقع چھٹی مل جانے پر بڑی مسرت ہوئی، راستے میں کھیلتے کودتے گھر آئے میرے والد شیخ کی علالت کی اطلاع پر قسطنطنیہ ان کی عیادت کو گئے ہوئے تھے اور میری یہ عادت تھی کہ جب معلوم ہوتا کہ والد صاحب گھر میں نہیں ہیں تو دروازے کی کنڈی خوب زور زور سے بجاتا، چنانچہ حسب عادت آج بھی میں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد گھر میں داخل ہوا میری والدہ شام کا کھانا پکا رہی تھی، میں نے بے وقت آنے کی وجہ بتاتے ہوئے ان سے کہا کہ مدرسہ میں تعطیل ہو گئی ہے کیونکہ شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہو گیا ہے میرے منہ سے یہ جملہ نکلتا تھا کہ میری والدہ بے قابو ہو کر چیخ اٹھیں۔ ”أصحیح ما تقول“ کیا تم سچ کہہ رہے ہو، میں نے جب مؤکد طور پر یہی بات دہرائی اور انھیں اس کا یقین ہو گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، اس وقت مجھے کچھ احساس ہوا کہ یہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہے، دوسرے دن شیخ کی تجہیز و تکفین کے بعد میرے والد قسطنطنیہ سے واپس لوٹے، ان کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کبھی شہر جاتے تو میرے لئے کھلونے وغیرہ ضرور لاتے، میں اس بار بھی منتظر تھا کہ عادت کے مطابق میرے لئے ضرور کھلونے لائیں گے، لیکن اس مرتبہ جب وہ گھر واپس آئے تو ان کی عجیب و غریب کیفیت تھی، گم سم، گویائی کی طاقت بالکل ناپید، بولنے کی کوشش کرتے بھی تو صرف ہونٹوں میں حرکت ہو جاتی آواز بالکل نہیں نکلتی تھی، شدت غم سے تھیر کی یہ حالت ان پر کئی دن تک طاری رہی۔ (۱)

(۱) محمد الہیلی: ابن بادیس و عروبة الجزائر ص ۷۷، ۸۰۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس کو کیا مقام حاصل تھا اور الجزائر میں انھیں کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ابن بادیس کا مختصر تذکرہ

الشیخ عبدالحمید بن بادیس ۴ دسمبر ۱۸۸۹ء/ ۱۳۰۶ھ کو الجزائر کے مشہور شہر قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فراغت کے بعد قسطنطنیہ ہی میں شیخ حمدان لوتیسی سے علوم عربیہ کی تحصیل شروع کر دی اور پانچ سال تک انھیں کی خدمت میں رہ کر ابتدائی مرحلے کی تعلیم مکمل کی اور آگے کی تعلیم کے لئے ۱۹۰۸ء میں جامعہ زیتونیہ تونس میں داخل ہو گئے، چار سال وہاں رہ کر بقیہ تعلیم پوری کی اور ۱۹۱۲ء میں عالمیت کی سند لے کر گھر واپس آ گئے، پھر ۱۹۱۳ء/ ۱۳۳۲ھ میں حج و زیارت کے ارادے سے مکہ معظمہ کا سفر کیا، فریضہ حج ادا کر کے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور تقریباً تین ماہ یہاں قیام کیا، اسی قیام کے دوران حضرت شیخ الاسلام سے استفادہ کیا، بعد ازاں حضرت شیخ الاسلام ہی کے مشورہ پر وطن واپس آئے اور درس و تدریس اور وعظ و تذکیر میں مشغول ہو گئے، ۱۹۲۵ء میں المنقذ کے نام سے اصلاحی ہفت روزہ جاری کیا، حکومت کی پابندی عائد کر دینے کی وجہ سے اس کے صرف ۱۸ شمارے نکل سکے، اس کے بند ہونے کے بعد دوسرا جریدہ الشہاب کے نام سے جاری کیا جو ابتدا میں ہفت روزہ تھا بعد میں ماہانہ ہو گیا تھا جس میں علمی اصلاحی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے اور پورے الجزائر میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ۱۹۳۱ء جمعیت علماء الجزائر قائم کی اور تاحیات اس کی صدارت کے منصب پر فائز رہے، اسی کے پلیٹ فارم سے الجزائر کی آزادی کی جنگ کا آغاز کیا، ۵۱ سال کی مختصر عمر میں بمرض کینسر ۸ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۴۰ء کو وفات پائی۔ (۱)

حضرت شیخ الاسلام کا مشورہ اور تحریک کی ابتدا

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد شیخ ابن بادیس حجاز پہنچے اس سے پانچ سال قبل

(۱) ماخوذ ترکی راج: الشیخ عبدالحمید بن بادیس باعث النهضة الاسلامیہ۔

ان کے استاذ شیخ حمدان استعماری جبر و تشدد سے تنگ ہو کر الجزائر سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آباد ہو گئے تھے، چنانچہ ابن بادیس جب مدینہ منورہ پہنچے تو انھیں بھی یہی مشورہ دیا کہ الجزائر اب رہنے کی جگہ نہیں وہاں سے قطع تعلق کر کے جو ار رسول میں مقیم ہو جائیں، لیکن ان کے برعکس حضرت شیخ الاسلام انھیں الجزائر واپس جانے اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنے کی رائے دی، اس سلسلے میں تحریک الجزائر کے دوسرے لیڈر شیخ ابن بادیس کے رفیق کار تلمیذ شیخ الاسلام الشیخ محمد البشیر الابراہیمی کا درج ذیل بیان قابل ملاحظہ ہے۔

”مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ نے احقر سے بیان فرمایا کہ میں ۱۹۵۰ء میں عم محترم الشیخ السید محمود رحمہ اللہ کی خدمت میں مدرسۃ الشرعیۃ المدینۃ المنورہ میں بیٹھا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور چچا سے مصافحہ و معانقہ کے بعد دریافت کیا: ”این شیخی و کیف“ میرے شیخ کہاں اور کس حال میں ہیں، چچا نے بتایا کہ ہندوستان میں ہیں اور محمد اللہ خیر و عافیت سے ہیں، پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ان کے خلف اکبر ہیں، یہ سنتے ہی مجھ سے چمٹ گئے اور دیر تک مجھے گلے سے لگائے رکھا اس کے بعد اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں محمد البشیر الابراہیمی الجزائر ہوں اور آپ کے والد ماجد کا ایک ادنیٰ تلمیذ، ہمیں حضرت نے جہاد حریت کی ترغیب دے کر الجزائر واپس بھیجا تھا۔“ (۱)

قریب قریب یہی بات شیخ ابراہیمی نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے ایک ملاقات کے موقع پر بتائی تھی مولانا ندوی صاحب اپنے مکتوب بنام مولانا سید ارشد مدنی میں لکھتے ہیں:

”میں ۱۹۵۶ء میں جب دمشق محاضرات کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو الشیخ محمد بشیر الابراہیمی دمشق آئے تھے انھوں نے ذکر کیا تھا کہ الجزائر کی جنگ

(۱) روایت حضرت مولانا سید اسعد مدنی۔

و آزادی جہاد کے قائد شیخ عبدالحمید کا خیال ہجرت اور مستقل قیام کا ہو رہا تھا، حضرت نے ان کو واپس جانے کا مشورہ دیا، وہ واپس گئے اور انھوں نے تحریک کی قیادت کی۔ (۱)

ان معتبر بیانات کے علاوہ خود ابن بادیس کی یہ تحریر ملاحظہ کیجئے۔

اذکر انی لما زرت المدینة المنورة واتصلت فیہا بشیخی الاستاذ حمدان لونیسى المهاجر الجزائرى وشیخی حسین احمد الہندی اشار علی الاول بالهجرة الى المدینة المنورة وقطع کل علاقة لی بالوطن و اشار الثانی وکان عالمًا حکیمًا بالعودة الى الوطن وخدمة الاسلام فیہ و العربیة بقدر جهد فحقق اللہ رائی الشیخ الثانی ورجعنا الى الوطن بقصد خدمتہ (۲)

مجھے خوب یاد ہے میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا اور وہاں میری ملاقات اپنے قدیمی استاذ شیخ حمدان مہاجر جزائری اور دوسرے استاذ شیخ حسین احمد ہندی سے ہوئی تو پہلے استاذ (شیخ حمدان) نے مجھے مشورہ دیا کہ الجزائر کو خیر آباد کہہ کر مدینہ منورہ ہی کو اپنا مسکن و مستقر بنا لوں اور دوسرے استاذ (شیخ الاسلام) جو عالم محقق تھے کی رائے یہ ہوئی کہ میں الجزائر جاؤں اور وہاں اسلام و عربیت کی خدمت کروں، اللہ تعالیٰ نے شیخ ثانی کی رائے کو محقق فرمایا اور میں الجزائر کی خدمت کیلئے واپس آ گیا۔

لیکن ان مصادر سے یہ بات بالکل نہیں واضح ہوتی کہ حضرت شیخ الاسلام نے اس عظیم خدمت کو انجام دینے کیلئے ابن بادیس کو کیا ہدایات دیں اور کن افکار اور طریقہ عمل کے تحت انھیں کام کرنے کی ترغیب دی، ظاہر ہے کہ ایک ۲۴ سالہ نوجوان کو جس کی اب تک کی پوری زندگی گھریا تعلیم گاہ کے ماحول میں گذری ہو جو تنظیم و تحریک کے تجربات سے بالکل نا آشنا ہو، اسے یکا یک بغیر کسی تعلیم و تربیت کے ایسے اہم ترین صبر آزما اور دور رس

(۱) مکتوب حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مورخہ ۲۷/۹/۸۶ء۔

(۲) ابن بادیس: الشہاب ج ۸ ص ۳۵۵ عدد اکتوبر ۱۹۳۷ء بحوالہ ترکی رائح الشیخ عبدالحمید بن بادیس ص ۲۷۔

نتائج کی حامل خدمت پر مامور کر دیا جائے عقل اسے باور کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اس لئے لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت شیخ الاسلام نے ضروری اصول و ضوابط سمجھانے کے بعد ہی انھیں اس جو حکم کام پر لگایا ہوگا، لیکن وہ اصول و ضوابط کیا تھے کن افکار و نظریات کے تحت اس تحریک کا آغاز کرایا گیا تھا، نہ تو شیخ ابن بادیس کی تحریروں سے اس کا سراغ ملتا ہے اور نہ شیخ ابراہیمی کے بیانات ہی سے، اس وقت کے احوال و ظروف کا تقاضہ یہی تھا کہ اس جہاد سے حضرت شیخ الاسلام کے براہ راست تعلق کو واضح نہ کیا جائے، ورنہ شیخ کے لئے مشکلات و مصائب پیش آسکتی تھیں، اور جب حالات سازگار ہوئے تو بیان کرنے والے ہی دنیا سے جا چکے تھے اس لئے یہ راز پردہ راز ہی میں رہ گیا، لیکن علمی و منطقی اعتبار سے اگر یہ درست ہے کہ تلمیذ و شیخ کے فکر و عمل میں یکسانیت اور توافق اس بات کی دلیل ہے کہ تلمیذ نے ان افکار و اعمال کو اپنے شیخ سے اخذ و جذب کیا ہے تو بغیر کسی پس و پیش کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے قائد جہاد شیخ ابن بادیس کو مکمل طور پر اصول و ضوابط کے کیل کانٹے سے لیس کر کے میدان عمل میں اتارا تھا، کیونکہ دونوں کے نظریات اور طریقہ عمل میں اس قدر موافقت اور یکسانیت ہے کہ الجزائر کے جہاد حریت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ایک لمحہ کیلئے یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ الجزائر کی تاریخ آزادی کو پڑھ رہا ہے یا حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال اور جمعیت علماء ہند کی تاریخ اس کے پیش نظر ہے، اس موقع پر طوالت سے بچتے ہوئے چند نظائر پیش کئے جاتے ہیں۔

فکر و عمل میں یکسانیت

حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی تنہا ہندوستان کی آزادی نہیں ہے بلکہ یہ ایشیا کی آزادی کا پیش خیمہ ہے، اور ایشیا کی آزادی مشرق کے کتنے ہی پسماندہ اور کمزور قوموں کی آزادی کا ذریعہ ہے، اپنے احوال و ظروف کے مطابق اسی نظریہ کا اعلان شیخ ابن بادیس ان الفاظ میں کر رہے ہیں:

نعم ان لنا وراء هذا الوطن الخاص اوطانا اخرى عزيزة علينا هي دائما

على بأل ونحن فيما نعمل لوطننا الخاص نعتقد انه لا بد ان تكون قد خدمناها واصلنا اليها النفع والخير من طريق خدمتنا لوطننا الخاص واقرب هذه الاوطان الينا هو المغرب الاقصى والمغرب الادنى والمغرب الاوسط ثم الوطن العربي الاسلامي ثم الانسانية العام. (۱)

اس وطن خاص (الجزائر) کے علاوہ ہمارے اور بھی اوطان ہیں، جو ہمیں بہت محبوب ہیں جن کا خیال ہمہ وقت رہتا ہے اور ہم جو خدمات اپنے وطن کی انجام دے رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ اس راہ سے ہم ان اوطان کی بھی خدمت کر رہے ہیں اور انھیں بھی نفع و خیر پہنچا رہے ہیں، اور ان میں ہم سے سب سے قریب مغرب اقصیٰ، مغرب ادنیٰ اور مغرب اوسط ہیں، ان کے بعد یہ نفع وطن عربی اسلامی اور پھر وطن انسانیت کو پہنچے گا۔

(۲) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ مشرق کی ساری تباہی اور فساد کی جڑ مغربی اقتدار کا غلبہ ہے اگر مغرب کا یہ استعماری غلبہ ختم ہو جائے تو مشرق کے مزاج کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس نظریہ کی بازگشت شیخ ابن بادیس کے کلام میں سنی جاسکتی ہے۔

انا نفرق جيدا بين الروح الانسانية والروح الاستعمارية في كل امة فنحن بقدر ما نكره هذه و نقاومها نوالى تلك ونؤيدها لاننا نتيقن كل اليقين ان كل بلاء العالم هو من هذه وكل خير يرجى للبشرية انما يكون يوم تسود تلك فتسقط الروح الاستعمارية ولتندحر وترتفع الروح الانسانية والنشر. (۲)

ہم روح انسانیت اور روح استعماریت کے درمیان فرق کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم اسی فرق کے مطابق استعماریت کو ناپسند کرتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں اور روح انسانیت کو دوست رکھتے اور اس کی تائید کرتے

(۱) ابن بادیس الشہاب بحوالہ محمد الملی: ابن بادیس وعروبہ الجزائر ص ۵۶۔

(۲) ابن بادیس: الشہاب ۱۹۳۸ بحوالہ محمد الملی: ابن بادیس وعروبہ الجزائر ص ۵۳۔

ہیں، اس لئے کہ ہمیں یقین کامل ہے کہ عالم کی تمام تر مصیبت کا سبب یہی استعماریت ہے اور انسانیت کیلئے کسی خیر کی امید اسی وقت کی جاسکتی ہے جس وقت کہ انسانیت کی سیادت اور بالاتری حاصل ہو جائے، لہذا اس وقت روح استعماریت ساقط اور ختم ہو جائے گی اور روح انسانیت بلند اور چھا جائے گی۔

(۳) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک عنصر ہیں کیونکہ آج کل قومیت کا تشخص وطنیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور لفظ قوم اپنے معنی کے اعتبار سے اسی جماعت پر منطبق ہوتا ہے جس میں جامعیت کا کوئی سبب موجود ہو۔

شیخ ابن بادیس نے اس نظریہ کی تعبیر حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

المسلم هو المتدين بالاسلام والاسلام عقائد واعمال واخلاق بها السعادة فى الدارين والجزائرى انما ينسب للوطن افراده الذين ربطتهم ذكريات الماضى ومصالح الحاضر ومآل المستقبل فالذين يعمرن هذا القطر وتربطهم هذه الروابط هم الجزائريون. (۱)

مسلم وہ شخص ہے جو دین اسلام کا پابند ہے اور اسلام ایسے عقائد، اعمال اور اخلاق کو شامل ہے جس سے دارین کی سعادت متعلق ہے، اور جزائری تو صرف وطن کی جانب منسوب ہیں جس کے افراد کو ماضی کی تاریخ، حال کے مصالح اور مستقبل کی امیدوں نے باہم مربوط کر رکھا ہے، لہذا جو لوگ اس ملک میں آباد اور ان مذکورہ روابط میں مربوط ہیں وہ جزائری ہیں۔

(۴) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا حق و انصاف میں ذات و مذہب کی بنیاد پر امتیاز غلط ہے ملک کے تمام باشندے خواہ وہ کسی بھی ذات و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں حق و انصاف میں سب کے حقوق یکساں ہیں۔

(۱) ابن بادیس: الشہاب ج ۱۰ عدد نومبر۔

شیخ ابن بادیس اس نظریہ کا اعلان یوں کرتے ہیں:

فنهضتنا نهضة بنيت على الدين اركانها فكانت سلاما على البشرية... لا يخشاها والله النصرانى لنصرانيته ولا اليهودى ليهوديته بل ولا محوسى لمحوسيته ولكن يجب والله ان يخشاها الظالم بظلمه والدجال لدجله والخائن لخيائته. (۱)

ہمارے اس انقلاب کی اساس دینی ہے جو انسانیت کی سلامتی کا ذریعہ ہے، اس میں نصرانی اپنی نصرانیت اور یہودی اپنی یہودیت کی وجہ سے خائف نہیں ہوگا بلکہ مجوسی کو بھی اپنی مجوسیت کی بنا پر کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ البتہ ظالم اپنے ظلم دجال اپنے دجل و فریب اور خائن اپنی خیانت کی بنیاد پر خوف زدہ ہوگا۔

نظریات میں اس وحدت کے بعد ایک سرسری جائزہ طریقہ کار اور دستور العمل پر بھی ڈالتے چلے۔ حضرت شیخ الہند نے اپنی تحریک کی ابتدا درس و تدریس سے کی تھی۔ دورانِ درس جن تلامذہ میں صلاحیت پاتے تعلیم علوم کے ساتھ اس کی سیاسی تربیت بھی فرماتے تھے ایک عرصہ تک اس طرح کام کرنے کے بعد جب ملک کے اطراف و جوانب میں تلامذہ کی ایک جماعت منظم طور پر کام کو آگے بڑھانے کے لئے تیار ہو گئی تو جمعیت الانصار کی داغ بیل ڈالی اور پھر دہلی میں مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ نظارۃ المعارف کے عنوان سے درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، اس طرح سے ملک کے ذہین، بیدار مغز، متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرد اکٹھا کر لی اور پھر انہیں کے واسطے سے تحریک کا جال پورے ملک میں بچھا دیا، تحریک کی اسی ہمہ گیری کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری اور قید و بند کی وجہ سے کام کرنے والوں میں اضمحلال نہیں پیدا ہوا بلکہ انہوں نے خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء کے نام سے ایک محاذ کے بجائے دو دو محاذ کھول دیئے اور بالآخر اسی جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے آزادی کی بھرپور جنگ لڑی گئی۔ اس پس منظر

(۱) ابن بادیس: الشہاب ۱۹۳۶ء بحوالہ سابق۔

کو ذہن میں رکھتے ہوئے شیخ ابن بادیس کی تاریخ جہد و عمل کا مطالعہ کیجئے۔

وہ ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الاسلام کی ہدایت پر الجزائر واپس آئے اور ہر مشغلہ سے بالکل یکسو ہو کر درس و تدریس و وعظ و تذکیر میں لگ گئے اور ایک دو سال نہیں بلکہ پورے دس سال اس خالص علمی مشغلہ کو جاری رکھا وہ خود لکھتے ہیں:

قضینا عشر سنوات فی الدرس لتکوین نشأء العلمی لم تخلط بہ غیرہ من عمل آخر فلما کملت العشر وظهرت بحمد اللہ نتیجتھا الخ ہم نے پورے دس سال (الجزائر) کی نشاۃ علمی میں گزار دیئے جن میں ترویج علوم کے علاوہ ہم نے کوئی کام نہیں کیا اور الحمد للہ اس کے اچھے نتائج بھی ظاہر ہوئے۔

طریقہ یہ تھا کہ رات کو قرآن حکیم کا مجموعی درس ہوتا تھا، جس کے ضمن میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات کو بھی مدلل طور پر بیان کرتے رہتے تھے، اس درس کو اس درجہ مقبولیت ہوئی کہ شہر قسنطینہ کے علاوہ مضافات سے بھی بڑی جماعت اس میں شرکت کے لئے آتی تھی، اور دن کو خصوصی درس ہوتا تھا جس میں صرف طلبہ شریک ہوتے تھے، اس درس میں تفسیر قرآن، مؤطا امام مالک مقدمہ ابن خلدون اور بعض فقہ اور تاریخ کی کتابیں ہوتی تھیں، اس طرح سے دس سال کی مدت میں انھوں نے آگے کے کام کی زمین تیار کر لی اور اپنے تلامذہ اور مستفیدین کے ذریعے پورے ملک میں اپنے نظریات کو عام کر دیا اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں یکے بعد دیگرے علی الترتیب دو سالے المنتقد اور الشہاب جاری کئے (ممکن ہے الشہاب نام حضرت شیخ الاسلام کی فاضلانہ کتاب ”الشہاب الثاقب“ کے نام سے اخذ کیا ہو، یہ کتاب اس وقت شائع ہو چکی تھی) جس میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات پر کھل کر بحث کرتے تھے، اس کا اثر بھی ملک پر نہایت اچھا پڑا اور لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی بعد ازاں ۱۹۳۱ء میں جمعیت علماء الجزائر کی بنیاد رکھی جس کے خود ہی تاحیات صدر رہے، شیخ بادیس کے جانشین جمعیت علماء کے دوسرے شیخ محمد بشیر الابراہیمی جمعیت علماء کی اہمیت و ضرورت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لو تأخر ظهور جمعیۃ العلماء عشرين سنة لما وجدنا فی الجزائر من یسمع صوتنا“

اگر جمعیت علماء کی تاسیس میں دس بیس سال کی تاخیر اور ہو جاتی تو ہماری باتیں سننے کے لئے الجزائر میں ایک آدمی بھی نہ ملتا۔

پھر جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے کھل کر آزادی کی جنگ لڑی گئی۔ فکر و عمل کا یہ اتحاد بلاشبہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ الجزائر کی جنگ آزادی حضرت شیخ الاسلام کے متعین کردہ خطوط پر برپا کی گئی ورنہ اس طرح کا کلیتاً اتحاد ممکن نہیں تھا، اس لئے تاریخ کا طالب علم اگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کی تاریخ آزادی میں اگر حضرت شیخ الہند کا تذکرہ نہ کیا جائے تو وہ تاریخ ناقص اور ادھوری ہوگی ٹھیک اسی طرح اگر الجزائر کے جہاد حریت کی تاریخ میں شیخ الہند کے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنی کا ذکر نہ ہو تو وہ تاریخ بھی غیر مکمل و ناتمام ہوگی، تو اس کا دعویٰ یقیناً مبنی برحق ہوگا، حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایک ایسا عظیم اور بے مثال امتیاز ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی بھی قومی لیڈر اور سیاسی رہنما میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ ع

”یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا“

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین والصلوة والسلام علی خاتم المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین.



(۱) ابن بادیس کے جہد و عمل کی ترتیب کے لئے ترکی راجح الشیخ عبدالحمید بن بادیس باعث النهضة الاسلامیہ فی الجزائر کے صفحات ۷۴، ۷۵، ۷۶ اور ۵۳ ملاحظہ ہوں۔